قیمت ۸ر

تصانیف حضرت نیاز فتحپوری
نگارستان
گہوارۂ تمدن
شہاب کی سرگزشت
فراست الید
شاعر کا انجام
جذبات بھاشا
صحابیات
نقاب اُٹھ جانیکے بعد
مذاکرات نیاز
فلاسفۂ قدیم
تاریخ الدولتین
المسئلۃ الشرقیہ
تذکرۂ خندۂ گل
دیگر مصنفین کی قابل مطالعہ کتابیں
مثنوی لالہ رُخ
مثنوی زہر عشق
فراست الخط مکمل

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شائع ہوتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سے)
بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

شمار ۲	فہرست مضامین فروری ۱۹۳۴ء	جلد ۲۵

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۵	فروری ۱۹۳۴ء	شمارہ ۲

ملاحظات

ما طفلِ کم سواد و سبق قصۂ ہائے دوست
صد بار گفتہ و دگر از سر گرفتہ ایم

احتسابِ نفس

جب غور کرتا ہوں کہ گزشتہ بارہ سال کے زمانہ میں جو نگار کی معیت میں بسر ہوا ہے، میں نے کیا کیا تو ایک طرف اپنی مساعی کو دیکھتے ہوئے یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ

انچہ در مبدءِ فیاض بود آنِ من ست

لیکن جب دوسری طرف شاہدِ مقصود کا خیال آتا ہے تو بے اختیار بیدل کے یہ اشعار زبان پر آجاتے ہیں :-

بحر بیتاب کہ آں گوہر نایاب کجا است — چرخ سرگشتہ کہ خورشید جہانتاب کجا است
دیر زیں غصہ در آتش کہ چہ رنگ ست صنم — کعبہ زیں در و سیہ پوش کہ محراب کجا است

کہا جاتا ہے کہ دنیا میں انسانی کوششوں کی حالت بالکل اُس خس و خاشاک کے اضطراب کی سی ہے جو طوفانی دریا کی پُر خروش موجوں پر بہا چلا جا رہا ہو اور وہ کسی ایک جگہ ٹھیر کر سیلاب کی رفتار کا اندازہ کرنا چاہے۔ ہم سے سوال ہوتا ہے کہ کیا برف کا ڈھیلا جو ہر آن گھلتا جا رہا ہے کوئی تعین اپنے وزن کی کرسکتا ہے۔ کیا بگولہ جو ریگستان میں ایک عفریت کی طرح دوڑتا نظر آتا ہے، اُن ذرات کے رقص کے علاوہ کچھ اور چیز ہے جو صرف پامالی و انتشار ہی کے لئے وضع ہوئے ہیں۔ یعنی

اگر ایں ست گل تازہ کہ تو داری نیست
بلبلاں را ز پر و بال گراں ترسے قفسے

دُور افق میں ایک سبز و شاداب پہاڑی کی رنگینیاں بے اختیار دل کو کھینچ رہی ہیں، قدم بے مضطربانہ اُٹھتے ہیں، لیکن شب و روز کی سعی کے بعد جب ایک صبح وہاں ہم تھکے ہوئے پہونچتے ہیں تو دفعۃً وہ پردۂ رنگین غائب ہو جاتا ہے اور بجائے ایک گلپوش قطعۂ زمین کے ایک بے آب و رنگ ڈھیر پتھروں کا نظر آتا ہے۔ گرم ریگستان کی شدید گرمی میں حدِ نظر پر ایک حوض پانی سے لبریز دھوپ میں چمکتا ہوا نگاہوں کے سامنے آتا ہے، ہم اپنی تشنگی بجھانے کے لئے بیتابانہ اس طرف دوڑ پڑتے ہیں، لیکن جس وقت وہاں پہونچتے ہیں تو پانی کا چشمہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور ہم اسی جگہ تڑپ کر گر پڑتے ہیں۔

برسات کی تاریک، بھیانک رات میں جبکہ نشانِ راہ معدوم ہو کر ہمارے لئے کوئی جائے پناہ نظر نہیں آتی، دور ایک چراغ ٹمٹماتا ہوا دکھائی دیتا ہے، ہم پانی سے شرابور کانپتے ہوئے وہاں پہونچتے ہیں، لیکن نہ وہاں کوئی چراغ موجود ہوتا ہے نہ کسی کسان کا جھونپڑا، دفعۃً بجلی کی چمک میں چاروں طرف پانی کی موجیں نظر آتی ہیں اور ہم مایوسانہ اسی جگہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

یہ اور اسی قسم کے بہت سے واقعات و حوادث ہمارے سامنے پیش کر کے ہماری ہمتوں کو ضعیف اور ہماری کوششوں کو ناکارہ بنانے کی سعی کی جاتی ہے، پھر ایک ایسا انسان جو ان ناکامیوں کا مقابلہ کرنے کا اہل نہیں ہوتا، یا تو فنا ہو جاتا ہے یا اگر اس میں تھوڑی سی کیفیت خودداری کی ہوتی ہے تو وہ ایک خاص نظریہ قایم کرتا ہے اور فطرت سے انتقام لینے کے لئے اس کے دُکھے ہوئے جی سے یہ صدا نکلتی ہے کہ

من از فریبِ عمارت گدا شدم ورنہ
ہزار گنج بہ ویرانۂ دل افتادست

دراں حالیکہ آج تک نہ کسی کے "دلِ ویراں" میں آج تک کوئی پنہاں خزانہ پایا گیا اور نہ اس سے کسی نے فائدہ اُٹھایا، جبتک پہلے کوئی شخص فریبِ عمارت میں مبتلا نہیں ہو گیا۔

اس لئے اگر میں اپنے مساعی کے مقابلہ میں نتائج پر غور کروں تو مجھے بھی یہی تمنا ہم پہلو اختیار کرکے ہمیشہ کے لئے گوشۂ انزوا اختیار کرلینا چاہئے، لیکن اس کے ساتھ جب میں اس حقیقت پر غور کرتا ہوں کہ کامیابی نام اس خیال کی تکمیل و انتہا کا نہیں ہے جو ایک شخص کی آرزو سے وابستہ ہوتا ہے، بلکہ وہ متعلق ہے تغیر محض سے جو کسی فضا میں پیدا ہو جائے، تو مجھے مسرور ہونا چاہئے کہ میں بڑی حد تک کامیاب ہوا اور مجھے اُصولاً اپنے مساعی کو بدستور جاری رکھنا چاہئے، گو میں اسے فقدانِ ہمت، تقاضائے عمر یا دیگر افکار و حوادث کے وجہ سے جاری نہ رکھ سکوں۔

ہر چند نگار جس آواز کو لیکر منصۂ شہود پر آیا وہ کوئی نئی آواز نہ تھی اور یقیناً دُنیا میں کوئی صدا نئی نہیں ہوتی، لیکن یہ واقعہ ہے کہ جس وقت اس کی ابتدا ہوئی، وہ زمانہ تھا جب پچھلی آوازوں کی گونج بھی فضا میں باقی نہ تھی، اور ہندوستان کے مسلمان پھر اُسی نیند میں مبتلا ہو گئے تھے جس سے انھیں بارہا چونکایا جا چکا تھا اور چونک چونک کر وہ پھر سو سو جاتے تھے۔

یہ وہ وقت تھا جب سرزمین ہند میں نہضت و ارتقا کے آثار رونما ہو رہے تھے، ایک خاص احساس کی لہر مختلف قوموں میں دوڑ چلی تھی اور حُریتِ فکر و ضمیر میں از سرِ نو جان پڑ رہی تھی۔ سوائے مسلمانوں کے جتنی قومیں تھیں وہ ملکی و وطنی آزادی کے ساتھ ساتھ ذہنی آزادی حاصل کرنے کے لئے بھی دوڑ پڑی تھیں اور ایک دوربین نگاہ دیکھ سکتی تھی، ایک سوچنے والا دماغ سمجھ سکتا تھا کہ یہ سیلاب کہاں ختم ہوگا اور اس سے صرف وہی قوم جانبر ہو سکتی ہے، جو خود بھی اپنے آپ کو اس طوفان میں ڈالکر ہاتھ پاؤں چلائے۔ لیکن مسلمان سو رہے تھے، اور صرف اس عقیدہ و یقین پر بے خبرانہ زندگی بسر کر رہے تھے کہ "دُنیا مومنوں کے لئے قیدخانہ ہے" اور یہاں کی مسرات و برکات حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں چلاکر کون "کافر" بنے۔

مذہب کی غلط تعبیر نے اُن کے دل و دماغ پر مُہر لگا دی تھی، اسلام کی صحیح تعلیم اور اسکی صحیح رُوح مفقود ہو جانے سے اُن پر جمود کی کیفیت طاری تھی، انسانیت و تمدن کے اُصول کو انھوں نے پس پشت ڈال دیا تھا، اخلاق و عمل کا حقیقی مفہوم وہ اوراد و وظائف میں گم کر چکے تھے، خود اعتمادی کا کوسوں پتہ نہ تھا اور محض "دُعائے گنج العرش" کے سہارے وہ اپنا بیڑا پار کرنا چاہتے تھے جدید علوم و فنون کا اکتساب ان کے نزدیک گمراہی میں مبتلا ہونے کے مترادف تھا اور سائنس کا اعتراف گویا خدا کا انکار۔

اُن کے اعمال و حرکات، اُن کے اقوال و اطوار، اُن کی تعلیم و تلقین، اُن کی تگ و دو، الغرض اُن کی زندگی کے ہر ہر شعبہ میں، صرف تقدیر کارفرما تھی اور تدبیر سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ اُن کی کتابیں، اُن کی تالیفات، اُن کے مدارس، اُن کے مواعظ و ارشادات سب اسی ایک رنگ میں رنگے ہوئے تھے، یہاں تک کہ جرائد و رسائل جو علمی و ذہنی روشنی پھیلانے کے مدعی بنکر رونما ہو رہے تھے، وہ بھی اس باب میں خاموش تھے اور ایک "افسانہ خواں" سے زیادہ اُن کی کوئی حیثیت اس بزمِ خواب آلود میں نہ تھی۔

نگار نے گو ابتدا اجرا میں صراحتاً اس کا اعلان نہ کیا تھا کہ اس کا حقیقی مقصود کیا ہے، لیکن آخرکار یہ حقیقت لوگوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی کہ نگار نہ ادب لطیف کے احیا کے لئے ظہور میں آیا ہے اور نہ صرف ایسی باتیں کہنے کے لئے جنھیں عام لوگ پسند کرتے ہیں

اس نے علم و تحقیق اور تنقید و تفحص کے لحاظ سے ہمیشہ وہ چیز پیش کی جو قدامت پرستی کو توڑنے والی تھی اور کبھی ایک لمحہ کے لئے اس کی پرواہ نہ کی کہ جمہور کے خیال و اعتقاد کا مقابلہ کوئی نفع کا سودا نہیں۔

نگار نے صرف دو درس مسلمانوں کے سامنے پیش کئے ایک یہ کہ اُن کو زمانہ کا ساتھ دینا چاہئے اور دوسرے یہ کہ ذہنی غلامی سے آزاد ہو کر، عصبیت کی زنجیر کو توڑ کر ملک و وطن کی خدمت میں دوسری قوموں کے دوش بدوش ملکر کام کرنا چاہئے۔ پھر چونکہ میں سمجھتا تھا کہ سب سے بڑا سنگ راہ جو ان کو دوسری قوموں سے ملنے نہیں دیتا، وہ مذہبی تعصب ہے اور اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی یقین تھا اور ہے کہ دُنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو اپنی وسعت نظر اور بلند اخلاق کے لحاظ سے تمام دُنیا پر چھا جانے کا اہل ہے، اس لئے سوائے اس کے کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ میں مسلمانوں کو بتاؤں اُن کا صحیح مذہب کیا ہے اور جن باتوں کو وہ اصل دین و عین مذہب قرار دیتے ہیں، وہ صرف فروع میں داخل ہیں۔ پھر ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں مجھے کفر و اسلام، نبوت و رسالت، معجزہ و کرامات، بہشت و دوزخ، جزا و سزا سبھی سے بحث کرنا ضرور تھا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا ہی تھا کہ میں کافر و مرتد بنایا جاتا، ملحد و دہریہ کے لقب سے یاد کیا جاتا۔

پھر جو ہنگامہ اس سلسلہ میں میرے خلاف پیدا ہوا وہ کسی سے مخفی نہیں لیکن جس چیز نے میری ہمت کو ضعیف نہیں ہونے دیا وہ صرف اس امر کا احساس ہے کہ باوجود اس تمام اختلاف کے نگار ایک جماعت کی ذہنیت بدلنے میں کامیاب ہوگیا ہو اور عصبیت کی گرفت اُن پر بہت کچھ ڈھیلی پڑ گئی ہے۔ ممکن ہے اس وقت یہ کامیابی غیر اہم سمجھی جائے، لیکن چونکہ آزادی کا تخم ایک بار بو دینے کے بعد بغیر بار آور ہوئے نہیں رہ سکتا، اس لئے مجھے مستقبل کی طرف سے اطمینان ہے اور پورا یقین رکھتا ہوں کہ ایک زمانہ آئے گا جب آج کی کہی ہوئی باتیں کل ایک ایک مسلمان کی زبان پر ہوں گی اور آخر کار وہ نقاب دور ہو کر رہیگا جو اسلام کے جمیل چہرہ پر مدعیانِ مذہب نے ڈال رکھا تھا۔

می گویم و بعد از من گویند بدستانہا

پھر جو زندگی میں مسلسل بارہ سال سے بسر کر رہا ہوں اور جس چیز کو میں اتنے زمانہ سے اپنے سینہ سے لگائے ہوئے ہوں، ظاہر ہے کہ اس کا چھوڑنا میرے بس کی بات نہیں، اس لئے میں ایک بار اور ہمیشہ کے لئے کہہ دینا چاہتا ہوں کہ وہ لوگ جو نگار کو صرف حکایات لطیف کے لئے وقف دیکھنا چاہتے ہیں، وہ مایوس ہو جائیں، وہ حضرات جو تصاویر و نقوش کی رنگارنگی سے دلچسپی رکھتے ہیں، وہ نگار کو نہ دیکھیں اور وہ احباب جو عقل و ضمیر کی آزادی کو پسند نہیں کرتے وہ نگار کے مطالعہ کی تکلیف گوارا نہ کریں، کیونکہ نگار جب تک جاری ہے اسی اُصول کے ساتھ جاری رہیگا جس کا اس وقت تک وہ پابند رہا ہے اور وہ ہمیشہ یہی تلقین کرتا رہیگا کہ انسان کا اولین فرض "انسانیت" کی پرستش کرنا ہے اور اگر کوئی مذہب بنی نوع انسان سے محبت کرنا نہیں سکھاتا، بلکہ صرف مراسم و ظواہر کو دین و ایمان قرار دیتا ہے تو وہ مذہب ہرگز پیروی کے قابل نہیں۔

اسی سلسلہ میں غالباً یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ ہرچند نگار کی اشاعت کا تنہا مقصود وہی ہے جو ابھی بیان کیا گیا، لیکن اسی کے ساتھ جو علمی و ادبی خدمات اس نے گزشتہ بارہ سال میں انجام دی ہیں وہ بھی نظرانداز کئے جانے کے قابل نہیں تحقیق تاریخی، مباحث علمیہ، معلومات جدیدہ، تنقیدات عالیہ اور انشاء لطیف میں کونسی چیز ایسی تھی جو نگار نے بلند ترین معیار کیساتھ پیش نہیں کی۔ اس لئے وہ لوگ جو صرف ان چیزوں کے دلدادہ ہیں ان کو بھی نگار کی طرف سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ خصوصیات آیندہ بھی بہرحال قایم رہیں گی اور غالباً زیادہ تکمیل کے ساتھ۔

زلزلہ کی تباہکاریاں ـــــ

حوادث طبیعی کے بعض مناظر اسدرجہ عبرتناک ہوتے ہیں کہ انسان کی تمام حکمت فرمائیاں ان کے سامنے بچوں کا کھیل نظر آنے لگتی ہیں اور علم و عقل کی بیچارگی کا احساس ہم کو حیران و ششدر بنا دیتا ہے۔

کلام مجید میں متعدد جگہ ایسے مناظر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

سورۂ حج میں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:-

نکاین من قریۃ اھلکنا ھا ھی ظالمۃ فھی خاویۃ علی عروشھا

یعنی بہت سی ایسی بستیاں ہیں جن کو ہم نے اُن کے ظلم کی وجہ سے ہلاک کر دیا اور وہ سرنگوں کر دی گئیں۔

سورۂ نمل میں ایک جگہ اسی قسم کے منظر کا حال یوں بیان ہوتا ہے:-

فتلک بیوتھم خاویۃ بما ظلموا　یعنی یہ کھنڈر ہیں اُن لوگوں کے جنھوں نے خود اپنے ظلم سے ان ویرانیوں کو دعوت دی۔

سورۂ حاقہ میں قوم عاد کی ہلاکت کے متعلق فرمایا گیا ہے:-

واما عاد فاھلکوا بریح صرصر عاتیۃ .... فتری القوم فیھا صرعی کانھم اعجاز نخل خاویۃ

یعنی جب قوم عاد کی ہلاکت کے لئے تیز و پرشور آندھی بھیجی گئی، تو لوگ اوندھے منھ اس طرح مرے پڑے تھے گویا کہ کھوکھلے کھجوروں کے تنے پڑے ہوئے ہیں۔

سورۂ کہف میں ایک جگہ پانی کے خشک ہوجانے کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔

یصبح ماءھا غورا

مظفر پور، پٹنہ، جمال پور، اور مونگیر وغیرہ میں جو تباہیاں حال کے زلزلے سے آئی ہیں کیا وہ کچھ اور تھیں۔ وہی بیشمار عمارتوں کی مسماریاں، وہی ہزارہا انسانوں کی تباہیاں اور وہی دریائے گنگ کا زمین کے اندر غائب ہوجانا۔ جنھوں نے ان

مناظر کو دیکھا ہے اُن سے پوچھئے کہ کرب و بکا کا وہاں کیا عالم ہے اور انسانی لاشوں کو چیل کوے کس طرح نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔ لاکھوں کی دولت مسمار شدہ مکانوں کے اندر دبی پڑی ہے، ہزاروں بچے یتیم، سیکڑوں عورتیں بیوہ اور نہ جانے کتنے مرد خانماں برباد ہو چکے ہیں۔

تو کیا یہ کوئی عذاب الٰہی تھا جو صوبۂ بہار پر نازل ہوا۔ کیا کوئی قہر خداوندی تھا جس نے اس صوبہ کے باشندوں کو تباہ کیا اور کیا تباہ شدہ بستیاں ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ گنہگار انسانوں کی آبادیاں تھیں جن کو اُلٹ کر معدوم کر دیا گیا؟

مرنے والوں میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی، عیسائی بھی تھے اور یہودی بھی۔ جوان بھی تھے اور معصوم بچے بھی، ضعیف مرد بھی تھے اور بہت سی نیک بیویاں بھی۔ پھر یہ کیسا انصاف ہے، کیسا عدل ہے، کس طرح کا انتقام ہے، کس نوع کا قہر و غضب ہے، کس انداز کی برہمی ہے ــــ اہلِ مذاہب سے پوچھئے تو وہ اس کا جواب سوائے اس کے کچھ نہ دے سکیں گے کہ خدا فعالِ مطلق ہے، بے نیاز ہے، اور وہ کسی طرح مسئول نہیں ہو سکتا ــــ وہ لوگ جو ایسے مظاہر کو صرف حوادث طبیعی سے منسوب کرتے ہیں، وہ بھی یہی کہیں گے لیکن فرق یہ ہے کہ مذہبی تاویل ہمارے اخلاق پر موثر ہوتی ہے اور علمی توجیہہ کوئی اثر اس قسم کا پیدا نہیں کرتی۔

اب غور کیجئے کہ ان واقعات فجاعی سے ہمارے اخلاق مذہبی پر کیا اثر پڑنا چاہئے؟

ہندوؤں نے ہون کر کے دیکھ لیا لیکن یہ مصیبت اُن کے سر سے نہ ٹلی، مسلمانوں نے مسجدوں میں گڑگڑا کر خدا سے التجائیں کیں، لیکن وہ تباہ ہونے سے نہ بچے۔ پھر اس سے بجز اس کے اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے کہ خدا کے نزدیک تفریقِ مذاہب کوئی معنی نہیں رکھتی اور اس کی نگاہ میں سب ایک ہیں، نہ اس کا رحم و کرم کسی مسلمان کی جستجو کرتا ہے اور نہ اس کا قہر و غضب غیر مسلموں کے لئے مخصوص ہے۔ اس کی ذات تاثر و انفعال سے بلند، جذبۂ تفریق و امتیاز سے ارفع اور اُصولِ نیایش و عبادت کے احساس سے بے نیاز ہے۔

مسلمان لاکھ کہا کریں کہ خدا صرف انھیں کا ہے اور انھیں کی نجات اس کا مقصود ہے، ہندو ہزار کہیں کہ انھیں کا مذہب پوتر ہے اور باقی سب گمراہ ہیں، خدا ان مزعومات و مفروضات کا پابند نہیں ہے۔ اور یہ شرک و اسلام کے جھگڑے صرف ہماری خود غرضیوں کے مظاہر ہیں جن سے خدا کو کوئی تعلق نہیں۔

بس سوچو اور سمجھو کہ صحیح راستہ وہی ہے جو آپس میں محبت کرنا بتاتا ہے اور انسانوں میں صرف اس لئے پھوٹ نہیں ڈالتا کہ ایک کے گلے میں زنار ہے اور دوسرے کے ہاتھ میں تسبیح۔

جز سخن کفرے و ایمانے کجاست
خود سخن در کفر و ایماں می رود

گوالیار کی بزمِ ادب

یہ شاید کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر ضیا عباس ہاشمی نے لشکر (گوالیار) میں ایک "بزم اُردو" قایم کر رکھی ہے جو عرصہ سے زبان کی خاموش خدمت انجام دے رہی ہے۔ اسکی ماہانہ صحبتیں بھی برپا ہوتی ہیں اور سالانہ جلسے بھی، ادبا ملک کو بھی دعوت دیجاتی ہے اور فضلا وطن کو بھی کسی نہ کسی طرح کھینچ کر بلایا جاتا ہے۔ الغرض ایک ادبی انجمن کے جتنے فرائض ہیں وہ بوجوہ احسن انجام دئے جاتے ہیں اور سال میں دو چار دن عجیب لطف و دلچسپی کیساتھ بسر ہوجاتے ہیں۔

امسال بھی یہ احتفالِ سالانہ فروری کی ۲۶، ۲۷، ۲۸ کو گوالیار میں منعقد ہونے والا ہے اور وہ تمام قوتیں جو گزشتہ جلسوں کے کامیابی کیلئے علیحدہ علیحدہ صرف کی گئی تھیں، اب یکجائی طور پر اسس جلسہ کو کامیاب بنانے کے لئے وقف کردی گئی ہیں اور اُس نظم و اہتمام کو دیکھتے ہوئے جو ڈاکٹر صاحب موصوف کے پیشِ نظر ہے بجا طور پر یقین کیا جاسکتا ہے کہ شاید ہی ہندوستان میں کوئی ادبی جلسہ اسدرجہ پُر لطف و مکمل اس سے قبل منعقد ہوا ہو۔ ہندوستان کا کوئی ادیب و شاعر، کوئی صاحب علم و فضل ایسا نہیں جسے دعوت نہ دی گئی ہو اور مجھے یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوکہ ان میں سے اکثر نے شرکت کا وعدہ فرمالیا ہے۔ اس سے قبل بزم کے طرف سے ملک میں دعوت نامے شایع کئے گئے تھے لیکن بعض اسباب کی بنا پر تاریخ ملتوی کرنا پڑی جسکی اطلاع تمام حضرات کو دیدیگئی ـــ اب فروری کی یہ تاریخیں چونکہ یقینی طور پر متعین ہوچکی ہیں اسلئے بزم اُردو کے طرف سے پھر نوید شایع کئے جارہے ہیں جو نگار کی اشاعت سے قبل غالبًا تمام حضرات کے ہاتھوں میں ہوں گے ـــ

ڈاکٹر اقبال، سر تیج بہادر سپرو، سر عبد القادر، سر راس مسعود، نواب نصیر حسین خیال، مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی وغیرہ تمام اکابر نے شرکت کا وعدہ فرمایا ہے اور پنجاب و یوپی، بنگال و بہار، سی پی و دکن وغیرہ کے اکثر ارباب علم و ادب نے اس میں عملی حصہ لینے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔

علاوہ اس کے سب سے زیادہ خصوصیت جو اس سے قبل کسی انجمن کو حاصل نہیں ہوئی وہ یہ ہے کہ عالیجناب مہاراجہ سر کشن بہادر بالقابہ صدر اعظم دولت آصفیہ کو صدارت کے لئے تجویز کیا گیا ہے اور ایک وفد حیدر آباد جارہا ہے تاکہ باقاعدہ دعوت نامے کو پیش کرکے شرف منظوری حاصل کرے۔ میں بھی اس وفد کے معیت میں ۲۰ جنوری کو گوالیار سے حیدر آباد روانہ ہوجاؤں گا ـــ صدارت کے لئے یہ انتخاب نہ صرف اس لحاظ سے موزوں و برمحل ہے کہ اسوقت دولت آصفیہ دکن جامعہ عثمانیہ کے قیام سے سب سے بڑی خدمت اُردو کی انجام دے رہی ہے، بلکہ خود سر مہاراجہ بہادر کی خدمات اُردو زبان کے متعلق اسدرجہ گرانقدر اور اتنی اہم ہیں کہ ان کے اعتراف پر ہر شخص مجبور ہے ـــ اس کے ساتھ یہ خبر بھی غالبًا مسرت سے سُنی جائے گی کہ استقبالیہ کمیٹی کی صدارت جناب کرنل ہکسر صاحب نے قبول فرمائی ہے جو بین الاقوامی شہرت رکھنے والے لوگوں میں سے ہیں اور جو خود اُردو زبان سے بہت شغف رکھتے ہیں جناب سردار آنگرے صاحب بھی جو گوالیار میں پرائیویٹ سکریٹری کی اہم خدمت پر مامور ہیں، ذاتی طور پر اسقدر دلچسپی لے رہے ہیں کہ بعض دعوت نامے خود ان کی طرف سے شایع ہوئے ہیں۔ الغرض بزم اُردو کا یہ جلسہ کوئی معمولی جلسہ نہیں جسے صرف ارکانِ بزم ہی مدعو کرنا چاہتے ہیں بلکہ یوں سمجھنا چاہئے کہ غیر سرکاری طور پر خود ریاست گوالیار دعوت دے رہی ہے اور اس لئے بہی خواہانِ اُردو کو غور کرنا چاہئے کہ ان حالات میں اُن کی شرکت ضرورت و مصلحت کے لحاظ کس قدر ناگزیر ہے ـــ ممکن ہے کہ بعض اکابر فن کو کسی فروگزاشت کے بنا پر دعوت نامہ نہ پہونچے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بزم اُردو ان کی تشریف آوری کی متمنی نہیں اس لئے آپ خود بغیر رسمی رقعہ کا انتظار کئے ہوئے براہ راست سکریٹری "بزم اُردو لشکر" کو اطلاع دیجئے کہ آپ کسوقت وہاں پہونچیں گے۔ تاکہ آپ کا استقبال کیا جائے ـــ ممکن ہے کہ بعض ایسے حضرات جو مدعو کئے گئے ہوں اپنی اقتصادی مجبوری کے وجہ سے شرکت نہ فرماسکیں، اس لئے یہاں یہ ظاہر کردینا بے محل نہ ہوگا کہ ایسے احباب کے لئے "بزم اُردو" کے طرف سے ان کے مصارف آمد و رفت کا حقیر ہدیہ پیش کردیا جائے گا اور اُمید ہے کہ وہ اسے قبول فرمائیں گے ـــ اب آخر میں مجھے ایک مشورہ بھی دینا ہے اور وہ یہ کہ جو حضرات تشریف لائیں وہ یہ سمجھ کر آئیں کہ اُردو کی خدمت ان کو انجام دینا ہے اور اس لئے کوئی نہ کوئی "پیام" سُنانا ان کے لئے ضروری ہے ـــ کوشش کی جارہی ہے کہ صدر کے جلوس استقبال اور جلسہ کے مختلف نشستوں کا فلم بھی طیار کیا جائے۔ امید ہے کہ میرے احباب اور نگار کے جملہ قلمی معاونین شرکت کی زحمت گوارا فرمائیں گے اور مجھے موقع دیں گے کہ میں گوالیار میں ان کا خیر مقدم کروں۔

نیاز

زبان اُردو کے ارتقائی منازل

آج ہمیں اس اہم مسئلہ پر بحث کرنی ہے کہ آیا اُردو مسلمانوں کی زبان ہے یا عام ہندوستانیوں کی، اور اس کی تخلیق و تدوین میں صرف اہل اسلام نے حصہ لیا ہے، یا برادران وطن نے بھی، مگر قبل اس کے کہ اصل موضوع پر روشنی ڈالی جائے، یہ بتا دینا ضروری ہے کہ کسی زبان کے وجود میں آنے کے اسباب و علل کیا ہیں؟ معمولی غور و فکر کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ تجارت و حکومت سیر و سیاحت، نقل مکان، و مذہبی تحریک نے زبان کی تخلیق میں بڑی مدد دی ہے، چنانچہ سامی اور آریہ زبانوں کی مختلف شاخیں انھیں اسباب و علل کے ماتحت وجود میں آئیں،

اب آئیے اردو کے منازل ارتقار پر غور کریں، یہ تو ظاہر ہے، کہ اُردو نہ خالص سامی زبان ہے نہ خالص اندوجرمانی (Indo Germanic) بلکہ سامی اور اندوجرمانی قوموں کے اختلاط و امتزاج سے اس کا وجود ہوا ہے، کیونکہ اس کے لغات و قواعد میں سامی لغات کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں اور آریہ لغات کے بھی، اب دیکھنا یہ ہے، کہ اُردو زبان پر سامی اور آریہ لغات نے کیونکر اثر ڈالا؟ اس کے لئے کسی قدر تحقیق و کاوش غور و مطالعہ سے کام لینا ہوگا،

اُردو زبان ہندوستانیوں اور اہل اسلام کے خلط و ربط سے وجود میں آئی، مذہب اسلام ایک ایسی سامی تحریک تھا، جس نے دنیا کے تمام شعبوں میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا تھا چنانچہ مصر کا ایک ماہر لسانیات اسرائیل ولفنسون لکھتا ہے،

كانت الهجرة الاسلامية الى خارج الجزيرة آخر حادث سامي عظيم وقع في جزيرة العربية فاهتزت له ارجاء العالم اهتزازا عنيفا وصدرت عنه تموجات فكرية ونفسية عظيمة شملت اصقاع آسيا وافريقية واورباو اثرت في هذه البلاد تأثيرات ذات نتائج خطيرة جعلت تاريخ البشر في كل هذه الجهات يتجه اتجاها جديدا[1]

جزیرۂ عرب سے باہر اسلام کا شیوع سامی قوم کا وہ آخری واقعۂ عظیم تھا، جو عرب میں واقع ہوا، جس نے دنیا کے کناروں میں سخت ہلچل پیدا کر دی اس سے بڑی بڑی ذہنی اور نفسی موجیں نکلیں جس میں ایشیا افریقہ اور یورپ کے ممالک شامل ہوئے، اور ان شہروں میں اہم نتیجہ خیز اثرات پیدا ہوئے۔ جس نے ان تمام اطراف میں انسانی تاریخ کے اندر ایک جدید رجحان پیدا کر دیا

[1] تاریخ اللغات السامیہ مطبوعہ مصر ص ۱۶۲

چونکہ اسلام کی تبلیغی زبان عربی تھی اس لئے سب سے پہلے ہمیں اس امر پر غور کرنا ہے، کہ عربی زبان سے ہندوستانی زبان کو کوئی علاقہ رہا ہے یا نہیں، ؟ اس سلسلہ میں مفصلاً ذیل تاریخی شواہد پیش کئے جا سکتے ہیں،

تجارت بعثت اسلامیہ سے قبل ہندوستان کے ساتھ عربوں کے تجارتی تعلقات قائم تھے اور ساحل مالا بار میں عرب تاجروں کی بود و باش تھی، چنانچہ عربی اور ہندوستانی نسل کے اختلاط سے ایک قوم یہاں پائی جاتی ہے، جس کو " موپلا " کہتے ہیں ان کی زبان " ملیالم " ہے،

عرب اپنی حکومت سے قبل بھی یہاں قیام رکھتے تھے، اور مکہ میں ہنود کی بھی آمد و رفت تھی کیونکہ یہاں بہت بڑا صنم خانہ تھا، عربوں اور ہندوستانیوں کا پہلا اختلاط تجارتی اغراض اور مماثلت عقائد پر مبنی تھا[1] اس لئے اندازہ ہوتا ہے، کہ عربی اور سنسکرت زبانیں بعثت اسلامیہ کے قبل مروج ہو چکی تھیں،

حکومت اسلام عالم وجود میں آیا تو سب سے پہلے مہلب بن ابی صفرہ نے پہلی نصف صدی ہجری میں ہندوستان پر حملہ کیا اس زمانہ میں جستہ جستہ بہت سے لوگ مسلمان ہوئے، عہد صحابہ ہی میں بہت سے ہندوستانی راجہ مسلمان ہو گئے تھے، چونکہ بت پرستی کے سلسلہ میں عرب میں ان کی آمد و رفت تھی۔ اسی طرح وہ بعثت اسلام کے وقت بھی آئے، اور دین اسلام قبول کیا پھر پہلی صدی ہجری کے اواخر میں حجاج بن یوسف نے اپنے داماد عماد الدین محمد بن قاسم کو سندھ کی فتح کے لئے روانہ کیا اس نے سندھ فتح کیا، محمد بن قاسم جب ولید بن عبدالملک کے حکم سے مارا گیا تو تمیم انصاری کی اولاد نے سندھ پر حکومت کی اس سلسلہ میں عرب کے بہت سے خاندان سندھ میں آ گئے، یہی وجہ ہے، کہ سندھ نے بہت بڑے بڑے صوفیہ اور محدثین پیدا کئے حضرت ابو رجا محدث اور شیخ ابو علی صوفی اسی زمین کے نونہال تھے، شیخ ابو علی، سندی حضرت بایزید بسطامی کے عہد میں گزرے ہیں، حضرت بایزید فرماتے ہیں کہ میں شیخ صاحب سے " فنا " کا درس لیتا تھا، اور شیخ صاحب مجھ سے، سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے[2] اسی بنا پر ڈاکٹر نکلسن نے یہ قیاس پیش کیا ہے، کہ تصوف اسلامیہ پر ہندوستانی یوگ کا اثر پڑا ہے،

سیر و سیاحت یوں تو مسلمانوں میں بڑے بڑے سیاح گزرے ہیں۔ جنھوں نے اپنے حالات سفر قلمبند کئے، اصقاع عالم کے جغرافی خصائص پر روشنی ڈالی، مسلم بن حمیر، جعفر بن احمد المروزی ابن فضلان، ابن خردابہ، جیہانی، الاصطخری، ابن حوقل، یاقوت حموی، البقری، المقدسی، ادریسی وغیرہ کے جغرافی کارناموں سے کون انکار کر سکتا ہے، لیکن جہاں تک ہندوستانی سیاحت کا تعلق ہے اس سلسلہ میں مسعودی، البیرونی اور ابن بطوطہ نے وقیع خدمات انجام دئے، مسعودی (چوتھی صدی) بغداد کا رہنے والا تھا، اس نے اپنے آغاز شباب

---

[1] تاریخ فرشتہ مقالہ ۸ [2] نفحات الانس ص ۶۰

ہی میں اسلامی دنیا کا بڑا حصہ دیکھ ڈالا پہلے پہل وہ ہندوستان میں آیا اور مختلف ممالک کی سیر کی پھر دوبارہ آیا اور کچھ دنوں تک کمباجہ اور دکن میں قیام کیا۔ اس کے متعلق ایک فرانسیسی عالم ڈی بویر لکھتا ہے،

"وہ ہر اس چیز کی تعریف کرتا ہے، اور اس سے دلچسپی لیتا ہے، جو نوعِ انسانی سے متعلق ہے، جہاں کہیں وہ جاتا ہے، آدمیوں سے مل کر وہ کچھ سیکھتا ہے۔ روزانہ زندگی اور مذہب کے معمولی امثال و عواطف اور فلسفہ کی ہوائی خیال آرائیاں اس کا مرکزِ توجہ نہیں اس کو اپنی استعداد کا اندازہ ہے۔ اور آخری دم تک جبکہ وہ مصر میں پیری کے دن گزار رہا تھا، مطالعہ تاریخ کو وہ اپنی تسکین کا واحد ذریعہ اور اپنی روح کی دوا بناتا ہے"[۱]

البیرونی نہ صرف ایک سیاح اور جغرافی تھا بلکہ اس نے بہت دنوں تک ہندوستان میں قیام پذیر رہ کر سنسکرت زبان کی تعلیم حاصل کی، یہاں کی معاشرت و مذہب، شاعری و ادبیات، فلسفہ و حکمت، اوہام و خرافیات، ملک کی جغرافی و طبعی خصوصیات سے اپنی مشہور تصنیف "کتاب الہند" میں محققانہ بحث کی اس کے متعلق مؤلف "تاریخ فلسفۂ اسلام" لکھتا ہے،

"اس سے اس عہد کی خصوصیت کی وضاحت ہوتی ہے؛ گو کندی اور مسعودی کو فارابی اور ابن سینا کی بہ نسبت زیادہ استحقاق ہے، کہ اس کے (بیرونی) اساتذہ میں مشمول ہوں، بیرونی کی نظر مطالعہ خاص طور پر ریاضی، ہیئت، جغرافیہ اور قومیات تک محدود تھی، اس کا مشاہدہ عمیق اور قوت تنقیدی عمدہ تھی، اپنی بہتیری علمی مشکلات کے حل کرنے کے لئے اس کو فلسفہ کا بھی مرہونِ منت ہونا پڑا، اور اس نے مسلسل اس پر بہ حیثیت ایک مظہر تہذیب ہونے کے، اپنی توجہ مبذول رکھی، بیرونی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے فیثاغورثی افلاطونی فلسفہ، ہندوستانی حکمت اور بہت سے صوفیانہ نظریات میں جو ہم آہنگی پائی جاتی ہے، ان کو تعجب خیز شہرت دی، جب وہ علوم یونان سے عربوں اور ہندوستانیوں کے مساعی و اعمال کا موازنہ کرتا ہے، تو اس کا یونانی علوم کی برتری دکھانا اور بھی حیرت زا معلوم ہوتا ہے، وہ کہتا ہے کہ ہندوستان نے (عرب کا کیا ذکر ہے) کوئی سقراط نہیں پیدا کیا، وہاں منطقیانہ طریقے نے حکمت سے مغالطہ کو دور نہیں کیا پھر بھی وہ انفرادی اعتبار سے بعض ہندوستانی فلاسفہ پر منصفانہ محاکمہ کرتا ہے، اور وہ آریہ بھٹ (متوطن عظیم آباد بہار) کے پیروؤں کے حسب ذیل افکار پسندیدگی کے ساتھ نقل کرتا ہے، "ہم لوگوں کے لئے ان چیزوں کا علم حاصل کرنا ضروری ہے، جو آفتاب کی شعاع میں منور ہیں جو چیزیں اس دائرہ سے خارج ہیں، گو ان کی وسعت بے پایاں ہو لیکن ہم ان کا استعمال نہیں کر سکتے جو جہاں آفتاب کی شعاع نہیں پہونچتی، وہاں حواس کو ادراک نہیں ہو سکتا اور جن چیزوں کا حواس کو ادراک نہیں ہو سکتا ان کا

---

[۱] نفحات الانس ص ۶ History of the Saracens. ص ۲۶۴ - ۲۶۵

[۲] De Boer's History of philosophy in Islam ص ۶۹

ہمیں علم بھی نہیں ہو سکتا" اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ بیرونی کا فلسفہ کیا تھا؟ اس کے عقیدہ میں علم الیقین صرف محسوسات کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے، جن کو منطقیانہ معلومات کے ساتھ وابستہ کر دیا جائے، وہ یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ زندگی کی ضرورتوں کے لحاظ سے ہمیں ایک فلسفۂ عملی کی ضرورت ہے، جس کے ذریعہ ہم دوست دشمن میں تمیز کر سکیں یقیناً اس کو اس کا تصور بھی نہ ہوگا کہ اس نے وہ سب کچھ کہہ ڈالا، جو اس موضوع پر کہا جا سکتا تھا[۱]۔

ابن بطوطہ اس عہد میں واردِ ہندوستان ہوا، جب اردو اپنی نشأۃ کے دوسرے دور میں تھی، یعنی افاغنہ سریر آرائے حکومت تھے، اور سنسکرت زبان جو عربی لغات کے ساتھ ممزوج ہو چکی تھی، بھاشا کی صورت میں فارسی کے ساتھ مخلوط ہو رہی تھی، جس کی تفصیل آگے آتی ہے، اس لئے ابن بطوطہ کی سیاحت اُردو کی تاریخ کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی، لیکن مسعودی اور بیرونی کی تصنیفات نے ایک طرف تو اہل اسلام کو ہندوستانی ادبیات سے بہت کچھ آشنا کیا دوسری طرف عربی زبان میں سنسکرت کے بہت سے لغات والفاظ داخل ہو گئے، اسرائیل ولفنسون مصر کے ماہر لسانیات نے اپنی کتاب میں سامی زبانوں کی تاریخ سے بحث کرتے ہوئے، ثابت کیا ہے، کہ بابلی و آشوری آرامی و عبری زبانوں کو عربی سے خاص مماثلت ہے، اور لغات سامیہ کا ایک قاموس دے کر سامی زبانوں کے مشابہ الفاظ کو یکجا کر دیا ہے لیکن اس نے عربی اور سنسکرت کے علاقہ پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گو یہ ایک متنازع فیہ مسئلہ ہے، کہ عربی و سنسکرت کے نحو و صرف میں کوئی ربط پایا جاتا ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق مستشرقین کے مختلف خیالات ہیں۔ چنانچہ ولفنسون، سامی اور آریہ زبانوں کے تناسب پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے،

فبعضهم يرجح ان جميع اللغات السامية واللغات الآرية كانت فى عصر من العصور لغة واحدة	انہیں بعض کا یہ رجحان ہوا کہ تمام سامی اور آریہ زبانیں کسی زمانہ میں ایک زبان تھیں،

لیکن بعض ماہرین لسانیات نے اس کا مذاق اُڑایا۔ چنانچہ بروکلمان، اور نولدکہ نے اس نظریہ سے اختلاف کرتے ہوئے کہا،

فاذا كان هناك اصل اشتركا فيه فلا يكون ذالك الا قبل التاريخ وما كان قبل التاريخ لا يدخل فى حظيرة البحث عند علماء اللغات[۲]	پس جب کوئی ایسی اصل تھی جو (آریہ اور سامی زبانوں کیلئے) مشترک تھی، تو یہ تاریخ کے قبل کا واقعہ ہوگا اور جو تاریخ کے قبل کی چیز ہے، وہ ماہرین لسانیات کے نزدیک احاطۂ بحث سے خارج ہے،

---

[۱] "ہسٹری آف فلاسفی ان اسلام" مؤلفہ ڈی بوئر یہ کتاب فرانسیسی زبان میں لکھی گئی تھی۔ عام مقبولیت کے باعث ۱۹۰۳ء میں اس کا انگریزی ترجمہ لوزک اینڈ کمپنی (لندن) نے شائع کیا، ۱۹۳۳ء میں اس کا دوسرا اڈیشن نکلا یہی جدید الشیوع نسخہ پیش نظر ہے، ایڈورڈ۔ آر۔ جونس اس کے مترجم ہیں۔ (ملاحظہ ہو ص ۱۴۶) [۲] تاریخ اللغات السامیہ مطبوعہ مصر ص ۱۰، یہ کتاب

پھر بھی مروج الذہب اور کتاب الہند کے صفحات کا جائزہ لیا جائے، تو پتہ چل سکتا ہے کہ مسعودی اور بیرونی نے سنسکرت اور عربی کو کس طرح مخلوط کیا ہے،

نقل مکان و مذہبی تحریک غزنویہ اور افاغنہ دہلی کے قبل ہی بعض قبائل عرب اور سادات ہندوستان میں آباد ہو گئے تھے، ان لوگوں کی زبان عربی تھی، اس لئے اُردو کے ارتقاء میں پہلے عربی زبان کے عناصر شامل ہوئے، اس کے بعد فارسی زبان نے کئی سو برس تک اسی عربی اور بھاشا کے مخلوط مواد میں اپنا اثر ڈالا، وہ عربی قبائل جو جزیرۂ عرب سے ہجرت کرکے ایران میں آباد ہو گئے تھے، بتدریج ہندوستان میں آنے لگے، چنانچہ علامہ سراج الدین رفاعی حضرت عمر الاطرف ابن حضرت علیؓ کے اعقاب کے متعلق لکھتے ہیں

ولعمر الاطرف ھذا ذیل ببلخ وحران و واسط والیمن وطبرستان والھند و ملتان والسند	اور ان حضرت عمر الاطرف کی اولاد، بلخ، حران، واسط، یمن، طبرستان، ہند، ملتان اور سندھ میں پائی جاتی ہے

اسی طرح حضرت امام حسن کے پوتے ابراہیم الغمر کے متعلق لکھتے ہیں کہ آپ کے دو بیٹے ہوئے ان میں ایک کا نام حسن الشیخ تھا، دوسرے کا ابراہیم طباطبا، حسن الشیخ کے اعقاب کا تذکرہ علامہ موصوف یوں کرتے ہیں

اما حسن الشیخ فاعقب من الحسن وھو اعقب من رجلین ابی جعفر محمد و ابی القاسم علی المعروف بابن معیہ وھی امہ الانصاریۃ عرف بھا ولھم ذیل طویل بمصر والعراق ومنھم بدھلی من الھند [۱]	لیکن حسن شیخ آپ کے ایک صاحبزادہ حسن سے اولاد ہوئی انھوں نے دو لڑکے ابی جعفر محمد اور ابوالقاسم علی معروف بہ ابن معیہ چھوڑے، معیہ ابوالقاسم کی انصاری ماں تھیں جن سے وہ مشہور ہوئے، انکو گونگی اولاد کثیر مصر اور عراق اور انہیں بعض ہندوستان کے شہر دہلی میں ہیں

عام قبائل عرب کے علاوہ بہت سے مشائخ آئے، جنکا مطمح نظر تبلیغ و ارشاد تھا، چنانچہ حضرت خواجہ معین الدین سنجری (متوفی سنہ) خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (متوفی ۶۳۲ھ) خواجہ فرید الدین گنج شکر (متوفی ۶۶۰ھ) خواجہ نظام الدین خالدی (متوفی ۷۲۵ھ) وغیرہ نے ارتقائے اُردو میں بڑی مدد دی، چونکہ قومی اصلاح اور روحانی بلاغ و ارشاد کے سلسلہ میں عوام الناس کو آپ حضرات کے ساتھ گہری وابستگی تھی، خواجہ معین الدین سنجری، سلطان التمش کے عہد (متوفی ۶۳۳ھ) میں وارد ہندوستان ہوئے. خواجہ قطب الدین قصبہ "اوش" سے تشریف لائے تھے، جو ماوراء النہر کے علاقہ میں تھا اسی طرح شیخ فرید الدین، قصبہ کھوتوال سے جو ملتان کے علاقہ میں ہے، تشریف لائے، شیخ نظام الدین اولیا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲) ۱۹۲۹ء میں مصر کی ایک وقیع علمی مجلس "جنتہ الترجمہ والتالیف والنشر" نے شائع کی ہے، موضوع کے لحاظ سے عربی زبان میں یہ پہلی کتاب ہے، اس میں بابلی آشوری، عبری و آرامی، اور عربی زبانوں کی مکمل تاریخ ہے، ان زبانوں کے قدیم و جدید خطوط کے نقوش بھی پائے جاتے ہیں، اس پر ایک تبصرہ لکھا جا رہا ہے [۱] صحاح الاخبار فی نسب السادۃ الفاطمیۃ الاخیار ص ۲۰، یہ کتاب ابن ملد ...

کے والد احمد دانیال غزنیں سے ہندوستان میں آئے، دکن کے اسلامی سلاطین کے عہد میں بھی اولیا کبار ہندوستان میں آئے، اگر ہر شاہی خاندان کے عہد کے بزرگوں کی ایک فہرست مرتب کی جائے، تو پتہ چلے گا، کہ ایرانی شعرا کی طرح عراق عرب، وایران کے صلحا و صوفیہ بھی ہندوستان میں کثرت کے ساتھ آئے اور ان کی بیعت و رشاد نے عوام الناس کی زبان پر گہرا اثر ڈالا

سادات بلگرام جن میں ترمذی، رضوی، وصغراوی ہیں وہ عراق وایران سے آئے، بلگرام میں سب سے پہلے خواجہ عماد الدین تشریف لائے اس کے بعد سید محمد صغری تشریف لائے جو حضرت زید شہید ابن حضرت امام زین العابدین کے اعقاب میں ہیں اور انھیں کے اخلاف گرامی سے یہ شہر علوم و معارف کا سرچشمہ بنا؛ خواجہ عماد الدین تو بلا واسطہ عرب سے تشریف لائے تھے لیکن سادات صغراوی عراق یا عجم سے آئے اسی طرح بعض خاندان ترمذ سے آئے، سادات رضوی کے جد امجد کمال الدین غزنین سے تشریف لائے، خواجہ عماد الدین اور سید محمد صغری دونوں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مُریدوں میں تھے[۱]

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی ابتدائے ساتویں صدی میں گزرے ہیں اور صفیر مرحوم مؤلف تاریخ بلگرام سید محمد صغری کو آپ کا مرید بتاتے ہیں اس سے نتیجہ نکلتا ہے، کہ سید محمد صغری کا خاندان اواخر ساتویں صدی میں ہندوستان میں آباد ہو گیا تھا، لیکن اس عہد کے تقریباً ڈیڑھ سو برس کے بعد علامہ رفاعی نے صحاح الاخبار لکھی لیکن انھوں نے سادات زیدی کو صرف عراق و حجاز تک محدود بتایا ہے، چنانچہ عیسی موتم الاشبال بن زید شہید کے صاحبزادوں زید، احمد، اور حسین کے متعلق لکھتے ہیں

ولھم عقب طویل وذیل جلیل بالعراق والحجاز | انکی کثیر اولاد و اعقاب گرامی عراق و حجاز میں پائے جاتے ہیں

سادات صغراوی (بلگرام)، اپنا سلسلہ محمد بن عیسیٰ موتم الاشبال بن زید شہید تک پہونچاتے ہیں تعجب ہے، رفاعی نے اس خاندان کے ورود ہند کے متعلق کیوں نہ لکھا، حالانکہ انھوں نے بعض ہندوستانی خاندانوں کے متعلق لکھا ہے، جیسا کہ سطور بالا میں لکھا جا چکا، سید محمد صغری کے جد ششم سید ابو الفرح واسطی ( ) کے رہنے والے تھے، اسی لئے سادات صغراوی "واسطی" کہلاتے ہیں

الغرض سندھ کی عربی حکومت مٹنے کے بعد اکثر قبایل جو ہندوستان میں آئے وہ بلا واسطہ عرب سے نہیں آئے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳) ہے، اس کا ایک نسخہ میرے پاس ہے جرمنی، اور انگلستان کے مستشرقین نے اس سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا ہے، چنانچہ انگریز مستشرق سرای ڈینیسن راس کی فرمایش پر اس کتاب کا مقدمہ لکھ رہا ہوں، ممکن ہے یہ کتاب علامہ موصوف گب موریل کی طرف سے شایع کرائیں جیسا کہ انھوں نے اپنے مکتوب گرامی میں ظاہر کیا ہے[۱] تاریخ بلگرام مؤلفہ سید فرزند احمد صفیر ج ۱ ص ۳۰ ۔

تھے، بلکہ ایران سے آئے ان کی زبان فارسی تھی، اس طور سے ہندوستان کی مادری زبان میں جس میں عربی زبان کے بہت سے عناصر شامل ہو چکے تھے، فارسی زبان مخلوط ہونے لگی، گو پہلی صدی ہجری کے اثر حکومت نے ہندوستان کی سر زمین سے عربی زبان کے بہت سے ادیب جلیل و محدث ثقہ پیدا کئے لیکن جب فارسی کا دور ہوا تو خود مسلمانوں نے بھی سنسکرت و بھاشا کی طرف کافی توجہ کی اور ہنود میں تو فارسی کے ایسے ایسے بے مثل ادیب و شاعر پیدا ہوئے، کہ دنیا آج ان کے بدلیہ افکار و حلاوت زبان پر بہروں سر دھنتی ہے، اس کی تفصیل آگے آتی ہے، الغرض ہندوستان میں فارسی زبان کی تاریخ کا آغاز عہد غزنویہ سے متعین کریں تو گویا پانچویں صدی سے تیرہویں صدی تک فارسی زبان نے ہندوستان پر اپنا سکہ جمائے رکھا

عہد غلامان سے لے کر آوان لودی کے درمیان خلجیہ، تغلق، سید وغیرہ نے حکومت کی ان تمام خاندانوں کے دور حکومت میں، سلطنت کی زبان فارسی تھی پھر بھی ہنود نے فارسی کی طرف ایسی توجہ نہیں کی، جیسا کہ عہد مغلیہ میں پایا جاتا ہے، مغلوں کی حکومت نے خود فارسی زبان کی تاریخ میں انقلاب پیدا کر دیا، ایران کے صفوی سلاطین شعر و ادب اور فنون لطیفہ کے بہت بڑے حامی تھے لیکن پھر بھی دربار مغل کا آوازہ جود و سخا اور شہرہ ادب نوازی اس قدر عالمگیر ہوا کہ ایران سے ہزاروں شعراء وارد ہندوستان ہوئے، عہد اکبری اس کے لئے ممتاز حیثیت رکھتا ہے، محمد مقیم الہروی (مؤلف طبقات اکبری) اور بدایونی (مؤلف منتخب التواریخ) نے تفصیل کے ساتھ سینکڑوں شعرا کے نام گنائے ہیں ابوالفضل نے بھی آئین اکبری میں بہت سے شعرا کا نام لکھا ہے، شیراز، کاشان، تبریز، اصفہان، لاہجان، مشہد کے شگفتہ بیان شعرا دربار اکبری کی شمع فروزاں بن گئے تھے اور ایرانی شعرا کی آمد کا یہ سلسلہ نہ صرف دہلی و لاہور تک محدود تھا بلکہ اودھ، دکن اور بہار میں بھی کثرت سے ان کی آمد رہی، حکومت کے دفاتر، ایرانی شعرا کی آمد، اور قبائل عرب کی ہجرت نے (جن کی زبان فارسی تھی) پنجاب، اودھ، دکن اور بہار پر گہرا اثر ڈالا، اور مقامی باشندوں میں فارسی زبان کا بہت پاکیزہ ذوق پیدا کر دیا۔ چنانچہ اس ضمن میں سب سے پہلے شاہی دربار کی طرف توجہ کیجئے، یوں تو ہر خاندان کے مسلمان بادشاہ کے عہد میں ہندوؤں نے دربار میں رسوخ حاصل کیا لیکن دربار اکبری نے جس فیاضی کے ساتھ دربار میں ہندوؤں کو جگہ دی اس کی مثال اس سے قبل نہیں ملتی،

دربار اکبری کے ہندو ارباب مناصب محمد مقیم ہروی (مؤلف طبقات اکبری) کے صاحبزادہ اپنی تاریخ میں فرماتے ہیں،

"چوں تفصیل اسامی امرائے حضرت خلیفہ افاضل پناہ علامی شیخ ابوالفضل در کتاب اکبرنامہ مرقوم قلم بدایع رقم گردانیدہ اند، دریں مختصر بہ ذکر اسامی امرا

کبار اختصاص یافتہ لے

اس کے بعد جستہ جستہ مفصلہ ذیل ہندو منصبداروں کے حالات لکھے ہیں یہ تعداد صرف ان امرا کی ہے، جو "منصب اعلیٰ" پر فائز تھے، چھوٹے چھوٹے منصبداروں کا حال اکبر نامہ میں پایا جاتا ہے،

راجہ ٹوڈر مل از طایفہ کھتری و نویسندہ بود، بوسیلۂ مظفر خاں بمرتبہ وزارت رسیدہ مدت ہفدہ سال وزیر باستقلال و چہار ہزار سوار داشت "

راجہ رائے سنگھ کو بیکانیر اور ناگور کی حکومت اور چار ہزاری منصب ملا تھا، رائے سال کچھواہہ دو ہزاری رائے درکھمل ہزار و پانصدی، اور راجہ بیربر دو ہزاری امرا میں تھے، راجہ سرجن رنتھنبور میں تھا شاہی فوج نے قلعہ کا محاصرہ کیا تو اس نے اطاعت کی اور دربار کے دو ہزاری امیروں میں شامل ہوگیا راجہ روپ سی براگی ہزار و پانصدی منصب رکھتا تھا۔ جگت سنگھ ولد راجہ مان سنگھ ہزار و پانصدی امرا کے صف میں تھا راجہ بہارہ مل حکومت مغلیہ کے آغاز ہی میں امرائے کبار میں شامل تھا، راجہ بھگوان داس ولد راجہ بھارت مل کو جو راجہ مان سنگھ کے باپ تھے، پانچہزاری منصب ملا تھا اس خاندان کے ساتھ اکبر اور اس کی اولاد و احفاد کو خاص لگاؤ تھا یہی وجہ ہے، کہ کئی پشت تک راجہ بھارت مل کے بیٹے پوتے اور پر پوتے دربار مغل کے امرا اور منصبداروں میں شامل تھے، ان پر حکومت کو کامل اعتماد تھا۔ مان سنگھ کو بہار و بنگال کی گورنری اور پانچ ہزاری منصب عطا ہوا تھا، راجہ جگن ناتھ پسر راجہ بہارہ مل اور راجہ اسکرن تین ہزاری امرا میں تھے، راجہ لونکرن بھی صف امرا میں داخل تھا، مادھو سنگھ برادر راجہ مان سنگھ دو ہزاری امیروں میں تھا، رام سنگھ ولد راجہ اسکرن سلک امرا میں تھا، اسی طرح رائے پتر داس کھتری قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اور درباری منشیوں میں تھا، اس کے بعد اس کو بلاد ٹھٹھہ یا تتہ کی حکومت ملی اسی طرح رامداس کچھواہہ اکبر کے حاضر باش درباریوں میں تھا، بلی رائے چوہان، اور رائے بھوج ولد رائے سرجن ہزاری امیروں میں تھے، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے، کہ جو امرا پانسو نوکر رکھتے تھے، ان پر "امارت" کا اطلاق ہوتا تھا لیکن مفصلۂ بالا امرا کا درجہ "امارت" سے بڑا تھا،

اب سوال یہ ہے کہ ان منصبداروں سے فارسی زبان کو کیا تعلق ہے؟ اس کے لئے ہمیں عہد حاضر کے

لے اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ میرے پاس ہے، دوران مطالعہ میں اس کتاب کے مصنف کا نام کہیں نہیں ملا، دربار اکبری کے امرا کے سلسلہ میں مؤلف نے مشکوک طریقہ سے اپنا نام لکھا ہے، لیکن ہمایوں کے سلسلہ میں انہوں نے صاف بتایا ہے، کہ اس کتاب کے مؤلف کے والد کا نام محمد مقیم ہروی ہے، ظاہر ہے، کہ محمد مقیم "طبقات اکبری" کا مصنف ہے، اس لئے یہ کتاب ایک ایسے خاندان کے فرد نے لکھی ہے، جو ایک مدت سے مغلوں کے دربار سے وابستہ تھا، اس کے اندر اکبر تک خاندان تیموریہ کا مسلسل تذکرہ پایا جاتا ہے،

والیان ریاست پر ایک نظر ڈالنی چاہیئے، جن میں مشکل ہی سے کوئی ایسا نکلے گا جو انگریزی زبان سے ناواقف ہو اور اکثر تو انگریزی زبان کے ماہر ہیں اس لئے یہ ناممکن ہے، کہ دربار مغلیہ میں ہندو منصبدار حاضری تو دیتے ہوں، مگر بادشاہ اور امرا کی زبان سے نابلد ہوں، اس کے علاوہ ان میں اکثر وہ تھے، جن کو دربار سے بلا واسطہ سروکار تھا، مثلاً راجہ بھارت مل کا خاندان، رام داس کچھواہہ، راجہ لونکرن وغیرہ آخر الذکر کا لڑکا رائے منوہر تو فارسی زبان کا بڑا ادیب اور شاعر تھا اور "توسنی" تخلص کرتا تھا

مسلمان اور سنسکرت و بھاشا سنسکرت اور بھاشا کی تحصیل میں مسلمانوں نے بھی بہت بڑا حصہ لیا، چنانچہ عہد غلاماں ہی سے اس زبان کے شاعر و ادیب، افسانہ نگار دلغوی پیدا ہونے لگے، خسرو دہلوی کی پہیلیاں اس کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں، فیضی اور بدایونی نے سنسکرت سے فارسی میں بہت سی کتابیں ترجمہ کیں دارا شکوہ نے سنسکرت زبان کی کتابوں، اپنشید وغیرہ کے ترجمہ پر کافی توجہ کی، اسی طرح عبدالرحیم خانخاناں تو بھاشا کا ایک مستند شاعر مانا جاتا ہے، چنانچہ معتمد خاں لکھتا ہے

"خانخاناں در قابلیت و استعداد تمام عیار و یکتائے روزگار بود سواد عربی، و ترکی و فارسی و ہندی روان داشت و بہ زبان فارسی و ہندی شعر نیکو گفتے [1]

وہ سنسکرت زبان سے بھی واقف تھا چنانچہ ایک غریب برہمن نے اس کے دربار میں آکر کہا کہ میں اور آپ ساڑھو ہیں آپ لطف و مسرت سے بسر کریں اور میں پریشاں حالی کا شکار رہوں! تو درباریوں نے سوال کیا کہ حضور یہ برہمن آپ کا ہمزلف کیونکر ہوا، خانخاناں نے جواب دیا کہ "بپتا" اور "سمپتا" دو بہنیں ہیں "بپتا" (مصیبت) اس کے عقد میں ہے، اور "سمپتا" (فراغبالی) میری زوجیت میں اس سے پتہ چلتا ہے کہ بھاشا کے الفاظ اس کے دماغ میں کس طرح حاضر رہا کرتے تھے۔ [2]

اسی طرح اکبر کا ایک منصبدار حسین خاں "ٹکریہ" (متوفی ۹۸۲ھ) تھا، ٹکریہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس نے اپنی حکومت لاہور کے زمانہ میں ہندوؤں کو حکم دیا تھا کہ کاندھے کے نزدیک کرتے میں پیوند لگائیں ابن محمد مقیم الہروی لکھتا ہے

وبہ زبان ہندی پیوند را ٹکری می گویند مشہور بہ "ٹکریہ" گشت [3]

چنانچہ دیہاتیوں کے پیرہن میں آج بھی یہ ٹکرہ پایا جاتا ہے،

اسی طرح یوسف عادل خاں دکن کے عادل شاہی خاندان کے بانی کو "سوائی" کہا کرتے تھے، اس کی وجہ تسمیہ

---

[1] اقبالنامہ جہانگیری وقائع سال بستم [2] کلمات الشعرا تذکرۂ خانخاناں [3] تاریخ ابن محمد مقیم الہروی تذکرہ امرائے اکبری

یہ بیان کی جاتی ہے، کہ وہ "سادہ" کا رہنے والا تھا اس لئے عوام کی زبان میں "سادی" کے بجائے "سوائی" ہوگیا لیکن یہ قرین قیاس نہیں صحیح یہ معلوم ہوتا ہے، کہ وہ حکام دکن میں سب سے زیادہ قوی حکمران تھا اس لئے اہل دکن اس کو "سوائی" ہندسہ کے اعتبار سے کہنے لگے، ابوالقاسم لکھتا ہے،

"ومیان شکستہ زبانان ہند بہ "سوائی" مشہور است چہ کہ سوائی بہ زبان ہندی چہار دیک را می گویند چوں عادلشاہ بہ اعتبار ولایت وشمشیر چہار دیک بر حکام دکن زیادتی داشت بنا بران او بہ این لقب شہرت یافتہ[۱]"

آگے چل کر مؤلف مذکور لکھتا ہے، کہ صحیح یہی ہے، کہ "سوائی" سادی کی تحریف ہے، مگر میرے خیال میں "ساوی" کو سوائی کہنے کی کوئی معقول وجہ معلوم نہیں ہوئی اگر "سوائی" کو فرشتہ کی پہلی رائے (چہار دیک) کے مطابق مانیں تو نتیجہ نکلتا ہے، کہ کس طرح ہندی اور فارسی کا میل جول ہو رہا تھا، فیروز شاہ بہمنی کے حرم میں ہر قوم وملک کی عورتیں تھیں، ان میں راجپوت، بنگالی، گجراتی، تلنگی، کنہڑی، مرہٹی عورتیں بھی تھیں فرشتہ کہتا ہے،

وزباں آنہا ہمہ می دانست

مرزا افضل سرخوش (عہد عالمگیری) نے مسلمانوں کی ہندی اور بھاشا کی معلومات کے متعلق بہت سے واقعات درج کئے ہیں، ایک جگہ فرماتے ہیں،

"بیراگی مردے است آزاد مشرب بہ مذاق فقر آشنائی دار دبیش فقیر مشق می گذراند قصہ از کتب ہندی در زمین شاہنامہ بہ نظم راست بہ راست طرز در آوردہ مطالب تصوف را توضیح نمودہ"[۲]

ملا دانا امیر خاں کی سرکار میں منشی تھے، ان کے متعلق مرزا صاحب رقم کرتے ہیں

در معنی ہندی تلاش بسیار داشت

اسی طرح عاقل خاں دہلی کے بہت نیک نیت، حق شناس، رعیت پرور، اور سخی امیر تھے، انہوں نے مثنوی روم کے طرز میں کتاب مرقع تصنیف کی اور عارفانہ کلام پیش کیا، سرخوش کہتے ہیں

گل وبلبل، وشمع وپروانہ، قصۂ پدماوت، ومدہالت را بہ نظم در آوردہ،

ملا شیدا کے ہمنشینوں میں پانی پت کے ایک شاعر تھے، انہوں نے رام وسیتا کا قصہ نظم کیا تھا، اس کے متعلق مرزا سرخوش فرماتے ہیں

ویک بیت در تعریف عصمت سیتا گفتہ کہ جمیع خوش خیالاں پشت دست گذاشتند ہیچکس قدرت ندارد کہ چنیں بیت تواند گفت وایں یک بیت بہ اعتقاد سخنوراں صاحب انصاف برابر لک بیت است (ص ۲۱۰)

---

[۱] فرشتہ مقالہ ۳ [۲] کلمات الشعرا ص ۲۶

و وہ شعر یہ ہے ،

تنش را پیرہن عریاں ندیدہ
چو جان اندر تن و تن جاں ندیدہ

مرزا محمد علی ماہر جیسے نباض سخن نے پہروں اس پر سر دُھنا ، یہی وجہ ہے کہ اس ایک بیت کو اہل نظر نے ایک لاکھ بیت کے برابر تصور کیا

اس عہد کے ایک اور شاعر "نسبتی" تھانیسری تھے ، یہ بھی بھاشا کے اچھے شاعر ہوئے ہیں ، مرزا صاحب فرماتے ہیں

بہ زبان ہندی نیز شعر گفتہ "نسبتی" دراں تخلص می کرد ، یعنی "ماہ" "نس" بہ زبان ہند شب را گویند "بی" "آبرو" یعنی "ابروئے شب" کہ ماہ است ، (ص ۲۲۵)

اس عہد کے مسلمان ادیب و شعرا نہ صرف زبان بھاشا سے دلچسپی لیتے تھے ، بلکہ ہندوستانی معاشرت و رسوم بھی ان کا موضوع سخن تھے ، عہد جہانگیری کا ایک شاعر "ستی" کے متعلق لکھتا ہے ،

چناں مستانہ بر آتش نظر کرد
کہ از بدمستیش آتش حذر کرد ،

جہانگیر شیر کے شکار کے لئے جاتا ہے ، ایک شیر غراں حملہ آور ہوتا ہے ، اور اس کے ایک ہندو منصبدار انوپ رائے کو دبوچ لیتا ہے ، کشمکش شروع ہوتی ہے ، اور وہ امیر بڑی بہادری کے ساتھ شیر کے پنجہ سے نکل آتا ہے ، شیر مارا جاتا ہے ، اور جہانگیر اپنے امیر کو " رائے سکھ دکھن " کا خطاب دیتا ہے ، (اقبالنامہ وقائع سال پنجم)

عالمگیر کے ایک خط سے پتہ چلتا ہے ، کہ اس کا لڑکا شہزادہ محمد معظم ، بادشاہ کی خدمت میں دو قسم کا آم بھیجتا ہے ، اور استدعا کرتا ہے کہ ان کا نام رکھا جائے بادشاہ ان کا نام " رسنا بلاس " تجویز کرتے ہیں ۔ (ملاحظہ ہو رقعات عالمگیری)

(باقی)

عبدالمالک (آروی)

ضرورت ہے

نگار جنوری ، جون و اگست سنہ ۱۹۲۳ء کے پرچوں کی ۔ اگر کوئی صاحب علیحدہ کرنا چاہیں تو اطلاع دیں ۔

مینجر نگار

حسن وعشق کی کشاکش

(تاریخ یونان کا ایک ورق رنگین)

(۱)

صنوبر، ــــــ دیہاتی لڑکی حسین بلا کی حسین، دیکھنے والے نے دیکھا نہیں کہ ساری کی ساری آنکھوں کی راہ بدن میں سما گئی۔ رگ رگ میں دوڑ گئی۔ کلیجہ میں اتر آئی۔ دل وجگر چھلنی ہوگئے۔ خون جوش میں آگیا۔ آنکھوں میں نور بھر گیا۔ چودہ طبق روشن ہوگئے

غارتگر دیں وہ بت کافر تھی سراپا۔ اللہ کی قدرت

پاری، ــــــ ٹرائے کا نوجوان بادشاہ، شکار کھیلتا ہوا اُدھر سے گذرا۔ صنوبر پر نظر پڑی۔ سناٹے میں آگیا۔ زمین پاؤں تلے سے نکل گئی۔ بے اختیار آگے بڑھا۔ حسینہ کے قدموں پر جھک گیا۔ وہ مسکرائی، کھلکھلا کر ہنسنے لگی، بادشاہ کی آغوش میں آگئی۔ دونوں ایک ہوگئے

حکایت بود بے پایاں بخاموشی ادا کردم

رات دن عاشق معشوق ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے اور یونہی ایک زمانہ گذر گیا۔ ایک دن ٹرائے کے شاہی باغ میں دونوں بیٹھے ایک دوسرے کو محبت سے تک رہے ہیں۔ صنوبر نے پوچھا:ــ "کیا سچ سچ تم مجھ سے سچی محبت کرتے ہو؟ اچھا قسم کھاؤ کسی اور کو نہیں چاہو گے!"

ــــ "میری جان! تمھارے ننھے سے دل میں یہ وسواس کیوں آتے ہیں؟ قسم تمھارے سر کی میں قیامت تک تمھارے سوائے کسی اور کو نہیں چاہوں گا۔ پیاری! یہ کیا غضب ہے کہ تم میری محبت میں اتنا شک کرتی ہو!"

ــــ "پیارے! یہ سچ ہے، تم مجھے ضرور چاہتے ہو۔ مگر ــــ تمھاری محبت کا کیا اعتبار! کل حسن کی دیوی اسپارٹا کی ملکہ ہیلن کو دیکھ لوگے اُسے چاہنے لگوگے اور میری محبت تمھارے دل سے یک قلم کافور ہو جائے گی۔ پیارے! قسم کھاؤ تم کبھی ہیلن کو نہیں چاہوگے!"

صنوبر کی آنکھوں سے دو بڑے بڑے آبدار موتی نکلے اور پھول سے رخساروں پر چمکنے لگے۔ پاری حیرت میں ہے

"ہیلن، ہیلن! ۔ یارب یہ ہیلن کیا بلا ہے؟ الگزنڈرا بھی یہی کہتی ہے۔ کیلوپیٹرا نے بھی یہی کہا۔ اور اب تم بھی یہی کہتی ہو۔ کوئی بتاؤ کہ یہ ہیلن میں کونسا جادو بھرا ہے۔ جو دیکھتا ہے اس کا شکار ہوجاتا ہے۔ میں ہیلن کو ضرور لونگا دیکھوں میرا دل کیسے چھینتی ہے۔ لو میں چلا۔ پیاری! نہ روکو، جانے دو۔ میں چلا۔ اور وہ چلا گیا۔"

ٹرائے سے چل کر پاری سیدھا اسپارٹا پہونچا۔ یونان کے بادشاہ مونی لس کا مہمان ہوا۔ اُسے ملکۂ حسن وجمال بادشاہ مونی لس کی بیوی، ہیلن کی خدمت میں آسانی سے باریابی حاصل ہوگئی۔ اُس نے ملکہ کو دیکھا، ملکہ نے اسے دیکھا۔ آنکھوں سے آنکھیں لڑیں۔ دل سے دل ملے۔ ایک ہی نظر میں تمام معاملات طے ہوگئے، پیچ کھل گئے، گتھیاں سلجھ گئیں۔ واقعی ہیلن، کچھ اور ہی چیز تھی

(۲)

بھیانک رات۔ تاریکی۔ سناٹا۔ تیز رو گھوڑے پر ایک بہادر شہسوار اور ایک پری پیکر حسینہ ہوا سے باتیں کر رہے ہیں! خوفناک دن۔ طوفان۔ شور۔ قیامت۔ سمندر کی موجوں پر ایک نوجوان ملاح کسی ماہ طلعت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کشتی چلا رہا ہے!

یہ دونوں کون ہیں؟

طرح طرح کی افواہیں گشت کر رہی ہیں۔ ہر جگہ یہی چرچا، ہر طرف یہی قصہ، یونان کی رگِ حمیت جوش میں آگئی۔ ایشیا والوں سے انتقام کی تیاریاں ہیں۔ بچہ بچہ کی زبان پر ہیلن کے اغوا کی داستان ہے۔ لوگ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق قیاس آرائیاں کرتے ہیں:— "یہ ہو نہیں سکتا! — اگر وہ خود راضی نہ ہوتی تو کس کی مجال تھی! — اور یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ راضی ہو — تو پھر اس کا بھید؟ وہ پاری کے ساتھ کیوں چل دی؟"

کارکنان قضا و قدر شوق و استعجاب سے کرۂ زمین کے مستقبل کو دیکھ رہے۔ شاید کوئی عظیم الشان انقلاب آنے کو ہے! شاید پھر زمین کا طبقہ الٹنے کو ہے! ہواؤں میں ہیلن اور پاری کی داستان پھیلی ہوئی ہے۔ آسمانوں پر یہی چرچا ہے۔ وہ پاری کے ساتھ کیوں.....؟

جنگ چھڑ گئی! — عالمگیر جنگ۔ خونخوار، خونریز، ہولناک۔ جوپیٹر کا قہر۔ جوپیٹر کی پناہ! الامان الحفیظ! —

کچھ تاجدار اسپارٹا (یورپ) کی حمایت میں ہوگئے۔ کچھ ٹرائے (ایشیا) کی۔ برسوں لڑائی جاری رہی دو چار، پانچ چھ، سات آٹھ، دس بارہ برس گذر گئے اور جنگ کی آگ کم نہ ہوئی بڑھتی چلی گئی

آخر، تابکے؟ — ٹرائے کی فوجوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ پاری مارا گیا۔ ایشیا والوں کو شکست ہوئی۔ مونی لس جیت گیا۔ فتح کے شادیانے بجنے لگے۔ قتل عام شروع ہوگیا

موئی لس، ہیلن کے قتل کرنے کے لئے دیوانہ وار شاہی محل کی طرف دوڑا۔ اُدھر سے وہ استقبال کو نکلی! عظمت و حرمت کی دیوی! حسن وجمال کی مورت!۔ اس نے قاتل کی آسانی کے لئے آنچل ہٹا دیا، سینہ کھول دیا، تصویر عفت سیدھی کھڑی ہوگئی، خاموش، متین، آفتاب، ماہتاب

خونخوار شہنشاہ سکتہ میں آگیا۔ دم بخود رہ گیا۔ اس اُبھرے ہوئے سینہ کو چیروں یا اس ہنس کی سی گردن کو کاٹوں؟ ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔ قریب تھا کہ خنجر ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑے۔ تھرتھرانے لگا۔ ڈر گیا۔ دنگ ہوگیا۔ ہیلن پہلے سے کہیں زیادہ حسین، کہیں زیادہ شگفتہ۔ حسن وعفت کی مکمل تصویر۔ صانع قدرت کے کمال کا مرقع۔ گلشن فردوس کا بہترین گلاب۔ اس کی عمر بڑھنے کے بجائے بارہ برس گھٹ گئی تھی۔ نئے سرے سے کم سن ہوگئی تھی۔ سولہ برس کی لڑکی!

کسی نے پیچھے سے کہا:۔۔۔ "جہاں پناہ! ہاتھ روکئے!۔ یہ کیا غضب ہے!۔ جوپیٹر نے عالی جاہ کو کامیاب بنایا پاری مارا گیا۔ دشمن پامال ہوئے۔ ملکہ حسن وجمال واپس مل گئیں۔ اب یہ خون کیسا!۔ ملکہ کو ساتھ لیجئے اور اسپارٹا چلئے۔ آخر یہ جنگ اسی لئے تو ہوئی تھی کہ ملکہ واپس لائی جائیں!

موئی لس چپ تھا۔ یہ جنگ کیوں ہوئی؟ یہ عظیم الشان جنگ؟ بارہ برس کی مسلسل جنگ؟ کیا اسی لئے کہ ہیلن واپس لائی جائے! شاید!۔ مگر میں تو یہ نہیں سمجھا تھا۔ کہیں کوئی اور مقصد نہ ہو! کچھ یاد نہیں آتا۔ شاید! مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے؟۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔

(۳)

گناہ، بالجبر، بدترین، ارذل ترین، اسفل ترین۔ سپاہ سالار اعظم "ئی اَلس" نے زیادتی کی۔ خود خداوند قدوس کے حضور، خود خداوند جوپیٹر کے مندر میں، محراب کے پاس، مورت کے سامنے، دن کے وقت، الگزنڈرا پاری کی بہن۔۔۔۔۔۔ صاف، صریح، ظلم عظیم۔ اثم کبیر

ئی اَلس کا بیان ذرا مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے عبادت گاہ میں اُس وقت خداوند کی مورت موجود نہ تھی۔ لہٰذا مجھ پر خداوند کی توہین کا الزام غلط ہے۔ مگر اس کی حجت مسموع نہ ہوئی اور خداوند جوپیٹر کی توہین کی پاداش میں اُسے پھانسی کی سزا دیدی گئی۔ نیز اسی معصیت کے کفارہ میں لگاتار چالیس دن تک روز سو سو بکروں کی قربانی کا سلسلہ جاری رکھنا ضروری سمجھا گیا۔ تمام فاتح تاجداروں کی یہی رائے تھی۔ صرف بادشاہ موئی لس اس رائے سے متفق نہ تھا

موئی لس نے کہا:۔ ئی اَلس کا قصور صرف اتنا ہے کہ اس نے جلدی کی، اگر ایک روز ٹھہر جاتا تو الگزنڈرا بطور لونڈی کے اس کے حوالہ کر دی جاتی اور کوئی گناہ نہ ہوتا۔ اب ئی اَلس مارا جا چکا ہے۔ قربانیاں بھی تھوڑی بہت ہو چکی ہیں، لہٰذا اب اس اُجڑے ہوئے شہر میں پڑے رہنا اور قربانیوں کا سلسلہ جاری رکھنا، مناسب نہیں۔ اگر خداوند جوپیٹر کو اس شہر کی بے حرمتی منظور نہ ہوتی تو یہ شہر ویران نہ ہوتا، لوٹا نہ جاتا۔ میں اتنی لمبی قربانیوں کا قائل نہیں ہوں

میرے نزدیک یہاں رکنا بے سود ہے
بادشاہ آگمونس نے جواب دیا :- تم اس گناہ کا احساس نہیں کر سکتے ! تمھارے گھر کا رنگ ہی کچھ اور ہے۔ ہیلن کو دیکھو کتنوں نے اُسے شکار کیا اور کتنوں کو اس نے شکار کیا ! تم ٹی ٹس کے گناہ اور خداوند قدوس کی توہین کا کیونکر تصور کر سکتے ہو ! اپنا فلسفہ پاس رکھو۔ قربانی کے فرائض ترک نہیں ہو سکتے !

مونی لس ——— میں یہ منطق سمجھنے سے قاصر ہوں

آگمونس ——— اچھا، تو تم چلے جاؤ۔ اور اپنا لشکر ساتھ لے جاؤ۔ ہم اور ہماری فوجیں یہیں ٹھیریں گی

مونی لس ——— میں کل روانہ ہوں گا

خداوند جوپیٹر کے مندر میں منبر کی سیڑھیوں پر ہیلن کھڑی قربانی کے فرائض انجام دے رہی ہے۔ اس کی روشن پیشانی پر پسینہ کی بوندیں جھلک رہی ہیں۔ سامنے مقدس آگ جل رہی ہے جس میں وہ آہستہ آہستہ گھی ڈال رہی ہے۔ راہب جوپیٹر کی حمد گا رہے ہیں۔ آگ کی گرمی سے ہیلن کا رنگ سرخ ہو رہا ہے۔ ہزاروں لاکھوں سپاہیوں کی نگاہیں خداوند جوپیٹر کے بجائے اسی حسن کی جیتی جاگتی مورتی کی پوجا کر رہی ہیں۔ جوپیٹر کی مورت پر کسی کی بھی نظر نہیں۔ البتہ ہیلن اسی خداوند قدوس کے مقدس سونے کے پتلے کو دیکھ رہی ہے۔ اس کی عبادت بے نوبی، بے عیب، بے ریا ہے۔ شام ہو گئی اور ہیلن پہلے دن کی قربانی کے فرائض انجام دے چکی۔ اب انتالیس دن اور باقی رہ گئے

رات کے وقت ہیلن اور مونی لس میں باتیں ہو رہی ہیں

مونی لس ——— ہم کل اسپارٹا روانہ ہوں گے

ہیلن ——— ایں !۔ اتنی جلدی !۔ اور قربانیاں !

مونی لس ——— کیا اب بھی جلدی ہے ! تم ٹھہرنا چاہو تو شوق سے ٹھہرو

ہیلن ——— نہیں - میرے لئے تو ہر جگہ برابر ہے۔ ٹرائے ہو یا اسپارٹا۔ یورپ ہو یا ایشیا۔ البتہ سپاہیوں کے احساس کا خیال ضروری ہے۔ ان کے دلوں سے قربانی کی اہمیت کیونکر دور کی جا سکتی ہے !۔ اور پھر جیسا تم مناسب سمجھو۔ تعجب ہے کہ میرے تعاقب میں تو اتنی جلدی نہیں کی گئی تھی۔ اور قربانی کی تمام رسمیں ایک ایک کر کے ادا کی گئی تھیں۔ حالانکہ وہ جلدی کا محل تھا نہ کہ اب۔ میرے خیال میں قربانی کی رسمیں ادا ہو لیں تو چلیں۔ اس کے علاوہ لشکری سب بہت تھک بھی گئے ہیں۔ تھک کے چور ہو گئے ہیں۔ انھیں کچھ دنوں کے لئے آرام مل جائے گا۔ لشکریوں کو ناخوش کرنا مصلحت کے خلاف ہے کہو، تم کیا کہتے ہو ؟

مونی لس ——— خدا ہماری قربانیوں کا بھوکا نہیں۔ آگمونس اور اس کے ساتھی یہاں بیٹھے قربانیاں کرتے رہیں گے۔ میں اپنے لشکر کے ساتھ کل روانہ ہو جاؤں گا

ہیلن ——— میرے خیال میں تمہارا بھائی آگو نس حق پر ہے اور تم غلطی پر ہو

مونی لس ——— شاید میرا دماغ چل گیا ہے۔ مگر میں صبح روانہ ہوں گا۔ تم چلوگی یا نہیں ؟

ہیلن ——— میں چلوں گی

(۴)

کشتی ڈول رہی ہے اور ہوا مخالف ہے۔ ہیلن کی زلفوں سے تیز ہوا کے جھونکے بدمستیاں کر رہے ہیں۔ اس کی آنکھیں دور سمندر کی حد پر گڑی ہوئی کتاب شفق کا مطالعہ کر رہی ہیں۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر، سمندر کے تلاطم سے بے پروا، زمانہ کی نیرنگیوں سے بے فکر، کسی اور ہی عالم میں مدہوش ہے۔ سپاہی بار بار اس کی طرف دیکھتے اور کہتے ہیں :——" اگر یہ آسمانوں کی دیوی ہمارے ساتھ نہ ہوتی تو کشتی ڈوب جاتی اور ہم سب مرجاتے۔ بھلا خداوند جوپیٹر کا مقابلہ کون کرسکتا ہے ! "

ہیلن نے کروٹ بدلی۔ ملاحوں کے ہاتھ خود بخود رک گئے۔ سب ہمہ تن گوش ہوگئے۔ وہ کہنے لگی :—

" ہم کہاں جارہے ہیں ؟ "

مونی لس :—— اسپارٹا !

ہیلن ——— نہیں۔ یہ اسپارٹا کا آسمان نہیں ہے

کئی ہفتے گذر گئے اور شاہی بیڑا اسپارٹا نہ پہنچ سکا۔ ادھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ سامان رسد بھی ختم ہوگیا۔ چاروں طرف ہلاکت ہی ہلاکت نظر آنے لگی۔ بڑی مدت کے بعد آسمان پر کچھ مرغابیاں دکھائی دیں۔ پھر کنارہ نظر آیا۔ مونی لس چلا اٹھا :- "ہیلن! وہ دیکھو! اسپارٹا کا ساحل آگیا ! "

ہیلن نے کہا :—" نہیں یہ اسپارٹا کا ساحل نہیں۔ کوئی اور بستی ہے "

وہ اسپارٹا نہ تھا۔ مصر کی زمین تھی۔ کشتی رکی تو سب سے پہلے ہیلن بے دھڑک کنارہ پر اتر آئی۔ لب ساحل شاہی خیمے نصب ہوگئے۔ مصر میں اک دھوم مچ گئی۔ " ہیلن آئی ! ہیلن آئی ! جنگِ عظیم کی دیوی ! حسینانِ عالم کی رانی! معشوقانِ جہاں کی ملکہ ! "۔ مصر والے حیرت میں تھے۔ یہ کوئی بشر ہے، یا حور ہے، یا پری ہے، یا آسمان کا تارہ !

ہیلن کو مصر کی سرزمین بہت پسند آئی۔ اس نے اپنے خاوند سے کہا :- یہ کیسی حیرت انگیز زمین ہے ! یہاں کی ہر چیز بے نظیر، بے عدیل، بے بدل ! میں تو کہتی ہوں کہ تہذیب و تمدن میں بھی مصر، اسپارٹا اور ٹرائے دونوں سے بڑھ کر ہے

مونی لس ——— مجھے اتنی فرصت نہیں کہ یہاں کے تمدن کا اپنے تمدن سے مقابلہ کروں۔ ہمیں چاہیے کہ جلد سے جلد تمام سامان رسد فراہم کرلیں اور چل نکلیں ! میرے لئے ایک ایک منٹ پہاڑ ہو رہا ہے

ہیلن ـــــــ اور قربانیاں!

موتی لس ـــــــ کیسی قربانیاں! قربانیاں قطعاً غیرضروری ہیں۔ ہمیں چلنے میں دیر نہیں کرنی چاہئے!

ہیلن ـــــــ قربانیاں بہت ضروری ہیں۔ کیونکہ ہمارے ساتھی بزدل ہو رہے ہیں

موتی لس ـــــــ تم انھیں بزدل نہیں کروگی تو وہ بزدل نہیں ہوں گے۔ تم چلنے کو تیار رہو؟

ہیلن ـــــــ میں تیار ہوں

رات کو موتی لس اپنی چادر کے اندر ایک بھیڑی کا بچہ چھپا لایا۔ اس نے بچہ خداوند جوپیٹر کی تصویر کے سامنے ذبح کیا۔ اور ہاتھ جوڑ کر دعائیں مانگنے لگا۔ دیر تک دعائیں مانگتا رہا۔ ہیلن جاگ رہی تھی۔ دل ہی دل میں مسکرانے لگی۔ اور خاموش پڑی رہی

چند روز بعد کشتیاں روانہ ہوئیں اور ہوا پھر مخالف ہو گئی۔ نہ معلوم موتی لس کے نصیبوں میں کیا لکھا تھا۔ تند ہوا، شور سمندر، بزدل ملاح، ہر طرف ناکامی ہی ناکامی کا سامنا تھا۔ دوسرے دن کشتی جزیرہ مردہ کے ساحل پر جا لگی۔ پھر ہیلن جلدی سے خشکی پر اتر آئی۔ موتی لس حیران تھا یہاں اترنے کا حکم کس نے دیا۔ اور کب دیا؟ مگر وہ خاموش رہا کیونکہ سپاہی بزدل تھے اور سمندر میں تلاطم تھا

ہیلن اس شور بنجر زمین میں بھی چاروں طرف گشت لگایا کرتی۔ یہاں نہ کوئی آدم نظر آتا نہ آدم زاد۔ نہ پینے کو پانی کھانے کو دانہ۔ سمندر کی شوریت نے جزیرہ کی مٹی کو زہریلا بنا دیا تھا

کئی ہفتے گذر گئے۔ پھر سامان رسد گھٹ گیا۔ اور سپاہی بھوک سے پریشان ہونے لگے

موتی لس نے ہیلن سے کہا:ـــ "مصر واپس چلنا چاہئے۔ ورنہ یہاں سب بھوک سے مر جائیں گے۔ مصر یہاں سے ایک ہی دن کے فاصلہ پر تو ہے"ـــ ہیلن نے جواب دیا:ـــ "یہاں ایک دن بھی رکنا مناسب نہ تھا تب تم اتنی مدت کیوں ٹھہرے؟"

اسی وقت چند پریشان حال سپاہی اجازت لے کر خیمہ کے اندر داخل ہوئے اور کہنے لگے:۔

"جہاں پناہ! ہم نے ہمیشہ وفاداری سے آپ کا ساتھ دیا۔ مگر اب مجبور ہیں ساتھ دے نہیں سکتے۔ ہم نہیں چاہتے کہ یہاں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں۔ آخر ہمیں کس جرم کی سزا میں یہاں قید رکھا گیا ہے، جہاں نہ دانہ ہے نہ پانی۔ نہ آدم نہ آدم زاد۔ نہ چرند نہ پرند"ـــ موتی لس ـــ "ہم مصر جانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ جاؤ تیار ہو جاؤ! آج دوپہر سے لنگر اٹھ جائیں!۔ جلدی کرو جاؤ کیوں نہیں جاتے؟ کیا کھڑے ہو؟ کیا کہتے ہو؟ کچھ اور کہنا ہے؟ بولو؟

"جہاں پناہ! قربانیاں!ـــ (باقی آئندہ)

ترجمہ) محمد اسحاق (امرتسری)

انگریزوں کی آئینی آزادی

یوں تو ہر انگریز بادشاہ کا ماتحت ہے اور اس لحاظ سے اس کو انگلستان کی رعیت کہا جا سکتا ہے لیکن فی الحقیقت تمام شہری حقوق (Rights of Citizenship) جو کسی آزاد سے آزاد ملک میں لوگوں کو حاصل ہیں وہ اس کو بھی حاصل ہیں اس لئے اس کو اپنے ملک کا (Citizen) کہنا چاہئے۔ بادشاہ سے اس کا تعلق قدیم نظام جاگیری (.... System) کے زمانہ سے ہے۔ لیکن وہ تعلق اس قسم کا ہے کہ وہ قومیت کے ترقی میں معین ہے اور (Citizenship) کے حقوق میں حائل نہیں ہے۔ اس کے اور عمدہ نتائج نظر انداز کر کے بھی آئینی اعتبار سے ایک نتیجہ اس کا یہ ہے کہ بادشاہ کو تسلیم کرنے کے بعد ہر شخص کو انگلستان میں رہنے سے تمام حقوق برٹش رعایا ہونے کے ہو جاتے ہیں۔ اسی اصول کی بنا پر جب (Hanover) ہینوور خاندان کا بادشاہ جارج اول تخت نشین ہوا تو (Hanover) جو جرمنی میں ہے وہاں کے لوگوں کو پارلیمنٹ میں بیٹھنے اور ووٹ دینے کا حق حاصل ہو گیا۔ یہ قصہ ایک معرکۃ الآرا مقدمہ میں اس وقت طے ہوا جبکہ یہ سوال اٹھا کہ بادشاہ جبکہ انگلستان کا تاج پا گیا ہو تو وہ بچہ جو (Edinburgh) میں پیدا ہوا ہو وہ تخت پا سکتا ہے یا نہیں اور آیا وہ ملکی یا غیر ملکی سمجھا جاوے گا۔ اس مقدمہ میں یہ طے پایا کہ وہ ملکی سمجھا جاوے گا۔ اس طرح انگلستان میں صرف ایک چیز جو ضروری ہے وہ بادشاہ کو تسلیم کر لینا ہے۔ اس کے بعد آدمی آدمی کے درمیان کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا وہ پارلیمنٹ وغیرہ کا ممبر اور ووٹر بن سکتا ہے۔ وہ میونسپل ووٹر بھی بن سکتا ہے۔ سول یا ملٹری ملازمت حاصل بھی کر سکتا ہے اور بہ استثنائے چند حالتوں کے جلاوطن نہیں ہو سکتا لیکن یہ واضح رہنا چاہئے کہ غیر ملکی کو بھی انگلستان میں چند حقوق حاصل ہیں۔ حالانکہ پہلے نہ تھے۔ مثلاً ایک غیر ملکی وہاں زمین حاصل کر سکتا ہے۔ اور ورثتاً بھی زمین پا سکتا ہے اور بعض پیشوں کو بھی حاصل کر سکتا ہے مثلاً وہاں ڈاکٹر یا بیرسٹر ہو سکتا ہے

فرانس اور امریکہ میں اس قسم کا کوئی قاعدہ نہیں ہے۔ اور چونکہ وہاں کسی بادشاہ کی اطاعت وغیرہ لازم نہیں ہے اس لئے (Citizenship) کے حقوق پر وہاں بہت اہمیت دی جاتی ہے اور آزادی پر بڑا فخر کیا جاتا ہے۔ ایک نقص اون کے نظام میں یہ ہے کہ جب کوئی نیا ملک امریکہ یا فرانس کے تحت میں ہوتا ہے تو وہ ایسے کسی مرکز کو نہیں پاتا جس کی طرف وہ رجوع کر سکے۔ جیسا کہ برٹش رعایا بادشاہ سے بہ آسانی رجوع کر سکتی ہے۔ دیگر ممالک میں وہ حقوق بھی غیر

ملکیوں کو حاصل نہیں ہیں جو انگلستان میں غیر ملکی برٹش رعایا کو حاصل ہیں مثلاً (Phillipines) کے امریکہ کے تحت میں ہونے کے باوجود وہاں کے باشندوں کو امریکہ میں (Citizenship) کے حقوق حاصل نہیں ہو سکتے اسی طرح گو الجیریا (Algiers) کے مسلمان فرانس کے ماتحت ہیں لیکن اون کو فرانس میں کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ برخلاف اس کے ہر برٹش رعایا کو صرف (British Citizenship) نہیں بلکہ (British Nationality) کے بھی حقوق حاصل ہو سکتے ہیں

عام طور پر (British Nationality) کے حقوق حسب ذیل وجوہ پر حاصل ہو سکتے ہیں :-

(۱) کسی برٹش ڈومنین (نوآبادی) یا برٹش جہاز پر پیدا ہونے سے

(۲) باپ کے برٹش ہونے سے

(۳) اس ملک کا باشندہ ہونے سے جو سلطنت برطانیہ میں شامل ہو جائے

(۴) (Certificate of Nationalisation) حاصل کر لینے سے

(۵) کوئی عورت اگر کسی برٹش سے شادی کرے تو یہ حقوق حاصل ہو جاتے ہیں

انگلستان کے ..... آئین کے اعتبار سے آزادی کو تین مختلف طریقہ پر تقسیم کیا جا سکتا ہے

اوّل۔ پارلیمنٹ کی آزادی اور تاج کے حدود

دوم۔ باشندگان ملک کی روزانہ زندگی میں مداخلت کی کمی

سوم۔ قانونی شیرازہ بندی کی وسعت

نمبر اول و دوم کے متعلق یہاں لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کیونکہ پارلیمنٹ۔ تاج۔ اور قانونی فضیلت پر جو کچھ پہلے لکھا گیا ہے۔ اس سے اس مسئلہ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ یہاں پر صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ایک انگریز اپنے طرز نظام کے ہر رُخ اور ہر شعبہ میں اپنے دماغ۔ جسم اور جائداد کی کامل آزادی چاہتا ہے۔ اور اسی کو نظام کا بنیادی اصول سمجھتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے مُلک کے نظام میں اُس کے لئے شکنجے اور حدود نہیں ہیں۔ وہ تو موجود ہیں لیکن وہ ان کو فطری اصول نظم و تنظیم سے آگے تجاوز ہوتے دینا نہیں چاہتا

نمبر ۲ کے ضمن میں خاص طور پہ دو باتیں شامل ہیں۔ آزادی نقل و حرکت و آزادی تقریر

قدیم زمانہ میں بادشاہ کو یہ اختیار حاصل تھا کہ اپنی رعایا میں سے جس کو چاہتا گرفتار کر سکتا اور قید کر سکتا تھا لیکن (Habeas Corpus Act) یعنی " قانون لزوم تحقیقات محبوس " نے جو ۱۶۷۹ء میں پاس

ہوا بادشاہ کے اس اختیار کا قلع قمع کر دیا۔ اس ایکٹ کی رو سے تمام برٹش رعایا ہر قسم کے حبس بے جا سے محفوظ رکھی گئی ہے۔ گورنمنٹ کا کوئی افسر کسی شخص کو بے جا قید نہیں کر سکتا۔ اور اگر گورنمنٹ یا کوئی افسر یا کوئی معمولی آدمی کسی کو حبس میں رکھے تو اس کے خلاف قانونی کارروائی عمل میں لائی جاتی ہے۔ اس اصول کا نفاذ تو بہت پہلے سے تھا لیکن یہ ایکٹ اس وقت پاس ہوا جبکہ پریوی کونسل نے ایک شخص مسمی فرانسس جنکنس (Francis Jenkins) کو ایک سیاسی تقریر کی وجہ سے قید کر دیا تھا۔ اور اس فیصلے کے خلاف کوئی عدالت اور جج سننے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔

اسی ایکٹ کی رو سے رعایا کو یہ بھی حق دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص فوجداری کے کسی جرم میں قید کیا جائے یا حوالات میں بند کیا جاوے تو اس کی طرف (Lord Chancellor) یا جج کو عرضی دی جا سکتی ہے کہ (Habeas Corpus) کے ذریعہ سے اُس افسر کو حکم دیا جاوے جس نے اوس کو محبوس کر رکھا ہے کہ وہ فوراً عدالت میں اس کو حاضر کرے۔ اس حکم کے جاری ہوتے ہی جج کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ دو دن کے اندر اس کو بلا ضمانت یا ضمانت پر چھوڑ دے۔ اگر جج ایسا نہ کرے تو پانچسو پونڈ تک جرمانہ کا مستحق ہوگا۔

اس قانون کو ۱۶۸۸ء کے (Bill of Rights) نے اور بھی مضبوط کر دیا کیونکہ اس سے بہت بھاری ضمانت طلب کرنے کی ممانعت ہو گئی۔ ۱۸۱۶ء کے ایکٹ نے اس قانون کی وسعت کو اور بڑھا دیا کیونکہ اس ایکٹ کی رو سے علاوہ فوجداری کے جرائم کے اور کسی قسم کی گرفتاری اور قید پر بھی یہ ایکٹ نافذ تھا۔

یہ ایکٹ ایسی کارروائیوں میں دخل نہیں دیتا جو جائز ہیں۔ مثلاً قانون فوجداری کی رو سے بعض دفعات کے تحت میں ملزم کی گرفتاری جائز ہے۔ اسی طرح عدالت عالیہ کے ججوں کو توہین عدالت کرنے میں ملزم کو قید کرنے کا اختیار ہے۔ پارلیمنٹ بھی خاص صورتوں میں بعض لوگوں کو قید کرنے کی مجاز ہے۔ جنگ کے زمانہ میں (Defence of the Realm Act) کے ذریعہ سے کچھ اختیارات قید کرنے کے اور نقل و حرکت روکنے کے حاصل کئے گئے تھے۔ ایسی صورتوں میں (Habeas Corpus Act) کا نفاذ نہیں ہو سکتا۔

اگر ایک شخص اپنی بیوی کی آزادی کو قطعی روک دے سوائے اس حالت کے جبکہ وہ کسی کے ساتھ بھاگنے والی ہے تو (Habeas Corpus) کی کارروائی اس کے خلاف ہو سکتی ہے۔ اس ایکٹ کی کارروائی کرنے کا حق صرف بادشاہ کی رعایا ہی کو نہیں بلکہ اوروں کو بھی حاصل ہے۔ یہاں پر ایک مقدمہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا (James Somersel) ایک حبشی غلام تھا۔ وہ (Virginia) سے ۱۷۷۲ء میں انگلستان لایا گیا۔ وہ اپنے مالک کے پاس سے بھاگ گیا۔ مگر گرفتار کر کے ایک جہاز پر بٹھایا گیا۔ اس غلام کی طرف سے (Habeas Corpus) کی کارروائی کی گئی اور جب جہاز واپس آیا تو لارڈ منس فیلڈ (Lord Mansfield) جو اس وقت (Chief Justice)

تھے یہ فیصلہ کیا کہ غلام، ننگ تہذیب و تمدن ہے اور کوئی چیز غلامی کی حامی نہیں ہو سکتی - چنانچہ وہ رہا کر دیا گیا - انھوں نے اپنے فیصلہ میں لکھا کہ انگلستان کی فضا غلامی کے تخیل کو برداشت نہیں کر سکتی - شاید ہمارے ہندوستانی بھائی اس مسئلہ کو ایک حال کے واقعہ سے زیادہ آسانی سے سمجھ سکیں گے - ہمارے ایک دوست حال میں ایک نوکر اپنے ساتھ ولایت لے گئے - انگلستان میں نوکر اور مالک میں وہ امتیاز نہیں ہے جو یہاں ہے - وہاں اس کے ساتھ سفر کرنا کھانا کھانا عیب نہیں ہے بلکہ (Please & Thanks) کا لفظ جیسا اوروں کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے اس کے ساتھ بھی ہر وقت استعمال کیا جاتا ہے - چنانچہ جب ایک بہت بڑے پنشن یافتہ افسر نے جو ہندوستان میں بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ بھی امتیازی برتاؤ کرتے تھے جب ان کی دعوت کی تو نوکر کو بھی اپنے ساتھ کھانا کھلایا اور اپنے داہنے ہاتھ پر موٹر میں بٹھا کر سیر کروائی - ہندوستان میں اس کے خلاف جو نوکر کے ساتھ برتاؤ کیا جاتا ہے وہ سب پر روشن ہے

فرانس میں بھی ۱۸۳۸ء ایک اس قسم کا مقدمہ ہوا تھا - اس میں بھی غلام کے موافق طے پایا تھا - لیکن امریکہ کا آئین کچھ اور کہتا ہے - وہاں کے آئین کے الفاظ یہ ہیں کہ "جو آدمی کسی خدمت یا مزدوری کے لئے مقرر کیا جاوے اور وہ بھاگے تو وہ چھوڑا نہیں جائے گا بلکہ وہ اس مالک کے حوالے کیا جائے گا - جس کی مزدوری وہ کرتا تھا - قانون کی یہ بندش انگلستان کے مندرجۂ بالا مقدمہ ہی کی وجہ سے ہوئی اور اس سے دونوں اقوام کے تخیل کی روش معلوم ہوتی ہے

آزادی تقریر یا تحریر آزادی کا سب سے اہم جزو ہے - اسی حق آزادی کے ذریعہ سے انسان اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہے - اور اخلاقی تمدنی و سیاسی اصولوں کی تبلیغ کر سکتا ہے - تہذیب کے ارتقا میں اس آزادی کا سب سے بڑا ہاتھ ہے اور جن اقوام نے اس کی اہمیت کا پورا اندازہ نہیں کیا وہ ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں

انگلستان میں یہ حق دو چیزوں سے حاصل ہے

(۱) (Rule of Law) یا آئینی دستور

(۲) آزادی کا وہ قومی جذبہ جو قوم کے آئینی ضمیر کو ہمیشہ جلا دیتا رہتا ہے

اگر ان دونوں اصولوں کے فلسفہ پر پورے طور سے غور کیا جاوے تو معلوم ہو جائے گا کہ انگلستان نے اپنے باشندوں کو تقریر و تحریر کی پوری آزادی دی ہے مگر اُسی کے ساتھ قانون کے ذریعہ سے آزادی کو اسقدر منظم کر دیا ہے کہ یہ آزادی بیجا طور پر استعمال نہیں ہو سکتی - وہ لوگ مُلک کے فائدہ کے لئے ہر طرح کی نکتہ چینیاں کر سکتے ہیں لیکن اوسی کے ساتھ کسی کو بے جا طور پر ذلیل نہیں کر سکتے - اور نہ کسی کو بے جا نقصان پہونچا سکتے ہیں (Lord Mansfield)

لکھتا ہے کہ پریس کی آزادی اس پر منحصر ہے کہ کسی چیز کی اشاعت کے لئے کسی اجازت کی ضرورت نہ ہو لیکن قانونی نتائج نظر سے فروگذاشت نہ کئے جاویں

ایک اور انگریز ماہر آئین لکھتا ہے " ہمارا موجودہ قانون ہر شخص کو اجازت دیتا ہے کہ وہ جو جی چاہے کہے۔ لکھے اور شائع کرے۔ لیکن اگر وہ اس آزادی کا بے جا استعمال کرے تو موجب سزا ہوگا۔ اگر وہ کسی شخص پر بے جا حملہ کرے تو دوسرا شخص نقصان کا دعوے کرسکتا ہے۔ اگر کوئی شخص ایسی چیز لکھے اور شائع کرے جس سے بداخلاقی پیدا ہو یا بغاوت پھیلے تو بداخلاقی اور بغاوت کے جرم میں سزایاب ہوسکتا ہے " اسی آزادی کی اہمیت کے تحت میں بعض ایسے مستثنیات ہیں جن کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوسکتی۔ مثلاً پارلیمنٹ میں جو کچھ کہا جائے یا عدالتی کارروائیاں یا وہ خطوط وغیرہ جو درمیان وزرا کے یا وزرا اور بادشاہ کے ہوں یا وہ کاغذات جو پارلیمنٹ کے حکم سے شائع کئے جاویں یا صحیح رپورٹ عدالتی کارروائی کی لیکن ان مستثنیات کے قائم کرنے میں بھی لوگوں کے حقوق کے لحاظ سے چند بندشیں رکھی گئی ہیں۔ مثلاً جہاں پارلیمنٹ کی تقریر کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جاسکتی وہیں اس تقریر کی اشاعت پر قانونی کارروائی کی جاسکتی ہے۔ یا مثلاً بغاوت کا قانون تو یہ کہتا ہے کہ جو شخص ایسے الفاظ استعمال کرے۔ جس سے بادشاہ کی توہین ہو یا اس کے خلاف تنفر پیدا کرے یا کسی قسم کی شورش برپا کرے تو وہ سزایاب ہوگا لیکن عام طور پر مقدمہ اس وقت تک نہیں چلایا جاتا جب تک کہ نقص امن کا بے حد خطرہ نہ ہو دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ (Bacon) کے الفاظ کی اہمیت کو پورے طور پر محسوس کیا جارہا ہے کہ " ذہانت کو سزا دینا فی الحقیقت اس کی قوت اور تیزی کو بڑھاتا ہے اور ضبط شدہ تحریر کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں کچھ چنگاری سچ کی ضرور ہے جو اون کے چہرہ پر لگتی ہے جو اس کو دبانا چاہتے ہیں "

ماحصل یہ ہے کہ انگریزی آئین اپنی قوم کو نظم کے دائرہ میں رکھ کر اون کی روح کو تازگی بخشتا ہے۔ اون کے دماغ کو منور کرتا ہے۔ اور اون کے جسم کو قوت دیتا ہے۔ اوس کے ذریعہ سے اونھیں ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔ اور اون کے حقوق کا کامل تحفظ ہے

ایس۔ ان۔ جعفری

تاریخ ہند کا ایک ورق

بندھیلکھنڈ کا موتی

(دو ایکٹ کا مختصر ڈرامہ)

ایکٹ اوّل ـــــــ پہلا منظر

(تاریک رات ہے اور چمبل ندی چٹانوں اور سنگ ریزوں سے ٹکرا ٹکرا کر رات کی تاریکی کو اور بھی بھیانک بنا رہی ہے۔ ندی کے داہنی جانب ساحل پر ایک ٹیکرا ہے۔ جس پر ایک بہت پرانی گڑھی قائم ہے فصیلوں پر گھاس اور کائی سے ایک خاص کیفیت پیدا ہو گئی ہے جس کو دیکھ کر خواہ مخواہ ہیبت معلوم ہوتی ہے۔ اندر گڑھی کے ایک دالان میں سارندہ اور سیتلا دیوی بیٹھی چھوٹی باتیں کر رہی ہیں)

سیتلا دیوی۔ پورے تین برس ہو گئے کہ پران ناتھ کو چین سے بیٹھنے کو نہیں ملا، رام جانے وہ کون لوگ ہیں جنکے دن آرام سے کٹتے ہوں گے

سارندہ۔ (چونک کر) کیوں، سیتلا، کیا ہوا؟ کیا بھیّا کے راج میں تم کو سُکھ نہیں ملا

سیتلا دیوی۔ نہیں، ایشور نہ کرے کہ میں ایسی چنتا کروں پر نتو ـــــــ

سارندہ۔ بولو سیتلا بولو چھپانے کا کام نہیں تم راجپوتنی بھی ہو اور راجپوت کی بیوی بھی۔ تم کو کوئی بات چھپانا نہ چاہیئے

سیتلا دیوی۔ تم خفا ہو گی۔ اور سوامی بھی اگر سنیں گے تو خفا ہوں گے اس لئے اب نہ پوچھو، جانے دو

سارندہ۔ ٹالو نہیں، اب میں بغیر پوچھے نہ رہوں گا اور تمھیں بتانا پڑے گا

سیتلا دیوی۔ میں نے کتنی بار ان سے بنتی کی پاؤں پڑی کہ میری آنکھوں کے سامنے سے کہیں نہ جاؤ مجھے ہردوار لے چلو بندرابن لے چلو۔ اجودھیا کے درشن کرا لاؤ، رسی کیس، پریاگ بدری ناتھ لے چلو۔ اپنے ساتھ جنگل میں رکھو۔ مگر یہ بیوگ کسی طرح نہیں سہا جاتا کہ پہاڑوں وبیابانوں میں اپنی جان دیتے پھرو۔ پرنتو میں قسمت کی ہیٹی ہوں کہ میں کسی ہتیار سے سوامی کے دل پر قابو نہ پا سکی

سارندہ۔ (ندامت کر) کیا سیتلا دیوی تم چاہتی ہو کہ بھیّا جنیلو

کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگا دیں کیا تمہاری رنواس کی خاطر وہ اپنا نام میٹ دیں۔ کیا تم چاہتی ہو کہ وہ دشمنوں سے لڑنے کی جگہ تمہاری سیوا کے لئے محل میں بیٹھے رہیں ——

(غصہ سے) تم کو کیا معلوم کہ اس وقت کیا حال ہے، اور دشمنوں نے کیسا گھیر رکھا ہے۔ کیا تم چاہتی ہو کہ وہ چوڑیاں پہن کر بیٹھ جائے۔ یاد رکھنا سیتلا دیوی ایشور نہ کرے اگر دشمن جیت گئے تو تمہاری آج کی خیر نہیں ——"

(دروازہ کھلتا ہے اور ایک طویل القامت نوجوان اندر داخل ہوتا ہے)

سیتلا۔ (خوشی سے اچھل کر) سارن۔ لو وہ آگئے

سارن۔ (متفکرانہ انداز میں) بھیا۔ یہ کپڑے کیسے بھیگے ہیں؟ کیا پانی برسا ہے؟

انردھ۔ نہیں، ندی پار کر کے آیا ہوں

سیتلا۔ ایشور نے بڑی خیر کی آج کل ندی باڑھ پر ہے

سارن۔ ہتھیار کیا ہوئے؟

انردھ۔ چھن گئے!

سارن۔ اور ساتھی!

انردھ۔ کام آگئے!

سارن۔ (سیتلا کی طرف دیکھ کر) سیتلا، یہ سب تمہارے کارن ہوا۔ تم نے کنبہ کی ناک کٹوا دی۔ اب تو کلیجہ میں ٹھنڈک پڑی

انردھ۔ نہیں اس میں سیتلا کا قصور نہیں ہے۔ خود میں نے دھوکا کھایا

سارن۔ تو بھیا، شاباش ہے تم کو۔ کہ بزرگوں کی ناک کٹوا کر اپنی صورت دکھانے یہاں آئے ہو، ہاں جیوت تو باپ دادا کی آن کبھی نہیں کھوتے،

(انردھ کچھ دیر تک سوچتا رہتا ہے اور پھر باہر چلا جاتا ہے سیتلا پیچھے پیچھے جاتی ہے انردھ کو پکارتی ہے۔ لیکن انردھ فصیل کی دیوار پھاند کر رات کی تاریکی میں غائب ہو جاتا ہے۔ اور سیتلا چٹان پر بیٹھ کر رونے لگتی ہے)

سارن۔ سیتلا کہاں ہو

سیتلا۔ یہاں اپنی قسمت کو رو رہی ہوں

(سارن بھی جاتی ہے)

سارن۔ کیوں روتی ہو!

سیتلا۔ (ناگن کی طرح بل کھا کر) کیا باپ دادا کی آن اتنی پیاری ہے

سارن۔ (غصہ سے تیورا کر) ہاں، ہے

سیتلا۔ اپنا پتی ہوتا تو کلیجہ میں بٹھا لیتیں

سارن۔ کلیجہ میں۔ بالکل جھوٹ۔ تلوار چبھو دیتی

سیتلا۔ (غصہ سے) جھوٹ۔ ڈولی میں چھپاتی پھرو گی۔ خیر دیکھا جائے گا۔ کبھی کے دن بڑے کبھی کی رات!

دوسرا منظر

(سارندہ سیتلا دیوی آپس میں مصروف گفتگو ہیں)

سیتلا۔ آج پورے ۲ مہینے ہو گئے مگر کچھ خبر نہیں ملی

سارندھ۔ شیر کچھار میں ہو گا۔ خبر کیا ملتی

سیتلا۔ سارن۔ تم نے اُس رات بہت رولایا

سارن۔ لیکن بزرگوں کی آتماؤں کو خوش کیا

سیتلا۔ (چونک کر) سارن۔ یہ سنکھ کی آواز کہاں سے آ رہی ہے

سارن۔ (کان لگا کر) ہاں راجپوتی آن پر جان دینے والا

راجہ انرودھ سنگھ آگیا - مبارک ہو

سیتلا (فورِ مسرت سے) کہاں - کہاں

(آواز اور قریب ہوتی جاتی ہے)

سارن - ہتیرو! میرا دل بول رہا ہے کہ ہونہ ہو وہی ہیں

سیتلا - ایشور ایسا ہی کرے

(دروازہ کھلتا ہے اور انرودھ سنگھ داخل ہوتا ہے)

سیتلا - پران ناتھ ---------- (قدموں پر گر پڑتی ہے)

سارن - بھیّا - بھیا

انرودھ سنگھ - سارن میں مہرونی کا قلعہ فتح کرکے آرہا ہوں اور ساتھ ہی یہ بھی طے کر چکا ہوں کہ راجہ چمپت رائے بندیلہ کے ساتھ تمھارا بیاہ کر دیا جائے گا ----

منظر سوم

(رات کا وقت ہے رنواس میں روشنی ہو رہی ہے - رانی سیتلا دیوی اور مہاراجہ انرودھ سنگھ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں)

انرودھ سنگھ - رانی کچھ سنا

سیتلا - نہیں، کیا ہوا

انرودھ سنگھ - دیکھو یہ ایک پتر کسی کا آیا ہے جس میں لکھا ہے کہ راجہ چمپت رائے بندیلہ راجپوت نہیں ہے

سیتلا - کیا یہ صحیح ہے

انرودھ سنگھ - بالکل جھوٹ - میں خوب جانتا ہوں وہ راجہ پورن چند کے راجکمار ہیں - اور پورن چند راجہ اودیا جیت سنگھ کے پُتر تھے - جو راجہ پنچم اور وہ بیر بھدر کے خاندان سے تھے - بھلا میں نے جو بات طے کی تھی وہ جھوٹ ہو سکتی ہے

سیتلا - پھر کب تک اس کو ٹالئے گا - بیاہ ہو جائے تو اچھا ہے

انرودھ سنگھ - ہاں ارادہ ہے کہ اگلے مہینہ میں فارغ ہو جاؤں کیونکہ خبر آئی ہے کہ محی الدین اورنگ زیب اس طرف سے گزریں گے اور عجب نہیں کہ ولیعہد بہادر کے خلاف جنگ مقصود ہو - اور پھر میں جنگ میں پھنس جاؤں اور یہ کام رہ جائے

سیتلا - سوامی کیا لڑائی آپ ہی کے لئے بنائی گئی ہے

انرودھ سنگھ - ہاں رانی راجپوت کے گھر میں پیدا ہونے کا یہی سبھاؤ ہے

منظر چہارم

(دربار آراستہ ہے درمیان میں آگ جل رہی ہے پروہت ہون کر رہا ہے ---- ہون کے ختم پر بندیلہ راج کا قومی ترانہ گایا جاتا ہے - اور راجہ چمپت رائے کا بیاہ راجکماری سارندہ سے ہوتا ہے)

انرودھ سنگھ - پروہت اب تم بھونری پھیرو

پروہت - جو حکم

(پروہت بھونری پھیرتا ہے)

درباری - راجہ چمپت رائے، مبارک

انرودھ سنگھ - چمپت رائے - میں بھی تم کو مبارکباد دیتا ہوں لیکن اسی ملک میں چاروں طرف جنگ کا دیوتا سنکھ پھونک رہا ہے کہیں تم اس شادی کے بعد عیش و عشرت میں نہ پڑ جانا، لو یہ بیش قیمت خنجر جو شہنشاہ اکبر نے میرے بزرگوں کو عطا کیا تھا - وہ تم اپنی کمر سے باندھو لیکن اس خنجر کو لے کر قسم کھاؤ کہ تم حق کے لئے جان دینے سے دریغ نہ کروگے - یاد رکھو بندیلکھنڈ کے پاس بہادر بیٹوں کی بہت کمی ہے - اس لئے اس مبارک خنجر کی عزت د

حرمت اب تمہارے ہاتھ ہے

درباری - جے - مہاراج اندر دھ سنگھ کی جے - بندیلہ راج کا بول بالا ہو

راجہ چمپت رائے - (خنجر کو چوم کر) میں بزدل نہیں ہوں یقین رکھئے - چمپت رائے کے رگوں میں بندیلہ خون دوڑ رہا ہے - اگر میں بندیلہ وقار کو گرانے کی کوشش کروں گا تو سب سے پہلے یہ خنجر میرے قلب میں لہرائے گا ——

درباری - جے ہو - راجہ اور چھا کی جے ہو

پروہت - راجہ چمپت رائے اس مقدس اگنی کو دیکھو

چمپت رائے - دیکھ رہا ہوں

پروہت - خنجر کو چومو

چمپت رائے - خنجر کو میان سے باہر نکلتا ہے اور چومتا ہے

پروہت - کہو میں راجپوتوں کی سبھا میں اقرار کرتا ہوں کہ جب تک بندیلہ راج کی گذشتہ شان و شوکت واپس نہیں آئے گی - اس وقت تک قلعہ اورچھا پر آزادی کا پرچم نہیں لہرائے گا - جب تک کمزور استریاں بندیلہ راجدھانی میں ایک کونہ سے دوسرے کونہ تک بے کھٹکے نہ چلی جائیں گی ——— تم چین سے نہ بیٹھوگے کیا یہ پرتگیا کرتے ہو

چمپت رائے - (تلوار سے قسم کھاکر) ایسا ہی ہوگا

اندر دھ سنگھ - اچھا اب آپ سارن کو لے کر اورچھا سدھاریئے سب انتظام مکمل ہے (بے تاب ہوکر رونے لگتا ہے)

درباری - مہاراج - آنسو بہانا آپ کے لئے مناسب نہیں ہے (سنگھ پھونک رہا ہے - سارن اورچھا روانہ ہوتی ہے)

اندر دھ سنگھ - کیا مجکو اپنی سب سے پیاری بہن سے ہمیشہ کے لئے چھٹنے کے بعد آنسو بہانے کا حق حاصل نہیں ہے؟

درباری - مہارانا - اسی لئے تو کنیا کا دان بڑا ہوتا ہے صبر کیجئے ورنہ راجکماری سارن کو ڈولہ میں قرار نہ آئے گا

(اندر دھ سنگھ نڈھال ہوکر تخت پر گر پڑتا ہے)

منظر پنجم

(دربار عام میں چمپت رائے تقریر کرتا ہے)

چمپت رائے - درباریو - آج تم سے رخصت ہوتا ہوں اور اپنا تاج و تخت اپنی خوشی سے اپنے قوت بازو پہاڑ سنگھ کے سپرد کرتا ہوں - تم کو معلوم ہے کہ میں نے تخت نشین ہوتے ہی سلاطین مغلیہ کو خراج دینا بند کر دیا تھا - لیکن اب میں مصلحتاً اطاعت کرنا چاہتا ہوں - میں اپنی فوج کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جس نے میرے اشاروں پر اپنے گھر بار کو چھوڑا - اور ہتیلی پر جان لے کر میرے احکام بجا لائے ——— اچھا اب میں رخصت ہوتا ہوں ——— پہاڑ سنگھ اورچھا کی راجدھانی پر تم کو براجمان ہونا - مبارک

(درباری رونے لگتے ہیں - اور رانی سارندہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ داخل ہوتی ہے)

عورتیں - مہارانی ہم کو چھوڑ کر کہاں چلیں

رانی - سوامی کی اچھا سب سے مقدم ہے

پہاڑ سنگھ - اچھا اس شرط پر میں سنگھاسن پر بیٹھوں گا کہ جب آپ اورچھا واپس تشریف لائیں تو سنگھاسن آپ ہی کا ہے -

درباری - ہاں ضرور شاباشس بہادر سنگھ - بندیلہ راجکماروں کا یہی طریقہ ہے

چمپت رائے - اچھا رخصت

(سارندہ اور چمپت رائے جاتے ہیں)

منظر ششم

(نظام الدین کا شکستہ قلعہ)

چمپت رائے - جگمل سنگھ - رانی سارن

چمپت رائے - جگمل سنگھ کیسے آئے

جگمل سنگھ - مہاراج - اشیرباد دینے آیا ہوں

چمپت رائے - سب پرماتما کا احسان ہے

جگمل سنگھ - اعلیحضرت نے بہت خوشی کا اظہار کرکے آپ کو کالپی کی بیش قیمت جاگیر عنایت کی ہے - اس سے زیادہ احسان پرماتما کا کیا ہو سکتا ہے ؟

چمپت رائے - ہاں یہ تو ٹھیک ہے لیکن آثار اچھے نظر نہیں آتے ہیں - بادشاہ سلامت کا اب آخری وقت ہے - بھائیوں میں رقابت ہے - اور میرا خیال ہے کہ شہنشاہ دہلی دکن میں ہے

جگمل سنگھ - اس بساط کے مہرہ سب خطرناک ہیں

چمپت رائے - ہاں - لیکن اقبال محی الدین ہی کے سر ہے

جگمل سنگھ - تو ہم لوگ کیا کریں

چمپت رائے - ہم تو تلوار کے دھنی ہیں - جو تلوار کہے گی وہی ہوگا - لیکن ہوگا بڑا برا - خون کی ندیاں بہیں گی

جگمل سنگھ - رام نہ کرے ——— (جاتا ہے)

(رانی سارن محل سرا میں بیٹھی ہوئی ہے - اور چمپت رائے داخل ہوتا ہے)

چمپت رائے - تم نے سنا - کالپی کی ایک نو لاکھ سالانہ کی جاگیر مجکو آج دربار میں عطا ہوئی ہے اب تو خوش ہو

سارن - پران ناتھ آپ کی عزت بڑھی میں بھی خوش ہوئی - ایشور آپ کو اس سے زیادہ عزت دے

چمپت رائے - سارن تم اُداس کیوں ہو - کہو کیا ہوا - تم جب سے آئی ہو کچھ کھوئی ہوئی سی رہتی ہو - بولو کیا بات ہے

سارن - پران ناتھ - یہ خیال غلط ہے

(رونے لگتی ہے)

چمپت رائے - کوئی بات ضرور ہے تم روتی کیوں ہو ؟ سچ کہو کیا بات ہے

سارن - (روتے ہوئے) آپ یہ نہ پوچھئے - اس کو ایسا ہی رہنے دیجئے - ہاں یہ سچ ہے کہ آج کل میں کچھ اُداس سی رہتی ہوں

چمپت رائے - (چیں بجبیں ہوکر) کیوں ؟ اورچھا میں کیا تھا جو یہاں دہلی میں نہیں ہے ؟

سارن - (ناگن کی طرح بل کھاکر) ہاں اورچھا میں رانی تھی دلی میں جاگیردار کی باندی ہوں ——— کوئی گھوڑے پر چڑھ کر گدھے پر نہیں بیٹھتا - سوامی آپ برا نہ مانیں آپ نے یہ آرام و چین بہت مہنگے داموں خریدا ہے

چمپت رائے - (ششدر ہوکر) میں تمہاری روحانی عظمت سے بے خبر تھا - آج آنکھیں کھل گئیں ایک پردہ تھا جو اٹھ گیا - (رونے لگتا ہے)

اچھا سارن چمپت رائے بندیلہ راجہ ہے اور راتوں رات دہلی کو چھوڑ دے گا - اب ———

سارن - سوامی - ٹھیرئے کوئی پرتگیا نہ کیجئے - دربار شاہی

ست اجازت لے کر آپ اوچھا جانے کا ارادہ کریں۔
راجپوت پیٹھ دکھا کر نہیں بھاگتا ہے

چمپت رائے۔ مناسب ہے۔ آج دربار میں تذکرہ کروں گا

منظر ہفتم

(راجہ چمپت رائے دربار سے اجازت لے کر اوچھا واپس آگیا ہے۔ اور سارا بند میل کھنڈ اس خوشی سے نہال ہو گیا ہے۔ رانی سارندہ بھی بہت خوش ہے۔ اسی عرصہ میں شاہجہاں بیمار پڑا ہے۔ شہزادوں میں پہلے ہی سے رقیبانہ جنگ تھی۔ اس خبر کے ساتھ ہی دلوں کا غبار ظاہر ہو گیا۔ مُراد و محی الدین دکن سے چل کھڑے ہوئے۔ برسات کا موسم ہے دھول پور کے قریب چمبل ندی کے کنارہ خونریز جنگ نے محی الدین کو مجبور کیا ہے۔ کہ وہ چمپت رائے سے مدد طلب کرے)

راجہ چمپت رائے۔ خان صاحب۔ میں مدد کرنے کو طیار تو ہوں لیکن ولیعہد کے خلاف ہوگا

سفیر۔ مہاراجہ اس وقت تو آپ کو شہزادہ محی الدین کی امداد کرنا پڑے گی۔ آپ کو معلوم ہے شہزادہ کو بڑی تشویش ہے عین دریائے چمبل کے کنارہ شاہی فوج پرے جمائے کھڑی ہے اس حالت میں تو آپ کو مدد کرنا ہی چاہیئے

(چمپت رائے کچھ علٰحدہ گفتگو کرتا ہے)

سفیر۔ مہاراجہ آپ پر بڑا بھروسہ ہے۔ آپ کی امداد انشاءاللہ رائگاں نہ جائے گی۔ اور اس کے علاوہ الطاف خسروانہ سے بھی آپ محروم نہ رہیں گے

مہاراجہ۔ خانصاحب آپکا فرمانا بالکل صحیح ہے لیکن یہ مُعاملہ ملکی حیثیت سے بھی اہم ہے میں اس معاملہ میں ذرا ذمہ دار عہدہ داروں اور فوجی افسروں سے بھی مشورہ کرلوں۔ اوس کے بعد آپ کو شام تک اطلاع دیدوں گا

(خانصاحب جاتے ہیں)

(پردہ بدلتا ہے)

(رانی سارن ایک کتاب دیکھ رہی ہے)

چمپت رائے۔ سارن، شہزادہ محی الدین کا پیام آیا ہے کہ داراشکوہ کے خلاف تلوار اٹھاؤں تمھاری کیا رائے ہے۔ گو میں جانتا ہوں کہ اس بار میں محی الدین ہی ایک سچا موتی ہے اور باقی سب جھوٹے ہیں۔ فتح دیکھنا محی الدین ہی کی ہاتھ رہے گی ــ خون بہت بہیگا

سارن۔ آپ کو محی الدین کی مدد کرنا چاہیئے

چمپت رائے۔ خوب سوچ لو۔ داراشکوہ سے عداوت مول لینا ہے

سارن۔ اچھا میں بھاگوت میں سری کرشن جی سے مشورہ مانگتی ہوں

(بھاگوت بند کرکے سری کشن جی کا دھیان کرکے بھاگوت کھولتی ہے)

دیکھئے۔ پہلے ادھیا کے اشلوک ۲۸۔۳۱۔۳۲ میں سری کشن جی فرماتے ہیں کہ" اے کرشن مجھے اپنے قریبی رشتہ داروں کو دیکھ کر جو جنگ کے لئے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں بھلائی نظر نہیں آتی کیونکہ اپنے رشتہ داروں کو مار کر نہ مجھے کامیابی اور نہ سلطنت اور نہ راحت کی خواہش ہے" اے ارجن مخنثوں کا طریقہ اختیار نہ کر تیرے لئے یہ زیبا نہیں اے دشمنوں پر فتح پانیوالے بزدلی اور پست ہمتی کو چھوڑ کر کھڑا ہو۔" اے ارجن جو سوچنے کی بات نہیں اوس کو سوچتے ہو اور اہل علم کی باتیں کرتے ہو حالانکہ اہل علم کسی شخص کی موت یا زندگی کی فکر نہیں کرتے " اے ارجن اگر تو جنگ میں کام آیگا

تو سورگ میں جائے گا اور اگر فتح پائے گا تو تجھے روئے زمین کی بادشاہت ملے گی۔ اس لئے اے کنتی کے لڑکے جنگ کی ٹھان کر اٹھ

"تمھارا ادھکار افعال تک ہی محدود ہے نہ کہ اُن کے ثمرات پر نتائج کی غرض سے افعال عمل میں نہ لا البتہ افعال کے ترک سے بچ"

سوامی۔ اب کیا ہے۔ دیکھئے سری کشن جی نے صاف صاف بتلا دیا کہ

راجہ چمپت رائے۔ ٹھیک ہے۔ لیکن یہ معاملہ بڑا مشکل ہے

سارن۔ پران ناتھ۔ "میں واقف ہوں۔ منزل کٹھن ہے۔ قدم قدم پر کانٹے ہیں۔ ہمیں اپنے سپاہیوں کا خون پانی کی طرح بہانا پڑے گا۔ ہم اپنا خون پانی ایک کریں گے اپنے بچیلے بہادروں کا سر کٹوائیں گے۔ اور چنبل ندی کا گھاٹ بنائیں گے۔ لیکن سوامی یاد رکھنا جب تک چنبل کا دھارا جلال و عفت کے ساتھ اپنے مُنھ کا پھین اُگلتا ہے گا تو ہمارے سرفروشوں کا خون لعل بن بن کر روشن رہیگا۔ اور جب تک بندیلہ قوم کا نام لیوا دنیا میں باقی رہے یہ خون اوس کے ماتھے پر کیسر بن کر چمکے گا"

چمپت رائے۔ اچھا پیاری سارن ابھی شہزادہ محی الدین کو جواب بھیجے دیتا ہوں

(جاتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

منظر ہشتم

(برسات کا زمانہ ہے۔ آسمان پر بادل ہی بادل نظر آ رہے ہیں فضا سے سرفروش بندیلوں کی کالی گھٹا اٹھتی ہے۔ اور چنبل ندی پر چھا جاتی ہے ہر سپاہی "بیر رس" سے جھوم رہا ہے۔ رانی سارن اپنے دونوں راجکماروں کو گلے سے لگاتی ہے اور راجہ چمپت رائے کو پان کا بیڑہ دیتی ہے ہتیار سجتی ہے اور دستار پر کلغی مرصع لگاتی ہے)

رانی سارن۔ راجکمارو، اب بندیلہ قوم کی لاج تمھارے ہی ہاتھ ہے دیکھنا لڑائی سے منھ موڑ کر نہ آنا۔ بندیلہ قوم کے وقار کو قائم رکھنا۔ کوئی بچہ بوڑھا یا عورت سامنے آئے تو تلوار کو اس بے گناہ خون سے آلودہ نہ کرنا۔ جاؤ راجکمارو جاؤ ـــــــ دیر ہوتی ہے۔ شہزادہ محی الدین کو تم لوگوں کی ضرورت ہے ـــــــ اور تمھارے پتا زبان دے چکے ہیں۔ دیکھو کہیں اون کو شرمندگی نہ ہو

دونوں راجکمار۔ ماتا جی۔ جیسی آپ کی اگیان ہوگی ویسا ہی ہوگا

(رانی سارن دونوں کو گلے لگاتی ہے)

(راجکمار جاتے ہیں)

راجہ چمپت رائے۔ سارن۔ راجکماروں کو رخصت کر دیا تمھاری ہمت کی داد دینا چاہیئے

رانی سارن۔ ایشور کی سہایتہ چاہیئے ورنہ میں ایک کمزور عورت کیا کر سکتی تھی وہی صبر دیتا ہے۔ میں نے کیا کیا وہ امانت قوم ہی کی تھی۔ اوس کے دینے میں مجھکو کیا عذر ہوتا

چمپت رائے۔ سارن (ہاتھ لے کر) پیاری سارن یہ ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ معاف کرنا میں بھی جانتا ہوں ـــــ زندہ بچے تو ملاقات ہوگی

لیجئے بیڑا لیجئے۔ لائیے ہتیار بھی سج دوں اور دستار

کلغی بھی لگادی ہے۔ اچھا سوامی رُخصت - الیشور تمھاری تلواروں کو اندر کا بجرا بنادے - بندیلوں کی لاج تمھارے ہاتھ ہے

چمپت رائے۔ پان کھاکر۔ رُخصت۔ آج تو خوشی سے تمھارا ایک ایک عضو۔ پھڑک رہا ہے۔ ایک راجپوتنی کا یہی وصف ہے

(جاتا ہے)

(منظر بدلتا ہے)

(رانی سارن فوج کے ایک حصّہ کو طلب کرتی ہے)

سارن۔ کوشلیا۔ استری پلٹن کو لیس ہونے کا حکم دو۔ میں دو گھنٹہ بعد مردانہ بھیس میں پچھم جانب سے چمبل ندی کے دشمنوں پر حملہ کروں گی۔ سب تیار رہیں ——

کوشلیا۔ رانی۔ ایسا ہی ہوگا

(کوشلیا جاتی ہے)

منظر نہم

(میدان جنگ - راجہ چمپت رائے نے بندیلوں کو کمیں گاہ میں چھپنے کا حکم دے دیا۔ شہزادہ محی الدین و مراد کی منتشر فوج کو منظم کیا دارا شکوہ کو دھوکہ ہوا۔ بندیلہ اپنی کمیں گاہوں سے نکل پڑے اور دریا میں گھوڑے ڈال دیے۔ چمپت رائے دارا شکوہ کی فوج کو دھوکہ دیکر دریا کے اس پار جاتا ہے۔ محی الدین کی فوج کی ہمتیں بندھ گئیں دست بدست جنگ کی نوبت آئی کہ ایک جتھا سپاہیوں کا پچھم جانب سے نمودار ہوا۔ یہ سارندھا تھی)

راجہ چمپت رائے۔ چھتر سال۔ تم مشرقی جانب اپنی فوج لیجاؤ۔ اور کمیں گاہوں میں چھپ جاؤ

(چھتر سال چلا جاتا ہے)

چمپت رائے۔ اندرجیت۔ تم اتر جانب اپنی فوج لے جاؤ اور کمیں گاہ میں چھپ جاؤ

(اندرجیت چلا جاتا ہے)

(شہزادہ محی الدین و شہزادہ مراد خیر مقدم کرتے ہیں)

محی الدین۔ راجہ چمپت رائے۔ آپ کی اس مہربانی کا شکریہ تو ادا کرنا فضول ہے۔ کیونکہ شکریہ ادا کرکے آپ کے قومی وقار کو ٹھیس لگے گی۔ ہاں خدا کا شکر یہ ضرور ادا کرنا چاہیئے

مُراد۔ مہاراجہ اُرچھا کو ان کی خدمات کا خاطر خواہ صلہ ملیگا

محی الدین۔ یہ قبل از وقت گفتگو ہے۔ جو خدا کی مرضی ہو

چمپت رائے۔ شہزادہ صاحب یہ سچ ہے جو خدا کی مرضی ہے وہی سب سے بہتر ہے۔ میری رائے ناقص میں فوج کی تنظیم کرنا ضروری ہے

محی الدین۔ ہاں ضرور۔ آپ نے اس فوج کے کے حصّہ کیئے ہیں

چمپت رائے۔ تین حصّہ ایک حصّہ میرے تحت میں ہے دو حصّہ خادم زادوں کی تحت میں مشرق و شمال کی کمیں گاہوں میں ہیں۔ وہ دیکھئے شہزادہ دارہ شکوہ مورچہ ہٹا رہے ہیں۔ اون کو دھوکہ ہوگیا بس اب وقت ضائع نہیں ہونا چاہیئے گھوڑے دریا میں ڈال دینا چاہیئے

محی الدین (بسم اللہ کہکر) گھوڑے کو ایڑ لگاتا ہے

(اللہ اکبر کی پُرہیبت تکبیر سے ارض بندیلہ گونج اٹھتی ہے)

چمپت رائے۔ اس سات گھنٹہ کی نقل و حرکت میں... بندیلہ جانبازوں کی لاشیں پھڑک رہی ہیں۔ شکر ہے کہ میری بات خالی نہیں گئی

محی الدین۔ چمپت رائے دیکھنا وہ افق مغرب پر کیا غبار

دکھائی پڑ رہا ہے

جمپت رائے۔ دیکھئے ابھی معلوم ہوا جاتا ہے

(سپاہیوں کا ایک دل دارا شکوہ پر حملہ آور ہوا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی فرشتہ رحمت آپکی امداد کے لئے آسمان سے اترا ہے)

(گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے)

جمپت رائے۔ فتح۔ مبارک

محی الدین۔ خدا کا شکر ہے کہ اوسنے حق و باطل کا فرق دکھا دیا

(ایک سردار آتا ہے)

جمپت رائے۔ کیا ہے ——

سردار۔ ہنس کر۔ بندیلہ قوم کا راج مبارک۔ اس جان نثار کو بھول گئے ——

جمپت رائے۔ میری سارن ——

سارن۔ (سر تعظیم خم ہوکر) سوامی

(پردہ گرتا ہے)

ایکٹ دوسرا

پردۂ اوّل

(شہزادہ محی الدین چنبل کے ساحل سے آگرہ کی طرف چلا۔ اقبال اس کے سر پر مورچھل ہلاتا تھا اور نصرت دکامرانی نقارہ بجاتی تھی۔ آگرہ پہنچتا ہے تو شوکت اوس کے لئے تخت شاہی کو سجاتی ہے۔ دربار ہوتا ہے سرداران شاہی کی خطائیں معاف ہوتی ہیں مناصب بحال کئے جاتے ہیں راجہ جمپت رائے کو اوس کی سرفروشانہ خدمات جلیلہ کے صلہ میں دوازدہ ہزاری کا منصب عطا ہوتا ہے اور اورچھا سے بنارس تک کی جاگیر عطا ہوتی ہے اور بندیلہ راجہ پھر دہلی میں قیام کرتا ہے۔ اور رانی سارندھا پھر خوش و خرم ہے)

جمپت رائے۔ جگمل سنگھ۔ کنور چھتر سال۔ سارن

(جمپت رائے دربار سے خلعت پاکر آتا ہے)

کنور چھتر سال۔ پتاجی مبارک

سارن۔ کیسی مبارکباد

چھتر سال۔ شہنشاہ اورنگ زیب نے آج دربار عام میں پتاجی کو بندیلہ راج کی جانبازانہ خدمات و "سرفروشیوں" کے صلہ میں اورچھا سے بنارس تک کی جاگیر اور دوازدہ ہزاری منصب مع خلعت ہفت پارچہ عطا کیا ہے

سارن۔ ہاں۔ سوامی

جمپت رائے۔ سارن۔ دیکھو یہ تلوار خاص شہنشاہ اورنگ زیب نے اپنے اسلحہ خانہ کی عطا کی ہے۔ اس تلوار کو شہنشاہ جہانگیر نے لاہور کے معرکہ میں استعمال کیا تھا۔ اصفہانی تلوار ہے

سارن۔ سوامی آپ کو مبارک ہو۔ دشمنوں کے حسد سے پرماتما آپ کو محفوظ رکھے

جمپت رائے۔ سارن تمھاری خوشی میری تمام کلفتوں کیلئے کافی ہے

سارن۔ سوامی ——

(جگمل سنگھ آتا ہے اور کنور چھتر سال اور رانی سارن جاتے ہیں)

جمپت رائے۔ کہو جگمل کیا سماچار ہیں!

جگمل۔ اشیرباد دینے آیا ہوں۔ بہت سے راجپوت آپ کی اس عزت کو دیکھ کر بھسم ہو گئے

جمپت رائے۔ کون

جگمل۔ نام لینے سے کیا فائدہ۔ کوئی گھوڑا آپ کے اصطبل میں

ولی بہادر خاں کا ہے ؟

چمپت رائے۔ ہاں۔ کیوں

جگمل سنگھ۔ ولی بہادر خاں کو اوس کی بڑی فکر ہے کسی مناسب موقع سے اوس کو واپس کر دیجئے گا

چمپت رائے۔ لیکن وہ تو میدان جنگ میں گرفتار ہوا ہے۔ ولی بہادر خاں زخمی پڑا ہوا تھا۔ اور یہ گھوڑا اپنی دُم سے مکھیاں اُڑا رہا تھا مجکو پسند آیا میں نے منع کیا کہ کوئی شخص اس کو جان سے نہ مارے زندہ گرفتار کرے۔ لیکن رانی اُرچھا نے اوس کو زندہ گرفتار کیا ہے ——

جگمل۔ ہاں ولی بہادر خاں کو وہ بہت عزیز ہے اور شاید وہ اوس کی طلبی کی درخواست دینے والے ہیں ——

چنپت رائے۔ اچھا دیکھا جائے گا۔ (متفکر ہو کر)

(جگمل جاتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

منظر دوم

(دلی میں رہتے سال بھر ہوا تھا۔ کہ ایک دن کنور چھتر سال گھوڑے پر سوار ہو کر سیر کو گیا۔ اور ولی بہادر خاں کے محل کی طرف سے جا نکلا۔ راجکمار تنہا تھا ولی بہادر خاں کے آدمی وقت کے منتظر تھے گھوڑا چھین لیا۔)

(کنور چھتر سال مغموم داخل ہوتا ہے)

سارن۔ کیوں خیریت ہے

کنور چھتر سال۔ گھوڑا ولی بہادر خاں کے آدمیوں نے چھین لیا !

سارن۔ (غصہ سے چہرہ تمتا اٹھا) کچھ فکر کی بات نہیں گھوڑا گیا بلا سے گیا۔ لیکن دُکھ یہ ہے کہ تو اوسے زندہ کھو کر کیسے لوٹا۔ ؟ کیا تیری رگوں میں بندیلہ خون نہیں ہے ؟ تجکو ثابت کر دینا چاہیئے تھا کہ بندیل راجکمار سے گھوڑا چھین لینا کوئی ہنسی ٹھٹھا نہیں ہے ——"

(غصہ سے) جاؤ کوشلیا استری پلٹن کو لیس ہونے کا حکم دو۔ (کوشلیا جاتی ہے)

چھتر سال تم اور تمھارے پتا دونوں اب شاہی غلام ہو گئے ہیں۔ تم لوگ اب داد عیش دو۔ اور میں ابھی اپنی استری پلٹن کی مدد سے گھوڑا لاتی ہوں — چاہے انجام کچھ ہی ہو

(جاتی ہے)

(سپاہیانہ باناسجا کر اور استری پلٹن کو لے کر خانصاحب کے اصطبل سے زبردستی گھوڑا کھولتی ہے۔ جنگ کی نوبت آتی ہے مگر بندیلہ خواتین کے سامنے کسی کی پیش نہیں جاتی ہے)

چھتر سال۔ راج ماتا۔ آپ آگئیں (قدم چومتا ہے)

سارن۔ لو۔ یہ تمہارا گھوڑا ہے

(گھوڑا سارن کی گود میں اپنا سر ڈال دیتا ہے اور اوس کی آنکھوں سے آنسو کی دھار بہنے لگی)

اے بے زبان گھوڑے تو کیوں رو رہا ہے۔ لا تیرے آنسو پونچھ دوں

(گھوڑا سر جھکا دیتا ہے)

(چنپت رائے داخل ہوتا ہے)

چھتر سال۔ پتاجی۔ دیکھئے راج ماتا نے کمال کر دیا

چنپت رائے۔ کمال کر دیا ——

سارن۔ سوامی آپ متفکر کیوں ہیں

چنپت رائے۔ کاش یہ گھوڑا مجکو نہ دکھائی دیتا۔ یہ گھوڑا میرے اعزاز کے لئے آہوئے زرنگار ثابت ہوا۔ سنیئاجی

ہرن دیکھا۔ ہرن ہوئیں۔ میں نے گھوڑا دیکھا ... ہرن ہوا

چھترسال۔ (متحیر ہوکر) کیا قصہ ہے

چنپت رائے۔ رانی سارن گھوڑا کھول لائیں۔ اور ادھر عالمگیر کو پرچہ لگا اور ان کو رانی کی یہ جرأت ایک منصب دار کے خلاف ناگوار ہوئی اور گھوڑے کی واپسی کا حکم آیا ہے اور اوسی کے ساتھ منصب و جاگیر بھی اس گھوڑے کی نذر ہوگیا۔ ولی بہادر خاں پہلے ہی سے مجھ سے جلتے تھے۔ اور بہت سے راجپوت بھی اس سازش میں شریک ہیں

چھترسال۔ گھوڑا واپس کردیا جائے

رانی سارن۔ نہیں میری لاش جب اٹھیگی اوس وقت یہ گھوڑا جاسکے گا

چنپت رائے۔ رانی تمہاری منہ سے یہ ہوا ـــــ گھوڑا تو جائے گا

رانی سارن۔ سوامی۔ جب آپ ہی یوں کہتے ہیں تو بیشک چلا جائے گا (رونے لگتی ہے)

منظر سوم

(راجہ چنپت رائے قلعہ میں مقیم ہیں۔ منصب و جاگیر جانے کا قلق ہے لیکن رانی سارندہ کی وجہ سے شکایت نہیں کرتے۔ عالمگیر نے اطمینان ہونے کے بعد چنپت رائے کی جانب توجہ کی راجہ سبھ کرن بندیلہ نے راجہ چنپت رائے کو خاک میں ملانے کی قسم کھائی۔ بندیلہ سردار راجہ چنپت رائے سے منحرف ہوکر شاہی فوج میں شامل ہوگئے۔ قرب و جوار کے بندیلہ راجاؤں نے بھی رفاقت سے منہ موڑا۔ چنپت رائے نے بھی آوارہ گردی شروع کی۔ رانی سارندہ اور انکا چھترسال ہمراہ راجہ کے ساتھ سائے کی طرح تھے۔ شاہی فوج نے مقابلے سے عاجز آکر عالمگیر کو اطلاع کی کہ راجہ کو گرفتار کرنا مشکل ہے۔ چنانچہ محاصرہ اٹھالیا گیا۔ راجہ چیرچہ قلعہ میں واپس آگئے لیکن چند ہی ماہ کے بعد آوارہ دخشت ہونا پڑا۔ اس وقت میں ہفتوں سے شاہی فوج اور جاگا محاصرہ کئے ہوئے ہے اور راجہ چنپت رائے بخار میں مبتلا ہیں)

چنپت رائے۔ (آنکھ کھول کر) سارن کیا سماچار ہے؟

سارن۔ فصیلوں کو گولوں نے چھلنی کردیا ہے۔ بیس ہزار جانیں قلعہ میں بند ہیں۔ جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں۔ مردوں کی تعداد روز بروز گھٹ رہی ہے۔ رسد بند ہے۔ باہر سے آمد و رفت بالکل ختم ہوگئی ہے۔ استریاں اپنے بالکوں اور سوامیوں کو زندہ رکھنے کے لئے فاقہ کررہی ہیں۔ استریاں سورج دیوتا کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر کوس رہی ہیں۔ سب سے بڑھ کر آپ کی بیماری نے قلعہ میں کہرام مچا دیا ہے

راجہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ سارن آج دشمن ضرور قلعہ کے اندر گھس آئیں گے

سارن۔ ایشور نہ کرے کہ یہ دن دیکھنا پڑے

راجہ۔ ان قلعہ والوں کا کیا حال ہوگا؟

سارن۔ ہم لوگ قلعہ چھوڑکر چلے جائیں تو کیا ہو؟

راجہ۔ کیا ان بدنصیبوں کو اپنی زندگی پر نفرت کرنے کے لئے

سارن۔ نہیں شاید دشمن ان پر رحم کریں۔ دشمنی تو ہم سے ہے نہ کہ ان سے

راجہ۔ نہیں یہ تو مشکل ہے۔ ہم سے نہیں ہوسکتا ہے کہ اپنی بلا ان غریبوں کے لئے چھوڑ جائیں ـــــ عورتوں و بالکوں کو میں کسی طرح بھی چھوڑ نہیں سکتا

سارن۔ مگر یہاں رہنے سے ہم کیا کرسکتے ہیں

راجہ - مر تو سکتے ہیں؟ قید کی مصیبتیں سہوں گا لیکن قلعہ میں رہوں گا

سارن - پران ناتھ - آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر شرمندگی ہوئی کہ ایسی بات کیوں کی - (کچھ سوچ کر) اچھا اگر آپ کو یقین ہو جائے کہ ان کے ساتھ کوئی ظلم نہ ہوگا تو آپ چل سکتے ہیں؟

راجہ - (بہت غور کرنے کے بعد) یقین کیسے ہو؟

سارن - شاہی سپہ سالار کی تحریر!

راجہ - ہاں - اس شرط سے کہ یہ لوگ بھی ہم کو رخصت کر دیں

(سارن جاتی ہے)

منظر چہارم

سارن - کنور میں نے تم کو اس لئے بلایا ہے کہ تم کو میں بندیلہ راج کی آن پر بھینٹ چڑھا دوں

چھترسال - ماتا جی جو اگیان ہو میں تیار ہوں

رانی سارن - آج لڑائی کی کیا کیفیت ہے

چھترسال - اب تک پچاس آدمی مر چکے ہیں

رانی سارن - بندیلہ کی لاج اب ایشور کے ہاتھ ہے - اچھا یہ کام کس کے سپرد کیا جائے

چھترسال - میرے

رانی - پورا کرو گے

چھترسال - ہاں یقین تو ہے - اچھا ماتا جی رخصت

رانی - (سینہ سے لگا کر) ایشور تمہاری صورت جلد دکھائے

(روتی ہے)

(چھترسال جاتا ہے)

(منظر بدلتا ہے)

رانی سارندہ - جیون ناتھ - آپ نے جو وعدہ کیا تھا اس کو پورا کیجئے

راجہ - تم نے وعدہ پورا کیا؟

رانی سارن - تحریری معاہدہ حاضر ہے جو آج تیر میں باندھ کر کنور چھترسال نے بھیجا ہے

راجہ - ہاں اب میں چلوں گا - اور ایشور نے چاہا تو ایک بار پھر ان دشمنوں کے خون سے اپنی تلوار کی پیاس بجھاؤں گا مگر سارن سچ بتانا اس کاغذ کا کیا مول ہے؟

سارن - (آبدیدہ ہو کر) ایک جوان بیٹا - کاغذ کے ایک پرزے کی اس قدر گراں قیمت کس نے ادا کی ہوگی

راجہ - (شکستہ ہو گیا) چیخ کر کون

سارن - کنور چھترسال

راجہ —— ہائے —— (بیہوش ہو کر گر پڑتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

منظر پنجم

(راجہ چمپت رائے - صاحب فراش ہے - تاریک رات میں پالکی میں بیٹھ کر قلعہ والوں کو اپنی قسمت پر رونے کے لئے قلعہ کی زمین دوز راستہ سے اور جا سے ۵ میل آگے نکل چکا تھا - رانی سارندھا سپاہیانہ لباس پہنے - گھوڑے پر سوار تھی - راجہ پالکی میں بے سدھ تھا - اور کہار پسینہ میں شرابور تشنگی سے قافلہ کا برا حال تھا - پانچ سوار پالکی کے ساتھ تھے - کہ دفعتاً شاہی فوج آگئی اور پالکی سارندھا کے حکم سے روک لی گئی)

سارندھا - سوارو - دیکھو وہ فوج کیسی آرہی ہے

سوار - شائد شاہی فوج ہے!

رانی - شائد میرے راجکمار - میری سہایتہ کے لئے آئے ہوں گے

راجہ۔ (ہوش میں آکر) کیا ہے۔؟

رانی۔ (غور سے دیکھ کر) فوج آگئی ہے۔ کہارو پالکی روک لو

(پالکی رکتی ہے)

راجہ۔ بہادرو بیرو۔ آخری جوش اور دکھا دو

(تلواریں کھنچ جاتی ہیں)

سپاہی۔ جے ہے جے

راجہ۔ (پالکی سے باہر آکر) ——— سارن ———

(غش کھا کر گر پڑا)

سارن۔ (آبدیدہ ہوکر) پران ناتھ ———

چنپت رائے۔ سارن افسوس جس ذلت سے تمام عمر بچتا رہا وہ آج مرتے دم نصیب ہوئی۔ میری آنکھوں کے سامنے دشمن تمہارے پوتر شریر کو چھوئیں گے اور میں ہل بھی نہ سکوں گا ——— ہائے موت کب آئے گی؟

.... سارن! تم نے بہت نازک موقعوں پر میری آن رکھی ہے۔"

سارن۔ (خوش ہوکر) پران ناتھ۔ ایشور نے چاہا تو جب تک سانس باقی ہے جیون ناتھ کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی

(تیغ کو اپنے سینہ کے قریب رکھتی ہے)

راجہ۔ کیا تم کو منظور ہے!

سارن۔ مرتے دم تک مانوں گی

راجہ۔ آخری خواہش ہے اس کو رد نہ کرنا

سارن۔ (تیغ کو سینہ میں چبھوتے ہو) یہ آپ کی درخواست ہے؟

چنپت رائے۔ نہیں یہ خواہش نہیں ہے

سارن۔ میری آرزو ہے کہ مروں تو سر آپ کے قدموں پر ہو

چنپت رائے۔ تم نے میرا مطلب غلط سمجھا۔ میں ایک بردان مانگتا ہوں

سارن۔ شوق سے کہئے!

راجہ چنپت رائے۔ زبان کا پاس کرنا

سارن۔ (کانپ کر) فرمائیے

راجہ۔ اپنا خنجر میرے سینہ میں چبھو دو

سارن۔ (سناٹے میں) جیون ناتھ ایسا کبھی ہوا ہے؟

راجہ۔ میں قید ہونے کے لئے زندہ نہیں رہ سکتا

سارن۔ مجھ سے کیسے ہوگا

(پانچواں سوار بھی حق نمک ادا کرتا ہے)

راجہ۔ (جھنجھلا کر) کیا اسی پر آن نباہنے کا دعویٰ تھا

شاہی سپاہی۔ راجہ کو لینا ——— راجہ کو ———

رانی ——— ٹھیرو ———

(خنجر آبدار راجہ کے سینہ میں پیوست کر دیتی ہے)

شاہی سپاہی۔ رانی صاحبہ۔ ارے آپ کیا کر رہی ہیں۔ ہم آپ لوگوں کا بال بیکا نہ کریں گے شہنشاہ عالمگیر کا حکم تھا آپ لوگوں کو عزت و آبرو کے ساتھ چندیری پہونچا دیں آپ نے غضب کر دیا۔ کسی عورت کی تلوار سے بھی کبھی ایسا کام ہوا ہے؟ ہم نے اودے پور اور مارواڑ کے راجپوتنیوں میں بھی یہ خودداری کا جذبہ نہیں دیکھا۔ عورت کے لئے جان دیدینا بہت آسان ہے مگر رانی صاحبہ کام آپ نے کیا ہے وہ کوئی عورت کر ہی نہیں سکتی۔ بتلائیے ہم شہنشاہ عالمگیر کو کیا منہ دکھلائیں گے۔ آپ کے بندہ بے دام ہیں آپ کا جو حکم ہو اوسے بسرو چشم بجا لائیں۔ اسلام سچا مذہب ہے اور ہم اوس کے نام لیوا ہیں۔ ہم خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ آپ کا جسم

پر ہاتھ ڈالنا ہمارے لئے حرام ہے جو حکم آپ دیں اوس کے بجالانے کے لئے ہم تیار ہیں۔

سارن ۔ (مسکراتے ہوئے) یہ خنجر۔ فرض کی کٹار ہے۔ پریمی پر بھی ہے۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ پریم کی ناؤ پریم کے ساگر میں غوطہ لگا رہی ہے۔ جو سینہ کل تک عزت کا پاسبان اور میری محبت کا خزانہ تھا۔ آج اسی پاک سینہ کو میری تلوار چوم رہی ہے —— اگر ہمارے راجکمار دوں میں سے کوئی زندہ ہو تو ہماری دونوں لاشیں اون کو سونپ دینا —— (خون آلود خنجر اپنے سینہ میں بھونک لیتی ہے)

(پردہ گرتا ہے)

مشیر احمد علوی ناظر (کاکوری بی - اے)

نگار کے گزشتہ سالوں کے پرچے

حسب ذیل قیمت پر معہ محصول مل سکتے ہیں

سنہ ۲۲ع
ستمبر ۴ر
اکتوبر ۴ر
سنہ ۲۳ع
مئی ۶ر
جون عمہ
سنہ ۲۴ع
جنوری ۴ر
فروری ۴ر
مارچ ۴ر
اپریل ۴ر
مئی ۴ر
جون ۴ر
جولائی ۶ر
اگست ۴ر
ستمبر ۴ر
اکتوبر ۸ر

سنہ ۲۶ع
جنوری ۴ر
اپریل ۸ر
مئی ۴ر
جون ۴ر
اکتوبر ۴ر
نومبر ۴ر
دسمبر عہ ر
سنہ ۲۷ع
مارچ ۴ر
اپریل ۴ر
مئی ۴ر
جون ۴ر
سنہ ۲۸ع
دسمبر ۸ر
سنہ ۲۹ع
مارچ ۸ر
اکتوبر عہ ر
نومبر عمہ

سنہ ۳۰ع
مئی ۴ر
اگست ۸ر
ستمبر ۴ر
اکتوبر ۴ر
نومبر ۴ر
دسمبر ۶ر
سنہ ۳۱ع
جولائی ۳ر
اگست ۳ر
ستمبر ۴ر
اکتوبر ۳ر
نومبر ۳ر
دسمبر ۳ر
سنہ ۳۲ع
جنوری ۱۲ر
فروری ۴ر
مارچ ۴ر
اپریل ۸ر

سنہ ۳۲ع
مئی ۴ر
جون ۴ر
جولائی ۴ر
اگست ۴ر
ستمبر ۴ر
اکتوبر ۴ر
نومبر ۴ر
دسمبر ۴ر
سنہ ۳۳ع
فروری ۴ر
مارچ ۸ر
اپریل ۸ر
جولائی ۴ر
ستمبر ۴ر
اکتوبر ۴ر
نومبر ۴ر
دسمبر ۴ر

وحی کی حقیقت علمی نقطۂ نظر سے

وحی، اصطلاح میں اُس مراسلت یا پیغام کو کہتے ہیں جو خدا کی طرف سے اپنے نبی پر بوساطت فرشتہ یا بلا واسطہ نازل
ہو، وحی کا عقیدہ خالص اسلامی عقیدہ نہیں ہے کیونکہ بنی اسرائیل بھی کہا کرتے تھے کہ خدا ان کے قائدین سے براہِ راست
کلام کرتا ہے۔ اور نسطورئین تو خیر عیسیٰ ابن مریم کو الوہیت ثلاثہ کا رکن سمجھتے تھے لیکن اسلام کا وحی کو بوساطت فرشتہ ماننا گویا
قرون مابعد کا معقولات کی جانب ایک قدم اٹھانا تھا کیونکہ بلا واسطہ وحی کا عقیدہ خدا کی تجسیم کو مستلزم تھا۔ اب دیکھنا یہ
ہے کہ خدا کا بندوں کے نام پیغام بھیجنا، اور پیغام کی نوعیت جس سے اس کے اعلیٰ ماخذ کا پتہ چلے کہاں تک محسوسی شہادت
سے مسلم سمجھی جا سکتی ہے۔ اسی سلسلہ میں ہم اُن تمام رجحانات کو بھی بنظر امعان دیکھیں گے جن کی بنا پر انسانی تکمیلات کو ایک
خاص کامل و مکمل ہستی کی جانب منسوب کیا گیا

خدا کا پیغام

تدریجی ترقی کی شہادت نے اس امر کو پایۂ ثبوت تک پہونچا دیا ہے کہ فطرۃ کے حقائق انسان پر رفتہ
رفتہ اور اکثر نہایت غیر متوقع طور پر رونما لیکن یہی اکتشافات ہیں جنھوں نے انسان کے ارتقاء میں عظیم الشان
حصہ لیا اور تہذیب و تمدن کو نوبت بہ نوبت موجودہ منزل تک پہونچایا۔ انسان کی قوت دکمزوری یا اس کی دیگر خصوصیات
سب نتیجہ ہیں اُن بے شمار علمی رجحانات کے جو جوان کے افراد میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ قصداً خواہ غیر ارادی طور پر۔ ماضی
کی لاتعداد صدیوں میں نوع آدم کا رفتہ رفتہ سطح کے اوپر آنا نہایت دلچسپ مطالعہ ہے۔ خدا کی ارضی مخلوقات میں سے کتنی
انواع اب تک معدوم ہو چکی ہیں جن کے آثار جا بجا زمین کی تہوں میں سے برآمد ہو رہے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان کے معدوم
کرنے میں خدا کسی انتقامی جذبہ سے متاثر نہ تھا۔ کیونکہ فطرت مقررہ اصول کی کاربند ہے اور انھیں اصول کے ماتحت فنا و بقا کا
نظام جاری ہے جس کو ہم انسانی اصطلاح میں جو چاہیں کہکر پکاریں۔ اسی اصول کی بنا پر کتنے خاندان مٹ گئے۔ لیکن
خدا نے نہ کسی کے بچانے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا اور نہ بڑھاتا ہے۔ اقوام اس وسیع قانون کے ماتحت جسے "قانون حفظ حیات"
(Law of preservation of life) کہتے ہیں اپنی فطرۃ اور ماحول کے مطابق متاثر ہوتی تھی
اور اسی تاثر کا نام عروج و زوال ہے۔ انسان نے مجموعی طور پر جو باتیں اپنی آسانی کے لئے سمجھیں یا وضع کیں وہ بالکل انہی
قدرتی اصول کے ماتحت تھیں اور نسلاً بعد نسلٍ کام آتی رہیں۔ مثلاً آگ یا دوریے کی ایجاد جس نے فاصلہ کی تسخیر میں اتنا
حصہ لیا۔ جانوروں کے اہلی بنانے کی ابتدا۔ فن تعمیر میں محراب کی ایجاد۔ اوزاروں کی صنعت۔ پانی پر تیرنے اور حرکت کرنے

والی چیزوں کا اکتشاف وغیرہ وغیرہ۔ علاوہ بریں اخلاقی قوانین۔ سیاست مدن اور علوم وفنون کہ یہ سب رفتہ رفتہ انسانی تجربے سے ظہور میں آئے۔ اور ان میں سے کسی ایک تفصیل کو بھی خدا نے فرشتہ بھیج کر نہیں بتلایا۔ الغرض انسان کے دوران ارتقاء میں عمرانی زندگی کے مختلف شعبوں میں جو حقائق دریافت ہوئے ہیں اور اب نسل فی الجملہ اُن سے مستفید ہو رہی ہے وہ ایک زمانہ یا کسی ایک شخص کی تکمیلات میں سے نہیں ہیں بلکہ پچھلے علم اور تجربہ کی بنا پر نسل کے افراد ان کو دریافت کرتے رہتے ہیں اور یہ دستور العمل اب بھی جاری ہے اور آئندہ جاری رہے گا۔ اس کا نام ہدایت یا غیبی اعانت ہے جو کسی وقت یا مقام کے لیے مخصوص نہیں

اب اس تمہید کے بعد دیکھنا چاہئے کہ خدا کے پیغام کی نوعیت کیا ہے۔ خطاب کی شکلیں تین ہو سکتی ہیں۔ ایک تحریر۔ دوسرے کلام فی الصوت۔ تیسرے ذہنی تصور۔ صاف ظاہر ہے کہ پہلی شکل خارج از بحث ہے کیونکہ خدا کی طرف سے تحریری احکام پانے کا کسی نے دعویٰ نہیں کیا۔ دوسری صورت یعنی غیب کی آواز یا ندا۔ سو یہ صورت مشرقی ادب اور روایات میں اس قدر عام طور پر مسلمہ ہے کہ ہمارے ذہن نہایت آسانی سے اس کو قبول کر لیتے ہیں۔ اور ہم ہر زمانہ میں خاص خاص بندگان خدا کی نسبت اس کو ممکن سمجھتے رہے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ آواز اگر مستدرک (Coherent) ہوگی تو وہ یا تو کسی انسانی گلے سے خارج ہوگی یا صدائے بازگشت ہوگی یا جدید آلات سمعی مثلاً۔ کارڈ۔ ریڈیو فون وغیرہ سے ماخوذ ہوگی۔ لیکن خدا چونکہ جسم وغیرہ کی احتیاج سے بری ہے اس لئے اس کا مستدرک صوت پیدا کرنا محال ہے۔ اب رہی تیسری شکل، ذہنی تصور کی۔ جس سے وحی کا مفہوم مستنبط ہو سکتا ہے۔ سو اس کی حالت یہ ہے۔ کہ انسان کے ذہن میں کوئی تصور از خود بغیر کسی خارجی سبب کے پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ اور وہ خارجی اسباب اسی کے تجربات یا مشاہدات ہوتے ہیں جو ذہن انسانی میں مختلف و متنوع صورتیں اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً خواب میں انسان کو عجیب و غریب شکلیں دکھائی دیتی ہیں لیکن ان کی اجزائی ترکیب فرداً فرداً اس کے ذہن میں پیشتر سے موجود ہوتی ہے۔ مثلاً کسی شخص نے سونے کا پہاڑ دیکھا تو اگرچہ بیداری میں یہ تصور اس کے خیال میں نہ آیا ہو لیکن سونا اُس نے دیکھا ہے اور پہاڑ بھی اور ایک شے کی ہیئات کا تصور بھی ذہن میں آ چکا ہے۔ سوتے وقت دماغ ارادے کی گرفت سے آزاد ہوتا ہے لہٰذا ایک نقش دوسرے کسی نقش سے مل کر یا باہم کئی نقوش آمیز ہو کر عجیب و غریب شکلیں (Synthetic Combination) بنا لے رہنا بالکل ایک فطری عمل ہے۔ بہر حال خواب ہو یا بیداری اگر تصور کو مطلق العنان کر دیا جائے تو گزشتہ تاثرات کے ذخائر اس قدر کثیر التعداد نئی شکلیں پیش کریں گے کہ علم ریاضی ان کے حساب سے قاصر رہے گا

اب ہم ضمناً اس بحث کو اٹھائیں گے کہ خدا کے پیغام کی نوعیت کیا ہو سکتی ہے، مخلوق پر اس کے اجرا کی کون سی صورت ممکن ہے۔ خود اجرا کی کیا ضرورت ہے اور یہ عقیدہ کہاں سے آیا لیکن اس پر بحث کرنے سے قبل انسان کے ذہنی ارتقاء کی تاریخ مجملاً جان لینا... ضروری ہے ——— انسان نے جن قوانین کے ماتحت رفتہ رفتہ

ترقی کی ان سب کی بنیاد ماحول کی ضرورت، فطری صلاحیت اور قوت حافظہ واستدلال پر قائم ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر جاندار کو دوسروں کی دستبرد سے بچنے کے لئے کوئی نہ کوئی جسمانی یا طبیعی خصوصیت عطا ہوئی ہے۔ چنانچہ ہرن کی قسم کے جانوروں میں ٹانگوں کی قوت اور دوڑنے کی صلاحیت۔ لومڑی کی چالاکی اور فی الفور قوت فیصلہ، خرگوش کے کان، سانپ کا زہر، بندر کی چستی، خار پشت کے کانٹے، تیتری کے قسم کے پتنگوں کے لمبے بنے غار، بعض نازک پودوں کا نباتی زہر پھیلنے والی بیلوں کی گرفت وغیرہ پھر اس امر کا ثبوت کہ یہ خصائص خلقی طور پر اکتسابی ہیں اس بات سے بہم پہونچتا ہے کہ جہاں حفظ نفس کے لئے ان کی ضرورت باقی نہیں رہتی تو یہ رفتہ رفتہ کرکے سلب یا محو ہو جاتی ہیں مثلاً اہلی جانوروں کی دفعی خصوصیت ان کے سینگ اور سر کی ٹکر تھی جواب بھی جنگلی بھینسوں اور ارنوں میں موجود ہے مگر اہلی جانور انسان کی حمایت میں اس کی ضرورت ہزاروں نسلوں کے دوران میں کھو چکے ہیں چنانچہ اب اس کی یادگار صرف سینگ باقی رہ گئے ہیں۔ اسی طرح انسانی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اول اول ایک جانور ہی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ اور رفتہ رفتہ تجربہ واستدلال کی مدد سے اس نے ترقی کی، چنانچہ ہم مذہبی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح اس نے ابتدائی شیروں کو شکار کی تلاش کے طریقے بتائے، جس طرح اس نے بئے کو گھونسلا بنانا سکھایا جس طرح اس نے چرندوں کو مختلف قسم کی نباتی پیداوار میں تمیز کرنا سکھایا، ٹھیک اسی نہج سے وہ انسانوں کی مساعی سے نتائج پیدا کرتا رہا جسے آپ پیغام خداوندی کہیے یا کچھ اور ورنہ یوں خدا کو فی الحقیقت ہماری بقا، ہماری ترقی۔ ہماری بہبودی اور ہماری نجات کسی چیز کی پرواہ نہیں وہ احساس اور جذبات سے بالکل بری ہے وہ صرف قدرت ہے محیط وساری اور نیک و بد کا تعلق صرف ہماری ذات سے متعلق ہے اور ہمیں پر اس کا اثر ہوتا ہے۔۔۔ صرف ایک اصولی بحث ہمیں اس سلسلے میں اور کرنا ہے وہ یہ کہ خدا کا پیغام مخلوقات کی کسی نوع کیلئے اگرچہ بعید از قیاس ہے لیکن ضرورت بحث کیلئے صحیح باور کر لیا جائے تو اسکے لئے دو شرطیں لازم ہیں اول تو یہ کہ اسے عالمگیر ہونا چاہیئے دوسرے یہ کہ ابتدائے تخلیق نوع کے وقت ہونا چاہیے اور ساتھ ہی ایسی صورت کیساتھ کہ انسان بعد نسل اسکی تکرار ہوتی رہے۔ درانحالیکہ اصطلاح کا پیغمبری نظام صرف بنی اسرائیل اور سامی اقوام تک محدود بتایا جاتا ہے۔ علاوہ اسکے تمام ہادیوں کو متفق اللسان ہونا چاہیئے تھا مشن ایک ہونا ضروری تھا اور نتائج میں بھی یکسانیت ہونی چاہیئے تھی۔ درانحالیکہ خود سامی اقوام کے مختلف مذاہب باہم کر متفق نہیں ہیں اور اوامر ونواہی تعزیری قوانین میراثی ترتیب اور مالی حقوق میں جابجا فرق موجود ہے علاوہ بریں پیغام کی ترجمانی ہر زمانہ میں اور مختلف مقامات پر جدا جدا ہوتی رہی اسلئے پیغام کا ظاہری مقصد فوت ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے پیغام کو صاف اور صریح ہونا چاہیے تاکہ ہر شخص اسی آسانی سے سمجھ سکے اسکو استعداد مبہم اور غیر متعین عبارتیں نہونا چاہیے کہ لوگ حسب ضرورت یونانی ایڈلی کیطرح اپنے اپنے معنی بنالیں اور سب سے زیادہ اہم یہ شرط ہے کہ اسکے اجزا باہم متناقض نہ ہوں ایک حکم دوسرے حکم کی ایک بیان دوسرے بیان کی تردید نہ کرے کوئی بات خلاف قیاس نہ ہو اور فطرت کے عام طریقوں کے منافی نہو

اب اس مسئلہ کو دوسرے رخ سے دیکھنا ہمیں مقصد سے زیادہ قریب کرے گا۔ ہم یہ دیکھیں گے۔ کہ وہ کون سی صورتیں ہوتی ہیں جن میں انسانی افعال خدا یا ما فوق الادراک قوت کی جانب منسوب کئے جاتے ہیں۔ ہم نے قبل از یں دوران بحث میں بتایا ہے۔۔۔ کہ خارجی تاثرات انسان کی ذہنی اور طبیعی تشکیل میں اکثر کارفرما رہتے ہیں اور نطق، خارجی تحریک کا ردعمل ہے جسے ذہن کوئی اثر قبول کرنے کے بعد جواباً باہر بھیجتا ہے مثلاً کسی شخص کے شانہ پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ اور دماغ نے اس کو محسوس کیا پھر تجربہ سے اس نے معلوم کیا کہ جب کوئی شخص ایسا اشارہ کرتا ہے تو وہ مخاطب کرنا چاہتا ہے، یہ تمام ذہنی عمل چشم زدن میں انجام

نظام اعصابی نے انجام دیا اور جواباً اُس کے نطق نے ان الفاظ کی تشکیل کی "کیا کہتے ہو"

اس طرح پر نطق گویا ذہن کے بازعمل کا آلہ ہے جس کے ذریعہ سے انسان نے اپنا مافی الضمیر دوسروں پر ظاہر کرنا قبل تاریخی زمانہ سے جان لیا ہے۔ اور الفاظ اور ادائے مطلب کے علامات روز بروز بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ با محل اور مؤثر الفاظ و علامات کا استعمال نہایت بلند پایہ فن سمجھا جانے لگا۔ پھر چونکہ اس لحاظ سے شاعر، نثار، مقرر، خطیب وغیرہ سب تصوری آرٹسٹ ہیں۔ اس لئے جتنا زیادہ انسانی جذبات و احساسات کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ اپنی صناعی کریں گے۔ اتنا ہی زیادہ کامیاب ہوں گے

شاعر غالباً سب سے قدیم آرٹسٹ اس فن کا ہے ———————— لیکن اس میں اور ایک محقق میں یہ فرق ہے کہ شاعر زیادہ تر اپنے جذبات سے کام لیتا ہے جیسا کہ وہ چاہتا ہے اور ایک محقق صرف فطری خط و خال سے بحث کرتا ہے یا بالفاظ دیگر یوں سمجھے کہ محقق واقعات سے پہلو تہی نہیں کر سکتا خواہ وہ کتنا ہی متاثر ہو اور شاعر کو اوزان اور تناسب الفاظ کا پابند ہونا پڑتا ہے

اب ماضی کے ادوار پر نظر ڈالنے اور اقوام کی تدریجی نشو و نما پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ شاعر اور اس کے جیسے ارباب فن کے فروغ کا زمانہ عموماً وہی ہوتا ہے جو علمی کساد بازاری کا ہوتا ہے حالانکہ صحیح معنوں میں کسی قوم کا کوئی دور اب تک ایسا نہیں گزرا جو خالص علمی کہا جاسکے اور اسی نسبت سے شاعر کا فن ہر جگہ کم و بیش پایا گیا ہے، انگلستان میں شیکسپیر ملٹن اور ٹینیسن کے زمانہ کو زیادہ دن نہیں گزرے اور فی الحال اگر اس میں کچھ کمی ہوئی ہے تو دوسرے جدید آرٹ نے اس کی جگہ لے لی ہے یعنی ناول نویسی افسانہ نگاری اور جرنلزم وغیرہ نے۔ ان میں بھی تصورات کی ترتیب ہے اور ساتھ ہی واقعات کی جن سے تعلیمی اور تفریحی کام لیا جاتا ہے لیکن صاف ظاہر ہے کہ یہ بھی سب انفرادی آرٹسٹ کے تصوری نظام کی سادگی و پرکاری ہے۔ ہندوستان میں ویدوں کے گیت ہمیشہ گائے گئے اور برہمن اسی کے اشلوک اور منتروں سے دوسری ذاتوں کو نشانۂ ستم بناتے رہے کالیداس کے والمیک والے جادو سے سنسکرت داں طبقہ اب تک واقف ہے اس کے علاوہ شنکر اچاریہ۔ کبیر نانک اور چیتنیا نے بھاشا زبان کے ذریعہ سے عوام کو مسحور کیا

عرب میں ایام جاہلیت کی شاعری ایک قومی جوہر تھا۔ شاعر، قبیلہ کی قوتوں میں ایک اہم قوت سمجھا جاتا تھا۔ رجز، نسب نامے، تلوار اور گھوڑے کی شہرت شاعر پر منحصر تھی۔ دشمنوں پر تلوار اور نیزے سے زیادہ کاری زخم ہجویہ اشعار کے لگائے جاتے تھے۔ شاعری عرب کی آواز تھی شاعری عرب کی جان تھی۔ اُن کی دماغی اور ذہنی تشکیل۔ اُن کی قومی عادت اور ان کے معیار زندگی ان سب میں شاعری بحیثیت عنصر غالب کے جلوہ نما تھی اور قومیت کا شیرازہ اگر کسی چیز سے متصور ہوتا تھا تو وہ شاعری کے ذریعہ سے رائج کئے ہوئے مشترک خیالات سے۔ اُس زمانہ میں شعر چند مخصوص افراد کا مشغلہ دماغی نہ تھا بلکہ کل قوم کا واحد ذریعہ اظہار خیال تھا۔ ہر قبیلہ میں ایک یا زیادہ شاعر ہوتے تھے جو اپنے جملہ مشاہدات اور تاثرات کو آزادی کے ساتھ عروضی جامہ پہنانے

تھے۔ اُن کے بے لکھے الفاظ صحرائے عرب کے ایک گوشہ سے دوسرے تک تیر کی سُرعت کے ساتھ پہونچ جاتے اور زبان زد ہوجاتے تھے۔ بچہ بچہ اُن کی خوبیوں کو پرکھ سکتا تھا اور ذرا سی اونچ نیچ کو سنتے ہی تمیز کرلیتا تھا۔ اَلشِّعْرُ دِیْوَانُ العرب بہت مشہور مقولہ ہے۔ عرب کی ریگستانی زندگی کے تمام مظاہرے اس میں محفوظ ہیں۔ عرب جو کچھ سوچتا تھا اور سمجھتا تھا اور محسوس کرتا تھا وہ ان قبائلی منادیوں یا اعلان کرنے والوں سے نہ بچ سکتا تھا۔ اُن کی چھوٹی اور بڑی رسمیں اُن کے قومی اور انفرادی جذبات اُن کی آرزوئیں اور مقاصد شاعروں ہی کی آواز سے بروئے کار آتے تھے۔ غرضکہ باوجود خانہ جنگی اور انتہائی بدنظمی کے ایک متحد کرنے والا عنصر اندر ہی اندر کام کر رہا تھا۔ کوئی اخلاقی و تمدنی مربوط قوت اُن کے درمیان نہ تھی مگر یہی اشعار تھے جو مختلف شاعروں کی زبان سے نکل کر ایک غیر مدوّن سرمایہ بن گئے تھے۔ جس نے 'مروت' کے اخلاقی معاشرتی معیار قائم کئے تھے اور جس نے عصبیت اور نسبی شرف کو ایک طرح پر منظم پیمانہ پر قائم کردیا تھا۔ لوگ ایک مشترک جذباتی واحساسی یگانگت محسوس کرتے تھے۔ اشیا کا اندازہ انہی شاعرانہ معیاروں کی بنا پر کرتے تھے۔ اور زبان کے جوہر فصاحت۔ بلاغت اور دیگر محاسن کلام کو بن پڑھے ہوئے سمجھ لیتے تھے۔ اور کوئی بات اُن پر اثر نہ کرسکتی تھی مگر وہ جو فصیح و بلیغ شعروں کی شکل میں اُن تک پہونچتی تھی

لیکن ظاہر ہے کہ جاہلیت کے عربوں کا علمی مبلغ کیا ہوگا۔ یونان کے ماوراء الطبیعات کا علم انھیں مطلق نہ ہوا تھا۔ وہ بودھ کے نروانی فلسفہ سے قطعاً ناآشنا تھے۔ نہ زرتشت کی تعلیم کا وہاں کچھ اثر تھا نہ قدیم مصری تمدن کا انھیں پتہ۔ بنی اسرائیل کی نیم تاریخی روایات اور تورات وانجیل کے زیادہ مشہور نظریات، نجرانی عیسائیوں اور منتشر یہودی قبائل کے ذریعہ سے البتہ ان کے حیطۂ علم میں سرایت کئے ہوئے تھے۔ الٰہیات۔ مذہب اور قوانین قدرت کے متعلق اُن کے احتمالات نہایت مبہم اور غیر مبسوط تھے۔ کاہن اور موحد ضرور جا بجا تھے جو اُس وقت کے حالات سے غیر مطمئن تھے۔ عیسائی اور یہودی زندگی کی بے راہ روی کو انھوں نے دیکھا تھا اور قائم شدہ خیالات اور سوشل نظام کی کمزوریوں کو جگہ جگہ سے محسوس کرتے تھے لیکن کسی تعمیری نظام کے قائم کرنے کی نہ اُن میں جرأت تھی نہ خیالی وسعت۔ عام عرب ناچار بت پرستی پر اُتر آیا تھا کیونکہ عصبیت کے قومی رجحان کی بنا پر اپنے جد امجد اسمٰعیل و ابراہیم کے طریقوں پر بزعم خود عمل کرنا اور اُن کے خداؤں پر تکیہ کرنا ایک فطری تقاضہ تھا۔ پرستش کا کوئی خاص طریقہ سوائے عجز اور نیازمندی کے اظہار کے اُن کو نہ آتا تھا۔ اللہ۔ رب۔ رحمٰن۔ رحیم۔ مَلک۔ عقوبت۔ شیطان۔ قربانی۔ جبریل میکائیل اور بہت سی قرآنی اصطلاحات بول چال میں استعمال کرتے تھے

معاشی وسائل عرب کے کبھی قابل اطمینان نہیں رہے صرف تھوڑے زمانہ تک (شاید قبل مسیح دو ایک صدی تک) جبکہ ہندوستانی سواحل کی تجارت شام سے براہ یمن ہوتی تھی۔ مغربی عرب میں تجارتی گرم بازاری رہی ورنہ عرب پیشتر چراگاہی کا پیشہ کرتے رہے یا رہزنی اور غارتگری کا۔ مکہ میں کعبہ کی تولیت وہاں کے قبائل کی وجہ معاش تھی۔ مابعد اسلامی عہد میں بھی حجاز و نجد زائرین اور معتقدین ہی کے دست نوال پر منحصر رہے۔ عرب کی یہ بے مائگی اُس کی آزادی اور عزلت گزینی کا باعث ہوئی اور ساتھ ہی اُس کے باشندوں کی شجاعت۔ تہور، محنت کوشی اور خود مختاری کی فطری وجہ بنی۔ کوئی بیرونی فاتح

اُن کے مُلک کی طرف توجہ کر کے کیا لیتا اور خود انھیں جنگ سے باز رہنے کے لئے کس چیز کا خوف تھا۔ چنانچہ نہ تو عرب نسل میں بیرونی آمیزش ہوئی نہ بیرونی خیالات وہاں مسلط ہونے پائے۔ ہندوستان اور وسط یورپ برخلاف اس کے ہمیشہ بھوکی جنگجو قوموں کے آماج گاہ رہے۔ باہر کا خون۔ باہر کے خیالات باہر کے طور و طریقہ ان ملکوں میں سوشل اور معاشرتی انقلابات برپا کرتے رہے اور کتنی کروٹیں بدل کر وہاں کے حالات نے موجودہ نشست اختیار کی ہے۔ عرب میں انسان صرف ان مظاہرات قدرت سے آگاہ تھا جو ایک گرم و خشک منطقہ حارہ والے مُلک میں رونما ہوتے ہیں۔ سبزہ زار۔ سمندر۔ موسلا دھار بارانی۔ برسات وغیرہ اس قسم کی چیزیں وہاں مفقود تھیں اس لئے وہاں کی ادبی روایات میں ان کا کہیں ذکر نہیں ہے نہ وہاں دربار کی شان تھی۔ نہ افواج و خدم کی نہ وہاں رُوما کے جیسے تماشے تھے نہ ہندوستان کے زرعی وسایل، جیسا مُلک سادہ تھا ویسے ہی لوگ سادہ تھے۔ لیکن چونکہ موت کی بیکسی اور موت کے بعد کی تاریک مدت کا انھیں بھی احساس تھا۔ اس لئے اخلاقی نصائح کی قوت بشرطیکہ نفسیاتی بنیاد پر قائم ہو کوئی وجہ نہ تھی کہ ان کو بھی سوچنے اور سمجھنے پر مجبور نہ کر دیتی خصوصاً جبکہ اس کا انعام دنیا میں غنیمت، غلام و کنیز اور عقبیٰ میں جنت اور حور و قصور باور کرائے جائیں۔ ایک فاقہ مست قوم ان ہی وعدوں سے اُبھاری جا سکتی ہے

یہ مُلک تھا، یہ قوم تھی اور یہ اُس کے حالات تھے جب ظہورِ اسلام ہوا۔ پھر چونکہ عیسائی راہب، عرب موحدین یا حنفاءؔ[1] اور کاہن برابر مکہ اور اطراف میں آتے جاتے تھے۔ اس لئے اُن کے ذریعہ سے منفرد تصورات کا بہم پہونچنا بعید از قیاس نہ تھا۔ بنی اسرائیل کی کہانیاں زبان زد تھیں۔ اصنام پرستی کا اصولی ضعف تھوڑی سی سنجیدہ طبیعت والے پر روشن ہے بشار اپنے تصورات کی تشکیل اور ترتیب میں آزاد ہے۔ لوگوں میں آنے والے نبی یا مصلح کے چرچے ہمیشہ رہے ہیں اور اس وقت بھی تھے۔ عیسائی بھی اور یہودی بھی نجات دلانے والے کے انتظار میں تھے۔ لیکن چونکہ نبوت کے لوازم میں فوق البشر عنصر کی ضرورت تھی۔ اور عرب کے نزدیک کلام سے زیادہ اثر کرنے والی کوئی چیز نہ تھی۔ اس لئے اگر ایک شخص میں آرٹ (شاعری) فلسفہ۔ تعمیری اِصلاح کا شوق اور تدبیر سب ودیعت ہوں اور حالات کی مساعدت سے ہر ایک کے اظہار کا موقع حاصل ہو جائے۔ اور ارادہ کی پختگی اور خود اعتمادی اس کی مساعی میں شامل حال ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ کامیاب نہ ہو

ایک اور بات قابل لحاظ یہ ہے کہ زمانہ رسالت میں "اعلاے کلمتہ الحق"، نہایت محدود پیمانہ پر ہوا۔ فتح مکہ تک تو صرف

---

[1] حنفاء مذہبی متخیلین تھے جو مختلف اکناف عرب میں خاموش زندگیاں بسر کرتے رہے۔ مورخین نے ان میں سے چند کے متعلق جستہ جستہ حالات چھوڑے ہیں۔ منجملہ ان کے ورقہ بن نوفل قریشی۔ زید بن عمر۔ امیہ بن ابی صامت تقیفی زیادہ معروف ہیں۔ ان کے حالات کے متعلق اتنا علم ہے کہ وہ اصنام پرستی سے منحرف تھے ابراہیم کے اصل طریقوں کے جویا تھے۔ مُردہ جانور کا گوشت خون اور بتوں پر کی قربانی نہیں کھاتے تھے۔ نوزائیدہ لڑکی کو دفن کر دینے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور دعویٰ کرتے تھے کہ ہم ابراہیم کے خدا کی پرستش کرتے ہیں

حوالی مدینہ کے چند قبائل داخل اسلام ہوئے

اس کے بعد دو تین غزوات اور سرایا میں صرف جنگی محکومیت عمل میں آئی۔ مفتوحین جان و مال کے عوض بآسانی چند اصول کی باتوں کو تسلیم کر لیتے تھے۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں پھر ایمان کا دنیاوی انعام تمام قوم کو اس کی جانب متوجہ کر دینے کو کافی تھا۔ علاوہ بریں خانہ جنگی کے مقابلہ میں منظم زندگی۔ ڈسپلن اور باقاعدگی کے فوائد۔ قوم بھر کی اخوت یہ سب باتیں وحشی اعرابیوں کو بھی رام کر سکیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اوسط عرب وسیع نظر سے قوم کے مفاد اور دیگر اغراض کی طرف غور کرنے کے قابل ہو گیا بلکہ اُن میں کے سمجھدار لوگ ان تغیرات کو دنیاوی اعتبار سے مغتنم سمجھنے لگے۔ اسلام کی داغ بیل اگر زمانہ رسالت میں رکھی گئی تو یقیناً استحکام اور قوت عہد خلافت میں بہم پہونچی۔ اس میں جناب عمر بن الخطاب کی شخصیت کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔ اسلام اگر بڑھایا نہ جاتا اور دوسری قوموں پر مسلط نہ ہوتا تو اپنے ملک کی خشک سرزمین میں بہت جلد کالعدم ہو جاتا۔ اسلام کے دور ارتقا میں اہم منزل کے نشانات یہ ہیں :-　ہجرت کی کامیابی۔ جنگ بدر۔ جنگ نہاوند جنگ یرموک۔ نظام فاروقی اور امیر ولید کی فتوحات۔ نیم وحشی اقوام کی سیلابی تاخت بالمقابل قائم شدہ تمدنی نظاموں کی دنیا ایک سے زائد بار دیکھ چکی ہے۔ چنانچہ تاتاریوں کا سیلاب ایران وعراق پر۔ کشن اور یوہیچی اقوام کا ہندوستان پر گوتھ اور ونڈال کا روم پر۔ ھون قبائل کا شمالی یورپ پر تاریخ میں روشن ہے۔ اسلام بالکل قدرتی اسباب کی بنا پر پیدا ہوا بڑھا۔ پھیلا اور زوال پذیر ہوا۔ اس کے کسی دور میں نہ تو غیبی امداد شامل حال ہوئی نہ خدائی غضب نے اسے نیچے گرایا

اب ہم اس تمہید کے بعد اصل مدعا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یعنی یہ کہ جس چیز کو خدا کا کلام، باور کرایا گیا ہے اُس میں فی نفسہ ایسا سمجھے جانے کے عناصر موجود ہیں یا نہیں۔ قرآن موجودہ صورت میں بالکل غیر سائنٹفک طور پر مدون ہے۔ بنائے ترتیب سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ طویل ترین سورۃ سے ابتدا کی گئی ہے۔ اور سب سے چھوٹی صورت پر اختتام کیا گیا ہے قدیم اہل عرب کو شعرا کا مجموعۂ کلام اور اس کے راوی اسی ترتیب[1] سے یاد تھے۔ چنانچہ خلافت عمر و عثمان میں اسی اصول کو پیش نظر رکھا گیا ہے

صاحب کلام نے اپنی معنوی تخلیق کی تدوین و ترتیب میں وہی استغنا اختیار کیا جو ہر زمانہ میں (اور اب بھی) باکمال اہل فن سے فطرتاً ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ان کو اپنی تعلیم کی ترویج میں زیادہ دلچسپی تھی۔ اور امت کو کتاب کی حفاظت کے لئے تاکید

---

[1] عرب میں لکھنے کا فن بہت بعد میں عام ہوا لیکن جاہلیت کے شعرا کا کلام حیرت انگیز صحت کے ساتھ محفوظ رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس زمانہ میں راویوں کا پیشہ بہت عام تھا۔ جس قبیلہ میں شاعر ہوتے تھے اُس میں راوی بھی ہوتے تھے اور وہ لوگ شعرا کے کلام کو مع متعلقہ باتوں کے حفظ کر لیتے تھے جیسے ہندوستان میں بھاٹوں کا پیشہ تھا اور انگلستان میں (Minstrels) منسٹرل کا۔ یہ لوگ اپنی اولاد کو بھی یہ فن تفویض کرتے تھے اس طرح سینہ بسینہ مشہور کلام باقی رہے قرآنی حفاظ بھی اسی نوع میں شمار کئے جا سکتے ہیں

معنوی حیثیت سے تھی نہ کہ خارجی حیثیت سے۔ چنانچہ متعلقہ لوگوں نے اس کی ترتیب میں کوئی خاص کاوش نہیں کی۔ مکی اور مدنی سورتوں میں بین فرق محسوس ہوتا ہے۔ مکی آیات مختصر، بلیغ بلند اور موثر ہیں، مدنی کلام انتظامی۔ آئین سازی اور سیاست کی طرف راجع معلوم ہوتا ہے۔ متکلم کے دنیاوی ماحول اور حالات کا تغیر نفس کلام سے مترشح ہے۔ مثلاً مکی سورتوں میں جبکہ یہود اور نصاریٰ سے سابقہ نہ ہوا تھا۔ اُن کے طریقوں کی تردید کہیں نہیں ہے اگر کہیں ذکر ہے تو نہایت مجمل اور بلا نمیش

مدینہ میں یہود سے زیادہ سابقہ پڑا اُن کی طرف سے مزاحمت ہوئی۔ لہٰذا ان کی نسبتاً زیادہ تکذیب۔ اُن کے قصص اور روایات کی طرف پے در پے کنایہ۔ عاد ثمود اور قوم لوط جن کی بستیوں کے کھنڈر جابجا عرب کی گزرگاہوں پر دکھائی دیتے ہیں اُن سے استنباط

جدال و قتال کے متعلق احکام اُس وقت نازل ہوئے جب فی الواقعہ مدینہ کے قیام میں اس کی ضرورت محسوس ہوئی —— قبلہ کے تغیر کی بابت جو احکام صادر ہوئے وہ بھی اسی اصول پر مبنی تھے۔ کیونکہ مکہ کے قیام تک اہل کتاب سے مخالفت کی وجہ پیدا نہ ہوئی تھی۔ اس کے بعد حالات بدلنے پر اس کی ضرورت محسوس ہوئی

اسی طرح مصلحت زمانہ کے اعتبار سے قدیم عرب رسموں کا جواز۔ مثلاً حرمت کعبہ۔ حرمت شہود طلاق۔ تعدد ازدواج۔ غلام و کنیز۔ غنیمت۔ قربانی وغیرہ کے مروجہ قواعد

ابتدائے 'بعثت' میں جبکہ مقصد صرف تبلیغ وحدانیت اور تکذیب شرک تھا۔ اسلوب خطاب نہایت زوردار اور مرعوب کن ہے۔ سننے والوں کے ذہنی اشکال اور طبیعی رجحانات کو نفسیاتی ذرائع سے متاثر کیا گیا ہے۔ چنانچہ خدا کی عظمت و جبروت۔ اور تاریخی واقعات کی ترجمانی۔ مصنوعی خداؤں کی بیچارگی اُن کے طریقوں کی ناہمواری نہایت معنی خیز اور تصویری الفاظ میں پیش کی گئی ہے۔ اسی طرح منکرین کے عذاب کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ وہ ایک عامی کو سربجیب فکر کر دینے کے لئے بہت موزوں ہے۔ بچے اور ناتربیت یافتہ سخت گیر لوگ جزا اور سزا کی ایسی ہی تصویروں سے اُبھارے جا سکتے ہیں۔ اعلیٰ تر ذہنی پایہ کے لوگوں سے یہ کہہ دینا کافی ہو تاکہ تمھیں مستقل عزت یا ذلت نصیب ہوگی۔ تمھیں روحانی بلندیاں یا پستیاں حاصل ہوں گی

(باقی)

قاضی محمد عزیز عرفانی (نیوتنوی)

ماہِ آئندہ سے

حضرت نیاز فتحپوری کا ایک مسلسل بے مثل افسانہ بیراگ کا بروگ شائع ہوگا——

مینیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

عزیزم

تمھاری شاعری سے تھیں کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو، لیکن مجھے ضرور ہے اور وہ یہ کہ اس بہانہ سے کبھی کبھی تمھاری خیریت معلوم ہو جاتی ہے ——— مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ تم نے کبھی کوئی خط ایسا لکھا ہو جس میں کوئی غزل ملفوف نہ ہو اور اصلاح کی خواہش نہ کی گئی ہو ——— پھر اسی کے ساتھ میں تمھارے صبر و استقلال کا بھی قائل ہوں کہ میں نے کبھی تمھاری خواہش پوری نہیں کی، لیکن تم نے کبھی مایوس ہو کر اس سلسلہ کو ختم نہیں کیا ——— تاہم یہ سوچتا ہوں کہ آخر کب تک میں ٹالتا رہوں گا اور تمھیں کب سمجھ آئے گی کہ میری خاموشی کو اور کچھ نہیں تو میری نااہلی ہی پر محمول کرو

تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں شعر و شاعری ایک زمانہ ہوا ترک کر چکا ہوں اور مشکل ہی سے کسی کا کوئی شعر مجھے پسند آتا ہے۔ اس کو میرے معیار کی بلندی کہو، خبط کہو، بے حسی سے تعبیر کرو، بہرحال جو کچھ سمجھو واقعہ یہ ہے کہ میرا دل اس فن سے اچاٹ ہو چکا ہے اور دل و دماغ کے سامنے اور اتنے اہم مشاغل موجود ہیں کہ اس طرف توجہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا ——— پھر اسی کے ساتھ جب تمھاری غزلوں کو دیکھتا ہوں تو ان میں اصلاح کی بھی کوئی گنجائش نہیں پاتا کیونکہ اصلاح کا مقصود تو جابجا سقام کو دور کرنا ہے، لیکن جس غزل میں تلاش سے بھی کوئی معقول بات نظر نہ آئے۔ اس کی اصلاح تو صرف اسی طرح ممکن ہے کہ از سر نو دوسری لکھ دی جائے، پھر بتاؤ کیا مجھے سودا ہے کہ میں خواہ مخواہ تھیں غزلیں کہہ کہہ دیا کروں اور تم کو فریب نفس میں مبتلا کروں جس کی خیر سے یوں بھی تم میں کوئی کمی نہیں ——— پاگل ہوئے ہو، اپنا کام کرو اور اس خبط کو چھوڑو۔ نہ تمھاری تعلیم پوری، نہ تمھاری صحبت معقول، نہ تمھارا ماحول ٹھکانے کا، پھر جو یہ خبط تم پر سوار ہوا ہے سو کیوں ؟

اگر تم کو میرے ساتھ کوئی علاقہ ایسا ہے جو کبھی کبھی خیریت لکھنے اور دریافت کرنے پر مجبور کر سکتا ہے تو اس قسم کی مراسلت میرے لئے یقیناً باعث مسرت ہو سکتی ہے، لیکن محض "غزل بازی" کے لئے کیوں اپنے پیسوں کا اور میرے دل کا خون کرتے ہو

نیاز

میر صاحب قبلہ

خط ملا - دلبری کا شکریہ - آپ مجھ سے تفصیل چاہتے ہیں - حالانکہ مجھ میں "اجمال" کی بھی تاب نہیں ——— آپ کے جواں بخت وجواں سال تلمیذ اجل، یعنی آپ کی مملکت شعر وسخن کے "مہار اجکمار" کی تحریر جو انھوں نے اپنے گڈھ لکھی تھی میرے پاس بھیجدی گئی ہے - کیا کیا گل افشانیاں کی ہیں، کیا کیا "برشِ تیغِ جفا" پر ناز فرمایا ہے - جلی وصلی

ان کو میرے آپ کے تعلقات معلوم، وہاں میری پوزیشن اُن پہ روشن، علاوہ بریں اس تمام ماحول سے آگاہ جس میں زندگی بسر کر رہا ہوں، لیکن اللہ رے غرورِ حسن وجوانی کہ بے دھڑک پیغام بھیج دیا - اور میری برائی میں اپنی کامیابی سمجھ کر جھوٹ کا طومار باندھ دیا ——— یقیناً میں اس تعلق کا مخالف تھا اور ہوں لیکن خدارا اُن سے پوچھئے کہ اس سے خود میری کیا غرض متعلق تھی

انھوں نے میرے رسوخ سے خواہ مخواہ جذبۂ رقابت پیدا کر لیا - اور ظاہر ہے کہ "رقیب روسیہ" کو ایک شاعر گالیاں نہ دیگا تو اور کیا کرے گا ——— بہر حال اس سے میرا نقصان تو سوائے اس کے اور کچھ نہ ہوا کہ تھوڑی سی ندامت وخفت اُٹھانا پڑی، لیکن اُن کے لئے کامیابی کی اب کوئی ادنیٰ سی صورت بھی باقی نہیں رہی ——— کہئے تو ان کا اصل خط روانہ کر دوں ؟ آپ کے تو وہ محبوب شاگرد ہیں، آپ ہی سمجھائیے کہ جوانی میں تھوڑا سا دیوانہ پن تو خیر ہونا ہی چاہئے، لیکن یہ "باؤلا پن" کیسا ؟

نیاز

گفتی کہ چرا حالِ دلِ زار نہ گوئی
من خود کنم آغاز بہ پایاں کہ رساند؟

آپ کیا اس سے زیادہ تفصیل چاہتے ہیں، اس لئے زیادہ سننے کے متمنی ہیں ؟ آہ،

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

یہ نہ پوچھئے کہ جو کچھ ہوا کیونکر ہوا بلکہ یہ سوچئے کہ آیندہ کیا ہونے والا ہے - مجھ میں تو اتنی سکت بھی نہیں کہ مستقبل کی تاریکی کا خیال تک دل میں لا سکوں - جی چاہتا ہے کپڑے پھاڑ کر کسی ایسی دنیا میں چلا جاؤں جہاں کم از کم آزادی سے رو تو سکوں ——— یہاں تو یہ بھی ممکن نہیں ——— دم گھٹتا ہے، جی اُلجھتا ہے اس کے خیال سے اُس کے خیال سے ساری دنیا کے خیال سے ——— پھر لطف یہ کہ مجھے خاموش دیکھ کر بعض سنگ دل کہتے ہیں، بعض صبر وضبط کی داد دیتے ہیں - اور یہ خبر کسی کو نہیں کہ جب کلیجہ سے دھواں سا اُٹھتا ہے تو میرا کیا عالم ہوتا ہے

آپ فرماتے ہیں کہ چند دن کے لئے کسی اور جگہ چلا جاؤں - مشورہ مناسب ہے، لیکن کوئی تدبیر ایسی بتائیے کہ دل ودماغ

میرے یہیں رہ جائیں۔ ورنہ یوں کہیں جانا بیکار ہے
جانتا ہوں کہ رفتہ رفتہ یہ غم بھی کم ہو جائے گا، چند دن اور اس خلش کی لذت اٹھا لینے دیجئے
سوگوار۔ نیاز

خوب، اندازِ بیان ہی وہ چیز ہے جس سے شاعر کے صحیح جذبات کا پتہ چلتا ہے۔ بولنے میں لب و لہجہ اور آواز کے اتار چڑھاؤ سے مفہوم کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے، لیکن تحریر میں تو یہ کام اندازِ بیان ہی سے لیا جا سکتا ہے

فارسی میں خدا جانے کتنے غزل گو شعرا گزر چکے ہیں، لیکن جذباتِ محبت کو پوری صداقت و سادگی کے ساتھ بیان کرنے میں سعدی کی انفرادیت اپنی جگہ قائم ہے۔ یہی حال اردو میں میر کا ہے۔ پھر یہ کرشمہ اندازِ بیان کا نہیں تو کس بات کا ہے؟

مومن کا رشک آمیز سوز، غالب کا شوخ و ذہین تعشق، خواجہ میر درد کی والہانہ [illegible]گی، ان سب کی تفریق اندازِ بیان ہی سے تو ہوتی ہے ورنہ یوں کون سا ذریعہ تعیین و امتیاز کا ہے —— اسی لئے میں نے کہا کہ ایک نقاد کا مختلف "اسالیبِ بیان" سے آگاہ ہونا اور اُن کو دیکھ کر شاعر کے جذبات پر حکم لگانے کی اہلیت رکھنا ازبس ضروری ہے

مشہور شعر ہے:۔

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

کتنا پیارا شعر ہے، لیکن اس کو صرف نقاد ہی سمجھ سکتا ہے کہ پہلا مصرعہ صرف مطلع بنانے کے لئے لکھا گیا ہے ورنہ صحیح رنگِ تغزل کا اقتضا کچھ اور تھا

آپ کسی کے سامنے صرف دوسرا مصرعہ پڑھئے تو وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوگا کہ شاعر نے اس میں اپنے محبوب کا ذکر کیا ہے جو اسی دنیا سے متعلق ہے۔ لیکن جب آپ پورا شعر پڑھیں گے تو اس کا خیال دوسری طرف منتقل ہو جائے گا۔ اور دوسرے مصرع کا خطاب جو پہلے اس نے سمجھا تھا۔ اب بالکل بدلا ہوا نظر آئے گا۔ کیونکہ دنیاوی محبوب کا تعلق نہ کون و مکان سے ہے۔ اور نہ کاروبارِ محبت میں اس کے ذکر کی ضرورت —— اس لئے یہ شعر تو اپنی جگہ مکمل ہے لیکن اس رنگ سے ہٹا ہوا ہے۔ جو دوسرے مصرعہ کا اقتضا تھا۔ اور یہ فرق پیدا کر دیا صرف لفظ جلوہ اور کون و مکان نے اگر پہلے مصرعہ سے کچھ اس طرح کا مفہوم پیدا ہوتا کہ

وہ میری روح میں ہیں، نظر میں ہیں، دل میں ہیں
یا —— دل میں بسے ہوئے ہیں، نظر میں بسے ہوئے
یا —— اپنی نگاہِ شوق پہ ہے مجھ کو اعتماد

تو یہ شعر حدودِ تغزل میں رہتا گو اعلیٰ معیار کا پھر بھی نہ ہوتا۔ کیونکہ دوسرے مصرعہ کے انداز بیان میں جو انانیت وطنز پنہاں ہے وہ شعر کو بلندی کی طرف سے پستی کی طرف کھینچ رہا ہے

تقریباً اسی مفہوم کا ایک شعر عربی کا یاد آگیا، دیکھئے اسی جذبہ کو کس والہانہ انداز سے ظاہر کیا ہے:۔

جمالکَ فی عینی وحبُّکَ فی قلبی

وذکرُکَ فی فمی فاین تغیب

یعنی ــــ اے تو وہ کہ تیری صورت آنکھوں میں بسی ہوئی ہے، تیری محبت دل میں سمائی ہوئی اور تیرا ذکر ہر وقت زبان پر ہے تو کہاں مجھ سے چھپ کر رہ سکتا ہے

اب غور کیجئے کہ انداز بیان نے اسی مفہوم کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ سور داس کے اس دوہے کو دیکھئے:۔

ہاتھ چھڑائے جات ہو نبل جان کے موئے

ہردے میں سے جاؤگے تو مرد بدونگی توئے

یعنی ــــ مجھے کمزور جان کر زبردستی ہاتھ چھڑا کے چلے جارہے ہو لیکن میرے دل سے نکل جاؤ تو جانوں کہ بڑے مرد ہو۔ ہر چند اس میں بھی ہلکی سی کیفیت طنز کی ہے لیکن انداز بیان نے اس میں بھی خاص فنا دگی پیدا کردی ہے

بہرحال میری رائے تو یہی ہے کہ شاعری میں اصل چیز انداز بیان ہے۔ اگر آپ کے نزدیک بلندی مضمون کوئی اور چیز ہے اور سب سے زیادہ اہمیت وہی رکھتی ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں، کیا کر سکتا ہوں، جبکہ اس زمانہ میں غزل کا معیار تصوف وفلسفہ طرازی کے بہانہ سے صرف مہمل گوئی قرار پا گیا ہے

نیاز

بیدل ! ہائے بیدل ! وائے بیدل !! آپ نے بھی کیا ذکر چھیڑ دیا۔ اس کمبخت میں فارسیت ہو یا نہ ہو، لطفِ زبان پایا جائے یا نہ پایا جائے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ تخیل کا بادشاہ ہے، ندرتِ بیان کا خدا ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ ایک رند ژولیدہ مو ہے، جو لفظ اس کے منہ سے نکلتا ہے وہ دل میں تیر وسناں کی طرح پیوست ہو جاتا ہے

ہر کجا نکہت گل پیرہن رنگ درد ؛

نیست پوشیدہ کہ از خود سفرے میخواہد

پھول کو "پیرہنِ رنگ" کہنا اور نکہت کو گل کی "جامہ دری" حسن تعبیر کی وہ حد ہے جہاں نہ نظیری کی رسائی ہے نہ حافظ کی اور "از خود سفرے می خواہد" تو وہ انداز بیان ہے جسے بہت سے ناواقف صرف مغربی لٹریچر کی خصوصیت سمجھے ہوئے ہیں

بکات وچہار عناصر پرکیا موقوف ہے، اس کا تو ایک ایک لفظ حرزِ جاں بنانے کے قابل ہے۔ مثنویاں دیکھئے، رقعات کا مطالعہ کیجئے، قطعات و رباعیات پر سر دُھنئے، لیکن زبان نہ کھولئے، کون سمجھتا ہے اور کسے سمجھنے کا ہوش ہے۔ وہ خود کہ گیا ہے کہ

چہ رسد ز نشۂ معنوی بہ دماغِ بے حس و بے خبر
ز پری پیامے اگر کشی بہ دُکانِ شیشہ گراں مبر

نیاز

بندہ نواز،

شکر ہے آپ نے مجھے پوچھا، لیکن اُس وقت جب

شایانِ دست و بازو قاتل نہیں رہا

پھر تماشہ یہ ہے کہ اگر میری طرف سے "اعتراف" میں کمی ہوگی تو آپ مجھی کو موردِ الزام قرار دیں گے، آجا

کمند کوتہ و بازوئے سست و بام بلند
بمن حوالہ و نومیدیم گنہ گیسرند

واقعہ یہ ہے کہ میں اب کسی قابل نہیں رہا۔ "بندۂ بگریختہ" نہیں بلکہ "بندۂ معذور" جان کر میرے پاؤں کی زنجیر کاٹ دیجئے۔ اربابِ کرم کا یہی شیوہ ہے۔ ورنہ یوں مجھے امتثالِ امر میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ حاضر ہوں گا اور سر کے بل حاضر ہوں گا، لیکن ڈرتا ہوں کہ مبادا میری وجہ سے آپ کی محفلِ نشاط میں افسردگی پیدا ہو اور ایک داغِ ناکامی اور لے کر وہاں سے واپس ہوں

نیاز

آپ بھی عجیب چیز ہیں —— پریشانیوں کی شکایت خدا سے کرتے ہیں جہاں تاثر و انفعال کا گزر ہی نہیں۔ ہر بدنصیب شخص اپنی جگہ یہی باور کرتا ہے کہ جو مصائب اس پر نازل ہوئے ہیں وہ انتہائی مصائب ہیں اور اُس سے زیادہ مظلوم دُنیا میں کوئی نہیں —— لیکن اسے کیا خبر کہ قدرت کے ترکش میں کیسے کیسے زہریلے تیر پنہاں ہیں اور وہ کس کس طرح اُن سے کام لیتی ہے —— درد و بیچارگی کی کوئی انتہائی صورت قیاس کر لو، لیکن واقعتاً اس سے بھی زیادہ الم انگیز صورتیں پیدا ہو چکی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ فطرت کا نظام ہی یہ ہے

مذہب کی تلقین اس باب میں صرف اس حد تک مفید ہے کہ انسان صبر و ضبط کا عادی ہو جاتا ہے۔ ورنہ دعا

واستجابتِ دعا معلوم ! تدبیر کے بن پڑنے کا نام "قبولِ دعا" ہے، اور جب کچھ نہیں بن پڑتی تو اہل مذاہب اس کو "مصلحتِ خداوندی" سے تعبیر کرتے ہیں، یہ سب الفاظ ہی الفاظ ہیں حقیقت کچھ نہیں ——
یقیناً آپ کی مایوسیاں اس طرح سے اور زیادہ بڑھ جائیں گی، لیکن کیا کروں۔ صبر و ضبط کی لایعنی تلقین میرے بس کی بات نہیں۔ میں کیوں وہ بات کہوں جسے کھلا ہوا فریب سمجھتا ہوں۔ مگر ہاں یہ ضرور عرض کروں گا کہ تدابیر سے غافل نہ رہیئے، دُنیا میں جب تک زندہ رہنا ہے اسی طرح مخالف قوتوں کا مُقابلہ کرنا پڑے گا، کبھی آپ کامیاب ہوجائیں گے اور کبھی مغلوب —— لیکن مغلوب ہوجانا ہتھیار ڈال دینا نہیں ہے، اس لئے ہاتھ پاؤں چلائے جائیے اور میرے کرنے کی جو بات ہو اس سے مطلع فرمائیے۔ محض غم و غصّہ بیکار بات ہے اور دعا اس سے زیادہ بیکار

نیاز

محترم
نامۂ گرامی ملا —— آج کل یہاں کا موسم خودکشی کی حد سے شاید ہی ایک آدھ ڈگری کم ہو۔ ظاہر ہے کہ نینی تال کے رہنے والے اس وقت بہشت میں ہیں۔ لیکن مجھ کافر کا وہاں گزر کیونکر ہو —— بہرحال جنت والوں کو میرا اسلام پہونچے اور حسرت نارسائی —— مضامین کا منتظر ہوں

نیاز

باب الانتقاد

اصغر کے سو شعر

دہلی کے مکتبۂ جامعہ نے ایک نیا اور نہایت دلچسپ سلسلہ مشاہیر شعراء کے انتخاب کلام کا شروع کیا ہے اس سلسلہ کے دو پمفلٹ جن میں اصغر و جگر کے سو سو شعر انتخاب کرکے درج کئے گئے ہیں۔ بغرض ریویو ہمیں موصول ہوئے ہیں۔ اور آج کی صحبت میں ہم اصغر کے انتخاب کلام پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:۔

انتخاب کرنے والے کوئی بزرگ محمود علی خاں صاحب ہیں اور جس اصول کو سامنے رکھ کر انتخاب کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق خود انتخاب کنندہ کے الفاظ یہ ہیں:۔

"اس مجموعہ میں حضرت اصغر کے ایک سو منتخب اشعار درج ہیں جو لطافت بیان، اور حکیمانہ مضامین سے مالامال ہیں، خصوصاً تصوف وحکمت، علم وعرفان، اسرار ومعارف، ذوق مشاہدہ، افشائے راز، جمال دوست، احساس خودی، اور حقایق نگاری وغیرہ کے چیدہ اشعار پیش کئے گئے ہیں۔ اور آخر میں الفاظ میں مصوری کے چند نمونے بھی درج کئے گئے ہیں"

قبل اس کے کہ اصغر کے کلام پر غور کیا جائے یہ امر ضروری ہے کہ انتخاب کنندہ کے اصولِ انتخاب کو سمجھ لیا جائے۔ اور نیز یہ کہ وہ اصول بجائے خود درست بھی ہے یا نہیں؟

غالباً اس جگہ یہ بحث موزوں نہ ہوگی کہ تغزل میں "تصوف وفلسفہ" کے شمول کی بدعت کب اور کیوں رائج ہوئی، لیکن اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ "تصوف وفلسفہ" جسے آج کل غزل گوئی کا معیار بلند سمجھا جاتا ہے حقیقتاً کیا چیز ہے ——— میں اگر انتخاب کنندہ سے یہ سوال کر بیٹھوں کہ حکیمانہ مضامین سے ان کی کیا مراد ہے، تصوف وحکمت کسے کہتے ہیں، علم وعرفان، اسرار ومعارف سے ان کا کیا مقصود ہے، ذوقِ مشاہدہ، افشاء راز اور احساس خودی کیا بلا ہے، تو وہ غالباً اس کا جواب نثر میں تو نہ دے سکیں گے، ممکن ہے کسی شاعر کا کوئی شعر پڑھ دیں گے کہ دیکھو یہ ہے حکمت

و تصوف وغیرہ

حقیقت یہ ہے کہ اس دَور کے شعرا اور اُن کے بعض ہوا خواہ ناقدین نے چند الفاظ یاد کرلئے ہیں۔ جو لغت کے اعتبار سے خواہ کچھ مفہوم رکھتے ہوں، لیکن غزل گوئی کی دنیا میں ان کا اصطلاحی مفہوم کوئی نہیں ہے، سوائے اس کے کہ سننے والا ان الفاظ سے مرعوب ہوکر شعر کی داد دینے پر مجبور ہو جائے

یقیناً "تصوف" کے کچھ مخصوص اعتقادات ہیں، بعض معین نظریے ہیں، اور اس میں بھی کلام نہیں کہ الٰہیات کی بعض گتھیوں کو جن میں سے سب سے زیادہ الجھی ہوئی چیز "خدا اور خدا کا مفہوم" ہے، اس نے بوجہ احسن سلجھایا ہے لیکن "غزل" سے ان باتوں کو کیا واسطہ۔ یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ جب اس حقیقت پر غور کیا جاتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا، یعنی اس غلطی کی ابتدا شاعروں کی طرف سے ہوئی یا صوفیوں کی طرف سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس باب میں شاعروں کا دامن آلودہ نہیں ہے بلکہ اس بدعت کے مخترع ہمارے اربابِ تصوف ہی ہیں

بزمِ سماع منعقد ہے، صاحبِ سجادہ مع تمام اُن ظواہر و علامات کے جو اظہارِ تقدس کے لئے ضروری ہیں۔ صدر میں جلوہ افروز ہیں، ارادتمندانِ نیایش کیش مؤدب سر جھکائے ہوئے بیٹھے ہیں، سامنے مزار پر زرکار چادریں جھلملا رہی ہیں، عُود و صندل کے بخور سے فضا معطر ہو رہی ہے۔ اور مطرب، بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے!

"سیہ چشمانِ کشمیری و ترکانِ سمرقندی" سامنے موجود ہیں، شراب اور مغبچوں کا ذکر دلوں میں گرمی پیدا کر رہا ہے، حافظ کی غزلیں گاگا کر زاہد کی پگڑی اچھالی جارہی ہے، روزہ و نماز کی توہین ہو رہی ہے، کعبہ و حرم پر بتکدہ و میخانہ کو ترجیح دی جارہی ہے، اور علی الاعلان کہا جارہا ہے کہ

از قول زاہد کردیم توبہ
وز فعل عابد استغفر اللہ

دعوتِ رقص و شراب کھلم کھلا دی جارہی ہے کہ

عید ست و موسم گل ساقی بیار بادہ
ہنگامِ گل کہ دیدہ ست بے مے قدح نہادہ

اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ تقدس مذہبی کو دفترِ بے معنی کہکر "غرقِ مئے ناب" کردینے کا مشورہ دیا جارہا ہے ——— پھر، مجلس میں اگر سواد ارادتمند ہیں تو دو چار سوچنے سمجھنے والے بھی ہیں۔ آپس میں سرگوشیاں ہوتی ہیں کہ زہد کی یہ تعلیم کیسی ہے کہ دین و مذہب ہی کو بُرا کہا جارہا ہے، اخلاق کا یہ کیسا درس ہے جس میں سوائے ساقی و شراب کے کسی چیز کا ذکر ہی نہیں ——— رفتہ رفتہ صاحبِ سجادہ کے کانوں تک بھی یہ بات پہونچی ہے اور پھر جو فلسفۂ "ہوئیت" مجھ

آتا ہے تو نوبت یہاں تک پہونچ جاتی ہے کہ "ساقی" خدا ہو جاتا ہے اور شراب یا کوثر "بتکدہ" دل قرار پاتا ہے جو مہبطِ انوارِ الٰہی ہے اور "معشوق" کا مسمّٰی وہ پیر کہن سال، جس کے ہاتھ پر بیعتِ توبہ وسلوک کی جاتی ہے

یہ ہیں حقایق و معارف اور اسرار و غوامض کے وہ مظالم جو غریب شاعری کی جانِ ناتواں پر اوّل اوّل توڑے گئے اور پھر رفتہ رفتہ یہ بدعت اس قدر عام ہوئی کہ محبت کی ایک قسم ہی علٰحدہ ہو گئی جسے "عشقِ حقیقی" کہتے ہیں اور ایک اچھے اور بلند شعر کا مفہوم سوائے اس کے کچھ نہیں رہ گیا کہ نہ خود شاعر سمجھ سکے۔ نہ کسی اور کو سمجھا سکے

حقیقتاً غزل نام ہے صرف جذباتِ محبت کو جو اسی دنیا اور اسی دنیا کے معشوق سے وابستہ ہو سکتے ہیں۔ نہایت صاف وسادہ زبان میں ادا کر دینا۔ پھر اس سے ہٹنے کے بعد ایک شعر، چاہے "کلام اللہ" ہو جائے لیکن تغزل تو اس میں رہتا نہیں

"عشقِ حقیقی" کیا ہے؟ اس کا فیصلہ کرنے کے لئے سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کیا ہے؟ اور ظاہر ہے کہ خدا کو شاعری سے کیا واسطہ؟ یا شاعری کو خدا سے کیا تعلق؟

محبت نام ہے اس خاص کیفیت کا جو گوشت و پوست کی زندگی میں کسی تعلق خاطر کی بناء پر پیدا ہوتی ہے اور اس کیفیت کا اظہار غزل ہے۔ پھر ممکن ہے کہ ایک صوفی جو اخلاق و مذہب کی آڑ میں شکار کرنا چاہتا ہے وہ اس کو پسند نہ کرے اور کسی ایسی تاویل پر مجبور ہو جائے۔ جو اس کے تقدس کا بھرم رکھنے والی ہو، لیکن شاعر کو کیا غرض کہ وہ اس کی رعایت سے اپنی زبان بدل دے ـــــ پھر حافظ اور اس کے بعد بھی کچھ اور شاعر ایسے نظر آتے ہیں۔ جنھوں نے اپنے منصب کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور کھلم کھلا وہی کہتے رہے جو انھیں کہنا تھا۔ خواہ ایک صوفی کا دماغ تاویلیں کرتے کرتے بیکار ہی کیوں نہ ہو جائے، لیکن بعد کو جب مسلمانوں میں قوتِ عمل اور زیادہ ضعیف ہو گئی، عام قومی انحطاط نے فکر صحیح سے ان کے دماغوں کو بیگانہ کر دیا اور جہل ولاعلمی نے خانقاہوں کی گرم بازاری کو تقویت پہونچائی، تو شاعر بھی اپنی منزل سے نیچے اتر آیا، اس نے بھی اپنی زبان بدل دی اور آخر کار اس نے وہ الفاظ بھی ترک کر دئے جن کی تاویل کی ضرورت ہوا کرتی تھی۔ یعنی اب وہ بھی عشقِ حقیقی کے چکر میں آگیا اور تصوف کی اُن بہت سی اصطلاحوں کو جن کا کوئی حقیقی مفہوم نہیں ہے، وہ اپنی شاعری میں صرف کرنے لگا ـــــ خیر پہلے تو ایک صوفی کسی غزل کی تاویل کرکے اپنے رنگ میں اسے کھینچ لاتا تھا، لیکن اب ایک عاشق کے لئے یہ تاویل بھی ممکن نہیں رہی۔ کیونکہ جب تک خدا کو ساقی کے نام سے پکارا جاتا تھا، رند کے لئے یہ موقع تھا کہ وہ فضول آوازوں کی طرف سے اپنے کان بند کرکے ساقی کو ساقی ہی سمجھے، لیکن جب ساقی کو بھی خدا کہا جانے لگا تو ظاہر ہے کہ "رندِ بے نوش" سوائے جان دیدینے کے اور کیا کر سکتا تھا

تصوف یا تصوف کی شاعری میں جن چیزوں کو اسرار و معارف، علم و عرفان وغیرہ بہت سے مہمل ناموں سے یاد کیا جاتا ہے وہ صرف دو نظریوں میں محدود ہیں۔ ایک یہ کہ خدا ہر جگہ اور ہر چیز میں ساری وطاری ہے اور دوسری

یہ کہ اس کی کُنہِ حقیقت دریافت کرنے سے انسان عاجز ہے ——— ظاہر ہے کہ یہ نظریے کسی "علم قطعی" (Science) سے تو تعلق رکھ نہیں سکتے، کیونکہ ان دو نظریوں میں سے ایک میں خود ہی جہل و عجز کا اعتراف ہے اور دوسرا جسے نظریۂ "ہوتیت" یا "وحدۃ الوجود" کہتے ہیں ایک ایسی تعبیر ہے جسے ایک خیال پرست شخص تو مان سکتا ہے لیکن علم کو درجۂ یقین تک پہونچانے والوں کے لئے اس میں زیادہ سامان دلچسپی موجود نہیں ——— پھر جب تصوف کی بنیاد ہی ایسے مجہول نظریوں پر قائم ہے تو اس میں اسرار دغوامض یا علوم و معارف کیا ہو سکتے ہیں، اور ایک شاعر اُن کے اظہار میں وہ کونسی بات پیدا کر سکتا ہے جو جوش و ولولہ کی حامل ہو

اس نوع کے شاعروں میں سب سے بلند مرتبہ بیدلؔ کا ہے اور اس میں کلام نہیں کہ اس نے اپنی ساری زندگی اسی عالم حیرت و استعجاب میں بسر کر دی جو فلسفۂ "ہوتیت" نے اس پر طاری کر دیا تھا، لیکن کیا اس کی قدر غزل گوئی کے لحاظ سے کی جاتی ہے، کیا وہ اپنے رنگِ تغزل کی وجہ سے کامیاب شاعر کہلایا جاتا ہے ؟ ہرگز نہیں اس کی کامیابی کا راز صرف اس کا اندازِ بیان، تنوع تعبیرات، اور علوئے تخیل ہے، جو انسان کی قوتِ متخیلہ کو مسحور کر کے رکھ دیتا ہے۔ لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ علاوہ بیدلؔ کے اس وقت تک کوئی دوسرا شاعر اس رنگ کا پیدا ہوا ہے ؟ ——— اس نے غزل گوئی ترک کر کے جس شاعری کی بنیاد ڈالی، اس کے لئے اس نے ایک زبان بھی علیحدہ وضع کر دی اور یہ وہ خصوصیت تھی جس نے اس کو ایک مخترع و مُبدع کی حیثیت سے دنیا میں پیش کیا اور اس اختراع و ابداع کو وہ اپنے ہی ساتھ لے گیا ——— دوسرا راز بیدلؔ کی کامیابی کا یہ تھا کہ وہ فارسی زبان میں شاعری کرتا تھا جو اُردو کے مقابلہ میں زیادہ وسیع، زیادہ لطیف و شیریں اور زیادہ ایجاز کی گنجائش رکھتی ہے۔ اس لئے اُردو میں اگر اس کا تتبع کیا بھی جائے تو کامیابی ممکن نہیں کیونکہ اول تو بلند سے بلند خیال کوئی ایسا نہیں جو بیدلؔ کی دسترس سے باہر رہا ہو اور دوسرے یہ کہ اُردو میں الفاظ کی کمی اور حروف روابط کی زیادتی نے اس کو محال بنا دیا ہے

بہرحال اُردو میں غزل کو تصوف و حکمت سے گرانبار کرنے کی رسم فارسی سے آئی ہے اور آنی چاہیئے تھی، کیونکہ اُردو شاعری یکسر فارسی کی نقل ہے جس میں مسلمانوں نے کبھی کوئی مقامی رنگ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ مسلمانوں کی یہ ملعون ذہنیت کہ وہ ہندوستان میں ایک اجنبی فاتح کی حیثیت سے آئے اور کفرستان ہند سے اپنے آپ کو منسوب کرنا اُن کی توہین ہے۔ کب اُن کو یہاں کی شاعری کا تتبع کرنے کی اجازت دے سکتی تھی۔ اور وہ کیوں بلبل کو چھوڑ کر کوئل اور پپیہا کی طرف آ سکتے تھے، اسی طرح چونکہ ایرانی امردپرستانہ شاعری حلقۂ زہد و اتقا میں قدم قدم پر تاویلوں کی محتاج تھی، اس لئے اُردو میں بھی وہی رنگ پیدا ہو گیا۔ اور "عشقِ حقیقی" والی لغو و مہمل ذہنیت یہاں کے شاعروں میں بھی پیدا ہو گئی جس کو اسرار و معارف اور فلسفہ و حکمت کا خزینہ بنایا جاتا ہے

اگر تھوڑی دیر کے لئے اس کو تسلیم کر لیا جائے کہ تصوف نے جو تصورِ خدا (Conception of God

پیش کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے اور انسان عجز و نارسائی اور حیرت و استعجاب کے اعتراف کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتا، تو بھی خدا را کوئی بتلائے کہ اس میں عشق و محبت کی کون سی بات ہے اور خدا سے عشق کرنا کیا معنی ؟ اسی سلسلہ میں نعت گوئی کا بھی رواج پیدا ہوا یعنی عشق حقیقی میں خدا کے ساتھ رسول کو بھی شامل کرلیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غزل گوئی بد سے بدتر ہوگئی، کیونکہ جب تک محض خدا کا معاملہ تھا، انسانی تشبیہات و استعارات لامحالہ تاویل طلب تھیں، اور ذہن دنیاوی معاملات محبت کی طرف منتقل نہ ہوسکتا تھا، لیکن رسول کے شامل ہوجانے سے جو فی الحقیقت ایک انسان تھے، ان خیالات نے اور زیادہ رکیک صورت اختیار کرلی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ رسول اللہ کی کھلم کھلا توہین ہونے لگی۔ کیونکہ انھیں الفاظ کو جو دنیاوی حسن و عشق کے لئے معمولاً استعمال کئے جاتے ہیں۔ رسول اللہ کی ذات گرامی کے ساتھ منسوب کیا گیا اور اس کی رکاکت و سخافت ظاہر ہے ——— میں یہ نہیں کہتا کہ ہر شاعر کی نعت گوئی کا معیار اتنا ہی پست و ذلیل تھا۔ لیکن بلند معیار والوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ ان کا ذکر کرنا ہی فضول ہے۔

اب یہاں دو اعتراض ہوسکتے ہیں ایک یہ کہ اگر عشق حقیقی کو اڑا دیا جائے تو جذبات میں بلندی و پاکیزگی کیونکر پیدا ہوسکتی ہے اور دوسرے یہ کہ اگر علاوہ جذبات محبت کے شعر میں دیگر تاثرات کا اظہار کیا جائے تو اس میں حرج ہی کیا ہے اور اس کو شعر کیوں نہ کہا جائے ؟

پہلا اعتراض بالکل مہمل ہے، کیونکہ جذبات کی بلندی اس پر منحصر نہیں ہے کہ وہ کس سے وابستہ ہیں بلکہ اس پر منحصر ہے کہ وہ کیا ہیں۔ اگر عشق حقیقی کرنے کے بعد بھی کوئی شخص رکیک الفاظ میں رکیک جذبات کے اظہار پر آمادہ ہوجائے تو اُسے کون باز رکھ سکتا ہے اور اگر عشق مجازی کے بعد کوئی شخص پست خیالات سے علیحدہ رہے تو اس میں کونسا استحالۂ عقلی ہے ——— اصل چیز جو بلندی و پستی پیدا کرنے والی ہے وہ شاعر کی ذہنیت ہے۔ اگر اس کی ذہنیت بلند نہیں ہے تو اس کا عشق حقیقی بھی بیکار ہے اور اگر اس کی ذہنیت واقعی بلند ہے تو وہ گوشت و خون کے جذبات میں بھی پاکیزگی کا رنگ پیدا کرسکتا ہے، جیسا کہ اُردو کے بعض مشہور اساتذۂ شعر کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے

رہ گیا دوسرا اعتراض۔ سو میں کبھی اس پر مُصر نہیں کہ علاوہ جذبۂ محبت کے کسی اور تاثر یا حقیقت کا اظہار شعر میں نہ ہونا چاہیئے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس کو غزل کیوں کہا جائے۔ مثنویاں لکھئے، قطعات لکھئے، رُباعیات لکھئے، قصائد و دیگر منظومات میں طبع آزمائی کیجئے کون روکتا ہے، لیکن غزل کو صرف عشق و محبت کے لئے مخصوص رہنے دیجئے اور اس غریب کو کھینچ کر "قاب قوسین" کی حد تک نہ لے جائیے جہاں قال کی نہیں بلکہ صرف حال کی ضرورت ہے

غزل نام ہے صرف اُن جذبات و تاثرات کے اظہار کا جو دنیاوی عشق و محبت میں قلب انسانی کے اندر پیدا ہوتے ہیں اور اظہار بھی اسقدر سادگی کے ساتھ کہ بغیر کسی کاوش و تاویل کے ذہن سامع پر چھا جائے۔ اگر یہ جذبات ذلیل و ردی ہوں گے مثلاً "مِنی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں" یا ——— "دو بوسے لوں گا جانِ من ایک اسطرف ایک اسطرف"

تو یقیناً ہم اسے تغزل کی توہین کہیں گے اور اگر اندازِ بیان کے لحاظ سے وہ " رخنۂ ہر شمع خار کسوتِ فانوس " ہے تو بھی یقیناً اسے تغزل سے خارج سمجھنا پڑے گا۔

پھر چونکہ کاروبارِ محبّت میں نہ تاثرات کی کوئی انتہا ہے نہ اندازِ بیان کے تنوع کی ، اس لئے استعارات و تشبیہات ، کنایات و محاکات وغیرہ کے امتزاج سے ایک نہایت وسیع میدان شاعر کے سامنے آجاتا ہے جس میں وہ اپنے تخیل و تخییل دونوں سے مدد لے کر بہت کچھ جولانیاں دکھا سکتا ہے اور وہ قطعاً ان تمام مفروضہ اسرار و معارف کے اظہار پر مجبور نہیں جنھیں اربابِ تصوف کے تاویلی عشقِ حقیقی سے منسوب کیا جاتا ہے

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا وہ صرف اس تحریر سے متاثر ہو کر لکھا گیا جو محمود علی خاں صاحب نے اپنے دیباچہ میں " تصوف و حکمت " کے متعلق درج کی ہے اور جسے اپنے پندار میں نہایت بلند معیارِ تغزل سمجھ کر اصغر کے کلام کو اس پر منطبق کرنا چاہا ہے

ہر چند جس معیار کو قائم رکھ کر انتخاب کنندہ نے یہ مجموعہ پیش کیا ہے وہ اس قدر تمہید کے بعد محتاج تنقید باقی نہیں رہتا کیونکہ اگر واقعی اصغر کے ایسے ہی اشعار انھوں نے چُنے ہیں جن میں سوائے متصوفانہ اسرار و معارف کے اور کچھ نہیں تو میں اپنی رائے اُن کے متعلق ظاہر کر چکا ، لیکن اگر انتخاب کنندہ نے غلطی سے انھیں ایسا سمجھ لیا ہے تو بیشک دیکھنے اور سمجھنے کی گنجایش باقی ہے ـــــــ اس لئے آئیے ایک نگاہ اس پر بھی ڈال لیں ـــــــ

اصغر کا کلام میں اس سے قبل بھی بارہا دیکھ چکا ہوں اور اُن کے بعض اشعار سے کافی متاثر ہوا ہوں۔ اس لئے بغیر اس انتخاب کو دیکھے ہوئے بھی اُن کی شاعری کے متعلق رائے زنی کا مستحق اپنے آپ کو سمجھوں تو غلط نہ ہوگا ـــــــ تاہم میں اس کو کسی اور صحبت پر ملتوی رکھتے ہوئے صرف اس مجموعہ پر تنقید کرنا چاہتا ہوں جو جامعہ ملیہ نے اس غرض سے میرے پاس بھیجا ہے

اس میں کلام نہیں کہ اصغر آجکل کے مبتذل گو شعراء سے بالکل علیحدہ رنگ رکھتے ہیں اور وہ ہمیشہ کوئی ایسی بات کہنا چاہتے ہیں۔ جو انسان کو غور و تامل کی طرف مایل کر دے۔ لیکن کہیں وہ اس کوشش میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اور کہیں نہیں بعض بعض اشعار میں وہ اپنے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ایسے الفاظ پا گئے ہیں جو ذہن سامع کو جلد کسی نتیجۂ صریح کی طرف لے آتے ہیں اور بعض میں ان کو کامیابی نہیں ہوئی ، خواہ یہ ناکامی خود اپنے جذبہ کے نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے ہوئی ہو یا مناسب الفاظ فراہم نہ ہو سکنے سے ۔ مثلاً اُن کا ایک شعر ہے :۔

قفس کی یاد میں یہ اضطرابِ دل معاذ اللہ
کہ میں نے توڑ کر ایک ایک شاخِ آشیاں رکھدی

اس میں شاعر صرف اس جذبہ کو ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ محبّت کی اسیری پر دنیا کا ہر اطمینان و سکون قربان کر دینے کے قابل ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس مفہوم کو انھوں نے نہایت خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے اور سننے والے کا ذہن بغیر کسی انتشار و خلش

۔ ادخود اس نتیجہ تک پہونچ جاتا ہے۔ لیکن برخلاف اس کے اسی غزل کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو:۔

مٹی جاتی تھی بلبل جلوۂ گل ہائے رنگیں پر
چھپا کر کس نے اِن پردوں میں برق آشیاں رکھدی

اس شعر کے سننے کے بعد ایک شخص یہ تو جان لیتا ہے کہ اس میں بلبل - گلہائے رنگیں - برقِ آشیاں تین لفظ ایسے جمع دیے گئے ہیں - جن کا باہمی شاعرانہ تعلق مخفی نہیں، لیکن شاعر کا مقصود کیا ہے ؟ اس کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا ـــ اس عر میں سب سے زیادہ ابہام جس سے پیدا ہوا ہے وہ " مٹی جاتی تھی " کے الفاظ ہیں ـــ ہر شخص ان الفاظ کو سننے ے بعد یہ سمجھے گا کہ شاعر نے یہ الفاظ کہکر گویا بلبل پر کوئی طعن کیا ہے۔ اور اس لئے اس شعر کا مفہوم کچھ اس طرح کا ہونا چاہئے " اے بلبل تو بہت گلہائے رنگیں کے جلووں پر مٹی جاتی تھی، لیکن دیکھ اس کا نتیجہ کیا ہوا " مگر پورا شعر پڑھنے ے بعد کوئی مفہوم اس قسم کا پیدا نہیں ہوتا ـــ شاعر کا مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ " بلبل کے مٹنے اور فنا ہونے کے لئے تو ں رنگیں کے جلوے ہی کافی تھے، برق آشیاں کی کیا ضرورت تھی " لیکن افسوس ہے کہ الفاظ مناسب نہیں ملے اور یہ مفہوم شنہ رہ گیا - اگر پہلا مصرعہ یوں ہوتا :۔

" یونہی مٹ جاتی بلبل جلوۂ گلہائے رنگیں پر "

تو مفہوم ادا ہو جاتا ـــ گو گلہائے رنگیں کے پردوں میں برق آشیاں کا پایا جانا پھر بھی محتاج تفصیل رہ جاتا
ایک دوسری غزل کا شعر ہے :۔

مجھی سے بگڑے رہتے ہیں مجھی پر ہے عتاب اُن کا
ادائیں چھپ نہیں سکتیں نوازشہائے پنہاں کی

تو مضمون پامال ہے لیکن صحیح تغزل کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ اور انداز بیان نے اچھوتا پن پیدا کر دیا ہے۔ مگر اسی غزل کا دوسرا شعر یہ ملاحظہ فرمائیے :۔

نگاہِ یاس و آہ عاشقان و نالۂ بلبل:
معاذ اللہ کتنی صورتیں ہیں اُنکے پیکاں کی

بندش کی کمزوری اور الفاظ کی ناموزونی نے سارا لطف خاک میں ملا دیا ـــ ہر چند اس شعر کا مفہوم الجھا ہوا نہیں ہے۔ لیکن تفسیر و تعبیر ناقص ہے، پہلے مصرعہ میں تین چیزیں پیش کی گئی ہیں ـــ نگاہِ یاس - آہِ عاشقاں - نالۂ بلبل ـــ اوّل تو ہر ٹکڑے کے بعد حرفِ عطف کا اظہار ناگوار ہے خاص کر " آہِ عاشقاں " کے بعد کہ پڑھنے میں آہ عاشقانو ادا ہوتا ہے جو مصرعہ کو فصاحت سے گرا دیتا ہے - علاوہ اس کے تینوں ٹکڑے برابر کے نہیں ہیں کیونکہ یاس ایک کیفیت کا نام ہے جو بالکل غیر مادی چیز ہے۔ اور عاشق و بلبل دو مجسم دھری چیزیں ہیں، علاوہ اس کے عاشق کے ذکر کے بعد

بلبل کا ذکر کرنا۔ کوئی خاص مفہوم نہیں رکھتا کیونکہ عاشق کے تحت میں وہ بھی آجاتی ہے اور اگر بلبل کا ذکر صرف اس لئے کیا گیا کہ عشق کی کارفرمائی انسان و حیوان دونوں پر ظاہر ہو جائے تو پھر نگاہِ یاس کا ٹکڑا علیحدہ ہو جاتا ہے۔ اگر پہلا مصرعہ بدل کر شعر یوں ہو جاتا :-

نگاہِ یاس، دردِ نامرادی، رنجِ محرومی
معاذاللہ کتنی صورتیں ہیں اُنکے پیکاں کی

تو حروفِ عطف کا عیب بھی نکل جاتا اور تینوں ٹکڑے بھی محض "کیفیت" سے متعلق ہو کر برابر کے ہو جاتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس صورت میں حقیقتاً تینوں چیز ایک ہی قرار پاتی ہیں تو یہی اعتراض اُس مصرعہ پر بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ نگاہِ یاس اور آہ و نالہ بھی فی الحقیقت ایک ہی کیفیت کی مختلف صورتیں ہیں

بعض اشعار میں صرف ایک ایک لفظ نے تعبیر کو ناقص کر دیا ہے مثلاً

عارضِ نازک پہ اُن کے رنگ سا کچھ آگیا
اِن گلوں کو چھیڑ کر ہم نے گلستاں کر دیا

دوسرے مصرعہ میں یہ دعوےٰ کیا گیا ہے کہ گلوں کو گلستاں کر دیا یعنی ان کی رنگینی کو اتنا بڑھا دیا کہ پھول گلستاں ہو کر رہ گئے، لیکن پہلے مصرعہ میں اس فراوانی کو "رنگ سا کچھ آگیا" سے ظاہر کیا گیا ہے جو بجائے فراوانی کے "قلت" کو ظاہر کر رہے ہیں۔ اس لئے اگر پہلا مصرعہ یوں ہوتا :-

عارضِ نازک پہ اُن کے رنگ ہی رنگ آگیا
عارضِ نازک پر اُن کے رنگ سا رنگ آگیا!

تو عیب دور ہو جاتا

ایک اور شعر میں اسی طرح کی فرو گزاشت پائی جاتی ہے۔ لکھتے ہیں :-

بکھری ہوئی ہو زلف بھی اس چشمِ مست پر
ہلکا سا ابر بھی سرِ میخانہ دیکھئے

دوسرے مصرعہ میں "ہلکا سا" لکھا گیا ہے جسکی رعایت پہلے مصرعہ میں موجود نہیں۔ اگر پہلا مصرعہ یوں ہوتا :-

بکھری ہوئی سی زلف بھی ہو چشمِ مست پر

تو ہلکے سے ابر کا مقابلہ ٹھیک ہو جاتا ـــــ بعض بعض شعروں میں ہلکی سی جھلک لکھنوی رنگ کی بھی پائی جاتی ہے مثلاً

داستاں اُن کی اداؤں کی ہے رنگیں لیکن
اس میں کچھ خونِ تمنا بھی ہے شامل میرا

اداؤں کا عاشق کے خونِ تمنا سے رنگین نظر آنا بالکل لکھنوی قسم کا شاعرانہ ادعا ہے۔ علاوہ اس کے دوسرا نقص یہ ہے کہ اگر دوسرے مصرعہ میں اس کا اشارہ داستان کی طرف ہو (اور یقیناً یہی ہے) تو داستان میں خون تمنا شامل ہونا کیا معنی ؟ ذکرِ خون تمنا ہونا چاہئے

ایک اور شعر ہے :-

کس قدر پُرکیف ہے ٹوٹے ہوئے دل کی صدا
اصلِ نغمہ ایک آوازِ شکستِ ساز ہے

پہلے مصرعہ میں جو دعوے کیا گیا ہے اس کا ثبوت دوسرے مصرعہ میں مفقود ہے۔ تاوقتیکہ شکستِ ساز کی آواز کو اصل نغمہ نہ ثابت کر دیا جائے، ٹوٹے ہوئے دل کی صدا کو پُرکیف نہیں کہہ سکتے ——— اور اگر دوسرے مصرعہ کا ثبوت پہلے مصرعہ میں ہے تو ان کی ترتیب بدلنی چاہئے تھی

الغرض اس قسم کی غلطیاں جابجا اصغر کے کلام میں پائی جاتی ہیں، لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ اُن کے شاعر ہونے سے انکار کر دیا جائے۔ بعض بعض شعر وہ قیامت کے لکھ گئے ہیں مثلاً

شاید مرے سوا کوئی اس کو سمجھ سکے
وہ ربطِ خاص رنجشِ بیجا کہیں جسے
میرے فغانِ درد پہ اس سرو ناز کو
ایسا سکوت ہے کہ تقاضا کہیں جسے

میں کیا کہوں کہاں ہے محبت کہاں نہیں رگ رگ میں دوڑی پھرتی ہے نشتر لئے ہوئے

ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

گر کوتاہیِ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

گر چونکہ انتخاب کنندہ کا معیارِ انتخاب صحیح رنگِ تغزل سے ہٹا ہوا ہے اسلئے اس مجموعہ میں ایسے اشعار کم ہیں۔ کیا اچھا ہوتا اگر یہ خدمت کسی ایسے کے سپرد کی جاتی جو تصوف و حکمت اور اسرار و معارف کا دلدادہ تو نہ ہوتا۔ لیکن محبت کرنا جانتا اور محبت کی کیفیتیں اس پر گزری ہوتیں۔ یہ مجموعہ مہر میں مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی سے مل سکتا ہے۔

(ماہ آئندہ ہم جگر کے سو شعر پر اظہار رائے کریں گے) ———

باب المراسلۃ والمناظرہ

(جناب سید عبدالحکیم صاحب۔ گجرات)

میں بہت ابتداء سے رسالہ نگار کا مطالعہ کر رہا ہوں اور اُن تمام تغیرات کو بھی طرح محسوس کرتا ہوں، جو آہستہ آہستہ آپ کے مذہبی خیالات میں پیدا ہوئے ہیں۔ ہر چندیکہ ایک قسم کی آزادی تو آپ میں شروع ہی سے پائی جاتی ہے لیکن اب زیادہ شدت ہو گئی ہے، جس کا سبب میں معلوم کرنا چاہتا ہوں

(نگار) آپ کے مراسلہ کو اصولاً باب الاستفسار میں جگہ پانا چاہئے، لیکن صرف اس خیال سے کہ اس کا تعلق زیادہ تر میری ذات سے ہے۔ اور جواب میں کسی خاص علمی یا ادبی مسئلہ پر گفتگو کرنا نہیں، باب المراسلہ میں درج کرتا ہوں

آپ کا یہ خیال یا نتیجۂ مُطالعہ بالکل صحیح ہے کہ میرے مذہبی خیالات میں رفتہ رفتہ تغیر پیدا ہوا ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ اب اس تغیر نے ایسی کھُلی ہوئی علیحدہ صورت اختیار کر لی ہے کہ بعض حضرات اس کو کفر و ارتداد سے تعبیر کرنے لگے ہیں۔ لیکن آپ اجازت دیں تو عرض کروں کہ ابتداء اجراءِ نگار سے تا ایندم کبھی ایک لمحہ بھی مجھ پر ایسا نہیں گزرا کہ میں نے اپنے خیال کے مطابق حق و صداقت سے دیدہ و دانستہ اِبا کیا ہو یا میری نیت خدمتِ اسلام کے علاوہ کچھ اور رہی ہو ——— البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ پہلے میں اسلام کے مفہوم کو زیادہ محدود سمجھتا تھا۔ اور قدرے متعصب تھا، لیکن اب اس کو زیادہ وسیع سمجھتا ہوں اور کیش و مسلک کے امتیاز سے گزر گیا ہوں

هم کعبه و هم بتکده سنگ ره ما بود
رفتیم و صنم بر سرِ محراب شکستیم

اس میں شک نہیں کہ میں ایک مسلمان خاندان میں پیدا ہوا اور نہایت سخت مذہبی ماحول میں میری تعلیم و تربیت ہوئی اور یہ بھی واقعہ ہے کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کافی زمانہ اسی تقشف و تعصب میں بسر ہوا جس پر آج بھی ہر مولوی

فخر کر سکتا ہے، لیکن اب اس کو عقل و ضمیر کی رہنمائی کہئے یا طاغوتی کارفرمائی کہ مذاہب عالم کی تاریخ، حکومتوں کی داستان فتح و ظفر، اور اسی کے ساتھ طبیعیات و فلکیات کے مطالعہ نے ایک عجیب انقلاب ذہن میں پیدا کیا۔ اور سب سے پہلا حجاب دُور ہونے کے بعد جو منزل سامنے آئی وہ "ماعرفناک حق معرفتک" کی تھی

پہلے میں یقین رکھتا تھا کہ خدا ایک مستبد و جبار ہستی ہے جو سوائے مسلمانوں کے کسی اور کو نجات دینے والی نہیں، وہ ہمارے دنیاوی سلاطین ہی کی طرح ایک قہرمانی قوت ہے جو سزا و عطا کے لحاظ سے مسئول نہیں ہو سکتی اور جو ہماری عبادت سے (بشرطِ آنکہ اسلامی طریقہ سے ادا کی جائے) خوش ہوتی ہے اور ترکِ عبادت سے برہم ———

لیکن جوں جوں کائنات کا مطالعہ وسیع ہوتا گیا، علم و عقل کی نارسائیاں واضح ہونے لگیں اور مسلمانوں کی اس تنگ ذہنیت کو رفتہ رفتہ میں خدا کی توہین سمجھنے لگا۔ یقیناً دیگر مذاہب بھی اس عصبیت میں مبتلا ہیں لیکن ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے کم از کم اسلام کو میں اس داغ سے پاک دیکھنا چاہتا تھا۔ اور آخر کار اس احساس کی شدت نے میرے ضمیر اور میرے علم و یقین کو جس اقدام کی طرف مجبور کیا وہ یہ تھا کہ

بیا کہ روئے بہ محراب گاہ نور نہیم   بنائے کعبۂ دیگر ز سنگِ طور نہیم
حطیم کعبہ شکست و اساسِ قبلہ بریخت   بتازہ طرح یکے قصرِ بے قصور نہیم

پھر یہ "کعبۂ دیگر" کیا تھا۔ یہ "قصرِ بیقصور" کیا ہو سکتا تھا؟ یہی تنگ نظری کی زنجیروں کو توڑنا، تفریقات شعائر و رسوم کی خلیج کو پُر کر دینا اور ایک ایسی بلند چوٹی پر اسلام کا جھنڈا نصب کرنا جس سے زیادہ رفعت کسی اور مذہب کے پرچم کو میسر نہ آسکے ——— پھر چونکہ میں اسلام کو اس کی حقیقت کے لحاظ سے اخلاق کی دنیا میں ایک آخری آواز سمجھتا ہوں اور یہ یقین رکھتا ہوں کہ اسلام نام مخصوص وضع و شکل بنانے کا نہیں ہے، چند متعین حرکات کی پابندی کا نہیں ہے بلکہ وہ مسمّیٰ ہے ارتقاءِ نوعِ انسانی کا، عروجِ فضل و کمال کا، اور اخلاق کی انتہائی رفعت کا اس لئے میں مجبور تھا کہ موجودہ مزعومات مذہبی اور مفروضات دینی کی تنگ و تاریک فضا سے بلند ہو کر کوئی نصب العین ڈھونڈھتا۔ اور شکر ہے کہ میری عقل نے اس باب میں میری رہبری کی اور جوں جوں حجابات دُور ہوتے گئے۔ میری آواز میں بلندی، میرے عزائم میں سختی اور میرے مسلک میں وسعت پیدا ہوتی گئی، حتیٰ کہ آج خدا میری نزدیک نام ہے ایک ایسی قوت غیر متاثرہ کا جو کافر و مسلمان کی بے معنی اصطلاحوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتی، جو مسجد و کلیسہ کاشی و کعبہ، اذان و ناقوس، طواف اور پیکراں سب سے بے نیاز ہے۔ اور وہ انعام و انتقام، جزا و سزا کو کبھی اس لئے متعلق نہیں کرتا کہ فلاں اُسے۔ اللہ کے نام سے پکارتا ہے اور فلاں رام کے نام سے، یا وہ مندر میں گھنٹہ بجا کر اس کی یاد کرتا ہے یا یہ کان میں اونگلی دے کر اذان کی آواز سے اُسے پکارتا ہے ——— وہ اگر خدا ہے تو سب کا خدا ہے۔ اور اس نے ہر شخص کی جزا و سزا، ہر قوم کی دوزخ و جنت خود اسی شخص یا قوم کے اندر پنہاں رکھدی ہے خواہ

وہ اِسے اختیار کرے یا اُسے

پھر جو شخص تمام نوع انسانی کو ایک مرکز پر لانا چاہتا ہو اور جو صرف صحتِ اخلاق کو غرض مشترک قرار دے کر دُنیا سے عصبیت کو مٹا دینا پسند کرتا ہو، اس کے خیالات وعقاید میں اگر آپ یہ تغیر محسوس کریں تو جائے عجب نہیں اور پھر یہ منزل تو ابھی صرف قیل وقال اور حجت واستدلال کی ہے، کسے خبر ہے کہ کل اگر میں اس منزل سے بھی گزر کر صرف خاموشِ عمل کی منزل میں آگیا تو میرے منہ سے کیا نکلے گا، اور آج جو صرف کافر ومرتد کہکر مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ کل مجھے دیوانہ ومجنوں جان کر پتھر نہ ماریں گے

اجد الملامۃ فی ھواک لذیذۃ
حباً لذکرک فلیلمنی اللوم

باب الاستفسار

(جناب محمد عبداللہ خاں صاحب - کراچی)

بیدل کے چند اشعار

تکلیف تو ہوگی لیکن براہِ کرم بیدل کے حسب ذیل اشعار کا مطلب واضح طور پر بیان فرما دیجئے، چونکہ آپ نے اکثر و بیشتر بیدل کا ذکر کیا ہے اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ آپ سے بہتر اس خدمت کو کوئی اور انجام نہیں دے سکتا۔ وہ اشعار یہ ہیں: ---

بہ کدام فرصت ازیں چمن ہوس از فضولی اثر کند　　شب خوں بعمر خضر زنم کہ نفس شراب سحر زند

شکست زاں چشم فتنہ مائل غبار امکاں بال بسمل　　مباش زافسونِ سرمہ غافل ہنوز دست نیز رنگش

بہ کدام آئینہ مائلی کہ ز فرصت اینہمہ غافلی　　تو نگاہِ دیدۂ بسملی مژہ واکن و بہ کفن در آ

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نرفت رنج خمارِ ما　　چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنار ما بہ کنار ما

نگار) میں بیدل کا شمار ان شعراء میں کرتا ہوں کہ اگر کوئی شخص ان کے کلام مفہوم سمجھنے سے عاری ہو تو اسے سمجھانے کی کوشش نہ کرنا چاہیئے، کیونکہ شعر کا لطف صرف اسی وقت حاصل ہوتا ہے۔ جب بغیر وساطت توضیح و تفسیر کے وجدانی طور پر ذہن نشین ہو جائے ——— پھر چونکہ ہر شخص کا ذوق ایک مخصوص دائرہ کے اندر کام کرتا ہے،

اس لئے جب اس دائرہ سے ہٹ کر کوئی چیز اس کے سامنے آتی ہے تو اس کا ذہن مشوش ہو جاتا ہے اور اگر کسی کے سمجھانے سے مفہوم سمجھ میں آ بھی گیا تو وہ لطف حاصل نہیں ہوتا جو از خود سمجھنے سے پیدا ہو سکتا ہے

بیدل کو شاعر کہا جائے یا نہ کہا جائے، مجھے تو اس میں بھی تامل ہے کیونکہ اس کی تخئیل اس درجہ نازک ہے کہ غیر معمولی ذہانت رکھنے والے بھی بعض اوقات اس کی نزاکت تک نہیں پہونچ سکتے

بیدل ایک مجذوب ہے شاعر نہیں۔ جو کچھ وہ کہتا ہے اُسے شاعری کے نقطۂ نظر سے دیکھنا غلطی ہے بلکہ ایک رند ژولیدہ مُو، ایک سر بصحرا زدہ مجنوں کی حیثیت سے اس کی آواز کو سننا چاہیئے

جو اشعار آپ نے لکھے ہیں میں اپنی فہم و فراست کے مطابق اُن کا مفہوم تو بیان کئے دیتا ہوں لیکن جانتا ہوں کہ وہ لُطف جو بغیر تفصیل و تشریح کے یوں .... حاصل ہونا چاہیئے۔ وہ آپ کو حاصل نہ ہوگا۔ میں یہاں صرف مفہوم ظاہر کر دوں گا تعبیرات شاعرانہ کو آپ اس کے مطابق کر لیجئے گا

(۱) پہلے شعر میں اس کا مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ کارگاہ عالم میں انسانی تگ و دو کی ہوس رانی حد درجہ حماقت ہے کیونکہ انسان تو یہاں کوئی فرصت لے کر آیا ہی نہیں اور بڑی سی بڑی فرصت و مہلت بھی حد درجہ مختصر ہے

پہلا مصرعہ :-

اتنی فرصت کہاں کہ اس چمن یا دنیا میں ہماری ہوس کوئی نتیجہ پیدا کر سکے

دوسرا مصرعہ :-

کیونکہ اس تنگی فرصت کا یہ عالم ہے کہ عمر خضر مل جائے تو بھی وہ اس سے زیادہ کام نہیں دے سکتی کہ بہ مشکل ہم شام کو سحر کر سکیں

(۲) محبوب کی چشم فتنہ پرواز کا یہ اثر ہے کہ بالِ بسمل سے غبارِ امکان لوٹ گیا یعنی بسمل تڑپ کر مر گیا۔ اس لئے اس وقت سے غافل نہ ہو جب اُن آنکھوں میں سُرمہ بھی لگ جائے کہ اس وقت تو خدا جانے وہ اور کیا قیامت ڈھائیں گی سُرمہ کے متعلق یہ کہنا کہ " ہنوز دستے ست زیر سنگ ش " صرف اس لحاظ سے ہے کہ طیار ہونے سے قبل وہ کھرل میں پیسا جاتا ہے

(۳) تو کس تماشہ میں مصروف ہے، کس آئینہ کے سامنے اپنی زیبائش و آرائش میں لگا ہوا ہے۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ جو تھوڑی سی فرصت تجھے ملی ہے وہ دیدۂ بسمل کی آخری نگاہ سے زاید نہیں اس لئے آنکھ کھول اور کفن کے اندر آ جا کہ تیری فرصت کا اقتضاء اس سے زاید نہیں

(۴) یہ شعر صاف ہے۔ مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ عاشق کی تمنائیں وصل محبوب کے باب میں اس قدر عجیب و غریب ہیں کہ کبھی پوری ہو ہی نہیں سکتیں۔ اس خیال کو سامنے رکھ کر وہ محبوب سے کہتا ہے کہ " ایک عمر گزر گئی تیرے

ساتھ بادہ خواری میں مصروف ہوں۔ لیکن خمارِ محرومی اب تک نہیں گیا، خدا کے لئے بتایہ کیا قیامت ہے کہ باوجود پہلو سے مستقل رہنے کے بھی میرے پہلو سے جدا ہے، باوجود آغوش میں رہنے کے آغوش سے علیحدہ ہے

کسان

دے نہ گر درسِ تپش، خورشید کی تابندگی ظلمتوں میں ڈوب کر رہ جائے نبضِ زندگی
گر نہ ہو محوِ تبسم، ماہِ تاباں کا جمال نرم رَو موجوں کو حاصل ہو نہ طوفاں کا جلال
گر نہ گرمِ سیر ہو، صحنِ گلستاں میں نسیم حشر تک سوتی رہے غنچے کے سینے میں شمیم
گر ہوا میں ابرِ تر قطروں کا پھیلائے نہ جال ہو نہ دُنیا میں پرافشاں طائرِ حُسن و جمال

یوں ہی گر دہقاں رہے سعی و عمل سے بیخبر
زندگی کی موج رقصاں ہو نہ سطحِ خاک پر

کس قدر اس بے نوا، دہقاں کی سیرت ہے عجیب خود مریضِ مضطرب اور دردِ عالم کا طبیب
اس کے عالم میں نہیں جنگِ یقین و احتمال خال و خد سے ہے عیاں صدیوں کی محنت کا جلال
کوہ کے مانند ہے اس کے ارادوں کا ثبات ہے اسی کے دوش پر صدیوں سے بارِ کائنات
مطمئن اپنی روش پر، محوِ آئینِ قدیم اس کے سینے میں نہیں ہنگامۂ اُمید و بیم
بیل ہے، یہ ہے زمیں ہے، اور خیالِ فصل و کشت جھونپڑا ہے قصر اس کا، کھیت ہی اسکی بہشت
آگ برسے چرخ سے رُک جائے یا نبضِ حیات اس کی دنیا میں نہیں پروائے سیلِ حادثات
کھیل ہے اس کے لئے ہر شورشِ ہمت شکن شیر کا انداز، طوفاں کی طرح ہیبت فگن
بازوؤں میں آندھیوں کا زور، لوہے کا جگر حوصلہ بیباک، دل بے خوف، بے پروا نظر

زندگی کا راز دنیا کو بتا دیتا ہے یہ
محنتِ صبر آزما پر مسکرا دیتا ہے یہ

ہے مگر اس کاوشِ سعی و عمل کا یہ مآل — اس سے بڑھ کر کون ہوگا، بد نصیب و خستہ حال
باوجودِ ہمتِ آزاد و عـــزمِ اُستوار — اس سے بڑھکر کون ہوگا، دردمند دلفگار

. . . .

قصرِ دولت کی ستم رانی سے ٹھکرایا ہوا — زخم دارِ بے کسی، دنیا کا ٹھکرایا ہوا
اس کی نظروں میں نہیں تہذیب و دانش کا جلال — اس کی آنکھوں سے نہاں ہو عشرتِ بزمِ جمال
اس قدر نا آشنا، یعنی سمجھتا ہی نہیں — اس کے دل میں زندگانی کی تمنا ہی نہیں
یہ رہینِ صد محن کیا جانے کیا ہے زندگی — شام کا حسنِ لطافت، صبح کی تابندگی
روح کو کیونکر جگا دیتا ہے اِک رنگیں گلاب — کس طرح نغموں سے چونک اٹھتا ہو احساسِ شباب

زندگی کا راز حسن و نغمۂ صہبا میں ہے

فصل و بارش کے سوا کچھ اور بھی دُنیا میں ہے

ہے اس احساسِ الم پرور کا آخر کیا سبب؟ — کس نے اسکی روح کو رکھا ہے پابندِ تعب؟
کیوں ہے یہ ابتک رہینِ جستجوئے ناتمام؟ — کس نے اس کی سیرگاہوں میں بچھا رکھے ہیں دام؟
کون اس کی فکر کو دیتا ہے درسِ نارسی؟ — کس کے اطمینان کا ساماں ہو اسکی بے کسی؟
اس کی نا پُرسی ہو کس کی خودسری کا مدعا؟ — کیوں سرورِ نور سے محروم ہے اس کی فضا؟
چھیڑتا ہے ذرہ ذرہ گو سرودِ مہر و ماہ؟ — بن گئی ہے اسکی ہستی کیوں سراپا اشک و آہ؟
غرقِ آسائش ہے دنیا کی بہشتِ مختصر — یہ مگر ان سرمدی جلووں سے ہے کیوں بیخبر؟

کس نے اس ظلم فراواں کا کیا ہے بندوبست؟

دے رہا ہے کون اس کے عزم کو پیہم شکست؟

کیا یہ ممکن ہے، کہ ہو یہ مرضیٔ پروردگار — کیونکہ اُس کے حکم پر ہے زندگانی کا مدار
جس کی صناعی نے کی تشکیلِ ماہ و آفتاب — اِک پئے فکر و عمل اور ایک بہرِ درسِ خراب

راستے پیدا کئے اِن کے گزرنے کے لئے		اپنے اپنے محوروں پر رقص کرنے کے لئے

عقلِ انسانی پہ کھولے جس نے اسرارِ حیات		مختلف جلووں سے کی معمور بزمِ کائنات

جس نے کی اِس خاک کی چٹکی کو وہ رفعت عطا		کھل گئی اس کی نگاہوں پر ستاروں کی فضا

جس نے اس مجبور کو بخشا وہ عزمِ فتحمند		بڑھ گئی اوجِ فلک سے اس کی پروازِ بلند

نسلِ انسانی پہ اتنا ظلم ایسا قتلِ عام
حیف ہے گر ہو یہ دُنیا کے خدا کا اہتمام!

اس سے بڑھکر کوئی صورت اور کیا ہوگی مہیب		نوعِ انسانی کی تخریب و تباہی کی نقیب

اس سے بڑھکر اور کیا درد آفریں ہوگی فغاں		جس کے سننے پر ہو قادر گوشِ ابنائے زماں

اور کیا ہوگا بپا ہنگامۂ روزِ مصاف		ظلم و حرص و آز کی سفاک دُنیا کے خلاف

اور کیا ہوگی حیاتِ نوعِ انسانی تباہ		اور کیا دیکھے گی دُنیا ظلمتِ روزِ سیاہ

لطفِ پیہم کے ارادوں سے گزر سکتا نہیں
خالقِ ارض و سما یہ ظلم کر سکتا نہیں

ہل چکی ایوانِ دولت کی بنائے استوار		ہوشیار اب اے خداوندانِ گیتی ہوشیار

نازہے جس پر تمھیں ہے یہ وہی جنسِ گراں		بیکسوں کے اشک، مزدوروں کی آہِ ناتواں!

یوں ہی ہوتا ہے، سپاسِ منّتِ یزدانِ پاک		سرمدی جلووں سے کی معمور جس نے سطحِ خاک

خواہشوں کی رَو میں اتنا جبر، یہ قہر و عذاب		کیا یہی ہے بے شمار اکرامِ فطرت کا جواب

آندھیوں میں ظلم کی بنائے گیتی ہے تباہ		ظلم ایسا، جس کی بے اندازہ صدیاں ہیں گواہ

کر رہا ہے برق کی تعمیر فطرت کا جلال
یہ بتاؤ تم نے سوچا ہے کبھی اس کا مآل

ہاں یہی دہقاں، یہی بیگانۂ علم و شعور		جس کو ٹھکرا کر تمھیں ملتی ہے تسکینِ غرور

جس کی محرومی سے پاتی ہے خداوندی غذا — جس کے دل پر ہے تمھارے قصرِ نخوت کی بِنا

جس کی بربادی سے ہے بزمِ طرب کا اہتمام — خون سے جس کے درخشاں ہیں تمھارے صبح و شام

جس سے چھینا تم نے احساسِ حیاتِ کامگار — عشرتوں کا ناز، عقل و علم و دانش کا وقار

محرمِ انوارِ آسایش نہیں جس کی جبیں — جس کو آزادی سے جینے کا بھی حق حاصل نہیں

جو حزیں اب تک اسیرِ ہستیِ موہوم ہے — جس کی دنیا سرمدی انوار سے محروم ہے

کچھ خبر ہے رنگِ ہستی کیا سے کیا ہو جائے گا — جب دماغ اس کا حقیقت آشنا ہو جائیگا

جب بغاوت کی اٹھیں گی حشر پرور آندھیاں — جب یہ لے گا اِس جہاں کے حوصلے کا امتحاں

ہوش میں آئیگا جب مدت کی مدہوشی کے بعد — جب زباں کھولے گا یہ صدیوں کی خاموشی کے بعد

کون روکے گا وہ جوشِ قہر و طوفانِ عتاب — کون دے گا اس کے پُر ہیبت سوالوں کا جواب

کس کے بازو میں ہے یہ طاقت کہ روکے اسکے وار — کس کی ہمت کو یہ قدرت ہو کہ ہو اس سے دوچار

ٹھوکریں کھاتی پھرے گی سطوتِ جاہ و جلال — موجِ ظلمت بن کے رہ جائیں گے اجزائے جمال

عظمتوں کا قصر آنسو کی طرح بہ جائے گا — دولتوں کا ناز اپنے حال پر شرمائے گا

صبح اُن کے حق میں ہوگی نوحہ و ماتم کی شب — زندگی کا حق جنھوں نے اس سے چھینا بے سبب

چاہتے ہو گر کہ دُنیا ہو نہ برباد و زبوں — انتقام اس کا نہ ہو غارت گرِ امن و سکوں

اس سے پہلے جبکہ یہ اس خواب سے بیدار ہو — اور اس کے قہر کی تلوار، آتش بار ہو

جبکہ اس کے دل میں ہو بیچین جوشِ انتقام — اور لہو پی کے ہو دیوِ بغاوت شادکام

تم کو اس کی فکر "استعمار" کرنا چاہیے

اور اپنے جُرم کا اقرار کرنا چاہیے

علی اختر (حیدرآباد دکن)

معلومات

بعض محیر العقول تماشوں کی حقیقت

آج کل بعض فقرا ایسے دہشت ناک تماشے دکھاتے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتے دراصل انکی حقیقتاً وہ کچھ نہیں ہوتے۔ مثلاً نوکدار کیلوں، ننگی تلواروں پر لیٹ جانا۔ سینہ پر پتھر رکھوا کر تڑوانا، کانچ کے ٹکڑوں پر برہنہ چلنا، ننگے بدن آگ سے گزر جانا، مُنہ میں انگارہ لے لینا، گھنٹوں تک زمین میں دفن رہنا۔ یہ تمام باتیں بہت معمولی ہیں اور ان میں کوئی معجزہ و کرامت نہیں ہے

مثلاً نوکدار کیلوں پر لیٹنے کی حقیقت کو ملاحظہ کیجئے کہ ہر شخص بغیر کسی مشق کے کر سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ انسان کا ثقل تمام کیلوں پر تقسیم ہو جاتا ہے اور جتنا وزن ایک کیل کے اندر پیوست ہونے کے لئے ضروری ہے وہ پیدا نہیں ہوتا۔ عام طور پر وہ تختہ جس پر لوگ لیٹتے ہیں کم از کم ۵ - ۶ ہزار کیلیں رکھتا ہے اور جب وقت انسان کے وزن کو ان کیلوں پر تقسیم کیا جائے گا تو مشکل سے ۱۰ رتی فی کیل کا اوسط پڑے گا۔ اور ظاہر ہے کہ اتنے وزن سے ایک کیل جسم کے اندر پیوست نہیں ہو سکتی

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض لوگ دو تلواروں پر لیٹ کر سو جاتے ہیں اور ان کے سینے پر پتھر رکھ کر توڑا جاتا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایک شخص اپنے جسم و اعصاب کو سخت کر کے لیٹ جاتا ہے اور لوگوں کو یقین دلایا جاتا ہے کہ اس پر مسمریزم کا عمل کیا گیا۔ پھر دو تلواریں دو آہنی ڈھانچوں پر رکھ کر اُسے تلواروں پر لٹا دیتے ہیں۔ جو تیز نہیں ہوتیں۔ اس کے بعد سینہ پر پتھر رکھ کر توڑتے ہیں۔ اس کا راز صرف یہ ہے کہ جسم کے اُس حصّہ کے نیچے جہاں پتھر رکھا جاتا ہے خلا ہوتا ہے اور اس لئے جب ضرب لگائی جاتی ہے تو اس کا اثر صرف اُن آہنی ڈھانچوں پر پڑتا ہے۔ جن پر تلواریں رکھی ہوئی ہیں اور جسم متاثر نہیں ہوتا۔ اس کا تجربہ آپ یوں کر سکتے ہیں کہ پتھر کا کوئی ٹکڑا آپ ہاتھ میں لیں اور اُسے ہتوڑی سے توڑیں تو پتھر ٹوٹ جائے گا۔ اور ہاتھ میں ضرب نہ آئے گی، لیکن اگر آپ کا ہاتھ زمین پر ہوگا تو مجروح ہو جائے گا

کانچ کے ٹکڑوں پر چلنے کی حقیقت یہ ہے۔ کہ یہ ٹکڑے تیز نوکدار نہیں ہوتے اور اُن کی دھار گرنڈ پتھر سے ملدی جاتی ہے ——— آگ پر چلنے یا آگ منہ میں رکھ لینے کی ترکیب یہ ہے کہ پہلے پھٹکری کا پانی اور گندھک کا تیزاب ملاکر

جسم پر مل لیتے ہیں اس سے یہ ہوتا ہے کہ آگ کا اثر فوراً نہیں ہوتا اور ایک شخص تیزی سے آگ پر دوڑ سکتا ہے

زندہ دفن ہو جانے کی اصلیت یہ ہے کہ جس تابوت میں لٹا کر دفن کرتے ہیں وہ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اس کے اندر کی آکسیجن ۷-۶ گھنٹہ تک انسان کو زندہ رکھ سکتی ہے۔ احتیاطاً اس کے منہ، ناک اور کان پر روئی رکھ دیتے ہیں تاکہ تنفس آہستہ آہستہ ہو اور آکسیجن کی موجودہ مقدار زیادہ دیر تک کام دے سکے

لاشوں کا تبادلہ

جرمنی کی ایک ضعیف عورت ڈرسڈین سے ویانا سفر کر رہی تھی۔ جب ریل زیکوسلوویکیا کے حدود میں پہونچی تو وہ بیمار ہوگئی اور وہیں کسی شفاخانہ میں داخل کر دی گئی۔ ایک گھنٹہ کے بعد جب وہ مرگئی تو اس کے خاندان والوں کو ذریعۂ تار اس کے مرنے کی اطلاع دیدی گئی۔ جب چار دن کے بعد اس کا تابوت جرمنی میں پہونچا۔ اور اُسے کھولا گیا تو لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ تابوت کے اندر بجائے ضعیف عورت کے ایک اطالوی فوجی افسر کی لاش وردی کے ساتھ نظر آئی

یہاں سے فوراً تار بھیجا گیا کہ "تابوت میں اطالوی افسر کی لاش ملی ہے، بڑھیا کی لاش کہاں گئی" وہاں سے جواب آیا۔ " اس غلطی پر سخت افسوس ہے۔ بڑھیا کی لاش بولونی چلی گئی "۔ لوگوں نے بولونی تار دیا۔ وہاں سے یہ جواب ملا کہ " یہاں تو وہ لاش دفن کر دی گئی۔ اور تمام انھیں فوجی مراسم اعزاز کے ساتھ جو ایک افسر کے لئے عمل میں لائے جاتے ہیں۔ اور قبر پر فوجی نشان وغیرہ بھی نصب کر دیے گئے۔ اس سلئے ہمارے فوجی افسر کو بڑھیا سمجھ کر وہیں دفن کر دیجئے"

بولونی میں آج بھی بڑھیا کی قبر موجود ہے اور جب فوج اُس طرف سے گزرتی ہے تو اسی طرح سلامی دیتی ہے جیسے کسی فوجی افسر کی قبر کے سامنے دی جاتی ہے

حُسن و ذکاوت کی جنگ

ذہانت وجمال کے درمیان ایک زمانہ سے جنگ جاری ہے۔ بعض لوگ حسین عورت کو ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ وہ کتنی ہی غبی کیوں نہ ہو۔ اور بعض اس کے برخلاف صرف ذہانت و ذکاوت کو پسند کرتے ہیں

شکاگو کی یونیورسٹی (دی بول) کا معمول ہے کہ وہ ہر سال اپنی رپورٹ کے ساتھ جمیل ترین طالبات کی تصویریں بھی شایع کرتی ہے۔ ۱۹۳۲ء میں جو رپورٹ شائع ہوئی وہ اس قاعدہ کے خلاف تھی۔ یعنی اس میں بجائے جمیل طالبات کے ذہین لڑکیوں کی تصویریں شایع کی گئیں۔ اس پر وہاں کے طلبہ میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ اور اس اختلاف نے اس حد تک طوالت اختیار کی کہ آخر کار یہ تجویز قرار پائی کہ آیندہ سے پانچ حسین لڑکیوں کی اور پانچ ذہین طالبات کی تصویریں دی جائیں

تخفیف اسلحہ کی حقیقت

گزشتہ جنگِ عظیم کے بعد تمام ممالک کا رُجحان اس طرف ہے کہ اسلحہ کو کم کیا جائے اور سامانِ حرب کو رفتہ رفتہ مفقود کر دیا جائے کہ دُنیا کا آیندہ امن و سکون

اسی طرح قائم رہ سکتا ہے۔ چنانچہ اس امر پر تمام حکومتوں نے اتفاق کرکے باہمی معاہدہ بھی کرلیا۔ لیکن اس عہد و پیمان کا عملی نتیجہ کیا ہوا۔ وہ ذیل کے اعداد سے معلوم ہوگا :-

سنہ ۲۴ء سے سنہ ۳۱ء کے آخر تک ——— برطانیہ نے ۲۳۷۰۰۰۰ گنی آلات حرب پر صرف کیں،
فرانس نے جنگی جہازوں کی طیاری میں ۵۰۰۰۰۰ گنی صرف کیں
اطالیہ نے فوجی طیاریوں میں ۱۲۵۰۰۰۰ گنی خرچ کیں
امریکہ نے ۳۶۰۰۰۰۰۰ گنی اور جاپان نے ۱۱۰۰۰۰۰

برطانیہ کے تمام فوجی مصارف سنہ ۳۱ء میں وہی رہے جو سنہ ۲۴ء میں تھے، فرانس میں ۲۰۸۰۰۰۰ کا اضافہ ہوگیا۔ اور اطالیہ میں ۱۵۴۰۰۰۰ کا۔ اسی طرح امریکہ نے ۱۵۶۸۰۰۰۰ گنی زیادہ صرف کیں

دماغوں کا عجائب گھر دینا میں ایک شخص ڈاکٹر اکونومو ہے۔ اس نے ایک عجائب گھر صرف انسانی دماغوں کے لئے قائم کیا ہے۔ اور بڑے بڑے علماء، فیلسوف، شعراء، ادباء، اور سیاسی رہنماؤں کے دماغ شیشے کے ظرف میں نہایت اہتمام سے محفوظ رکھتا ہے۔ ہر شیشہ پر وہ اس شخص کا نام، اور دماغ کا وزن وغیرہ بھی درج کردیتا ہے۔ اس وقت تک کثیر تعداد میں اس نے "دماغ" جمع کرلئے ہیں اور دنیا کے تمام مشاہیر سے وہ اس باب میں خط و کتابت کرتا رہتا ہے کہ وہ اپنے دماغ کی بابت اس کو دئے جانے کی وصیت کرجائیں

چھڑی کا استعمال جرمنی کے ایک رسالہ نے نہایت بسیط بحث کی ہے کہ چھڑی کا استعمال انسان کے لئے مناسب ہے یا نہیں۔ اس نے جو تحقیق پیش کی ہے وہ عجیب و غریب ہے۔ اس کا بیان ہے کہ چھڑی لے کر انسان کا چلنا اس کی صحت کے لئے مُضر ہے۔ کیونکہ وہ لوگ جو اس کا استعمال نہیں کرتے عموماً زیادہ فراخ سینے، بھرے ہوئے بازو اور مضبوط ہاتھ رکھتے ہیں

اس کا خیال ہے کہ چھڑی کا استعمال انسان کے عہدِ وحشت کی یادگار ہے جب اُسے سنگلاخ زمین پر کوہستانی صحراؤں میں چلنا پڑتا تھا اور سہارے کی ضرورت تھی۔ اب اس کا استعمال کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اور رفتہ رفتہ اس کا استعمال انسان کو سہارا لینے کا عادی بنادیتا ہے جو اعضا کے نشو و نما کے منافی ہے

اسی طرح قائم رہ سکتا ہے۔ چنانچہ اس امر پر تمام حکومتوں نے اتفاق کر کے باہمی معاہدہ بھی کر لیا۔ **لیکن اس عہد و پیمان** کا کیا نتیجہ ہوا، وہ ذیل کے اعداد سے معلوم ہوگا:-

[illegible] سے [illegible] کے آخیر تک ــــــ برطانیہ نے ۲۲۰۰۰۰۰ گنی آلات حرب پر صرف کیں۔

فرانس نے جنگی جہازوں کی تیاری میں ۵۰۰۰۰۰ گنی صرف کیں

اطالیہ نے فوجی طیاروں میں ۱۲۵۰۰ گنی خرچ کیں

امریکہ نے ۳۶۰۰۰۰۰ گنی اور جاپان نے ۱۱۰۰۰۰۰

برطانیہ کے فوجی مصارف [illegible] میں [illegible] ہے جو [illegible] میں تھے، فرانس میں ۲۰۸۰۰۰۰ کا اضافہ ہو گیا اور اطالیہ میں [illegible] اسی طرح امریکہ نے ۱۵۶۰۰۰۰ گنی زیادہ صرف کیں

دماغوں کا عجائب گھر

[illegible] ایک شخص [illegible] نے ایک عجائب گھر صرف انسانی دماغوں کے لئے قائم کیا ہے، اور بڑے بڑے علماء، فلاسفہ، شعراء، ادباء اور سیاسی رہنماؤں کے دماغ شیشے کے ظروف میں نہایت اہتمام سے محفوظ رکھتا ہے۔ ہر شیشے پر وہ اس شخص کا نام، اور دماغ کا وزن وغیرہ بھی درج کر دیتا ہے۔ اس وقت تک کثیر تعداد میں اس نے "دماغ" جمع کر لئے ہیں اور دنیا کے تمام مشاہیر سے وہ اس باب میں خط و کتابت کرتا رہتا ہے کہ وہ اپنے دماغ کی بابت اس کو دے جانے کی وصیت کر جائیں

چھڑی کا استعمال

جرمنی کے ایک رسالہ نے نہایت بسیط بحث کی ہے کہ چھڑی کا استعمال انسان کے لئے مناسب ہے یا نہیں۔ اس نے جو تحقیق پیش کی ہے وہ عجیب و غریب ہے۔ اس کا بیان ہے کہ چھڑی لے کر انسان کا چلنا اس کی صحت کے لئے مضر ہے۔ کیونکہ وہ لوگ جو اس کا استعمال نہیں کرتے عموماً زیادہ فراخ سینے، [illegible] ہوئے بازو اور مضبوط ہاتھ رکھتے ہیں

اس کا خیال ہے کہ چھڑی کا استعمال انسان کے عہد وحشت کی یادگار ہے جب اسے سنگلاخ زمین پر کوہستانی صحراؤں میں چلنا پڑتا تھا اور سہارے کی ضرورت تھی۔ اب اس کا استعمال کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ اس کی ضرورت نہیں ہے، اور رفتہ رفتہ اس کا استعمال انسان کو سہارا لینے کا عادی بنا دیتا ہے جو اعضا کے نشو و نما کے منافی ہے

مجموعہ استفسار و جواب زیر کتابت ہے اور دو تین ماہ کے اندر شائع ہو جائے گا۔ اگر آپ چاہیں تو رعایت سے فائدہ اٹھانے کے لئے آپ بھی ڈیڑھ روپیہ (عہ) بھیج سکتے ہیں ــــ

منیجر نگار لکھنؤ

قیمت ۸/-

۱

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شائع ہوتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا

سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ

بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

شمارہ ۳	فہرست مضامین مارچ سنہ ۱۹۳۴ء	جلد ۲۵

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۵	مارچ ۳۴ء	شمارہ ۳

ملاحظات

" تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل "

گزشتہ و آیندہ ـــــــــ

آفتاب کا طلوع و غروب ، روز و شب کا تسلسل ، اور اسی طرح کے تمام فطری مناظر زمانۂ نامعلوم سے یکساں طور پر رونما ہوتے چلے آرہے ہیں ، اور اگر کائنات نام صرف انھیں نقوش کا ہو تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کسی انقلاب و تغیر کو قبول نہیں کرتی ــ لیکن حقیقت امر شاید اس کے خلاف ہے کیونکہ اہل علم پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ " عالم حادث ہے ، متغیر ہے " ــــــ

پھر کیا اس حدوث و تغیر کا علم ہم کو بغیر کسی غور و فکر کے الہامی طور پر حاصل ہوا ہے ۔ غالباً نہیں ــ پھر اس بات کے تسلیم کرنے میں کیوں تامل ہو کہ اہم ترین تغیر عقلِ انسانی کا تغیر ہے جو ہر آن و ہر لحظہ حجابات دُور کرتا جا رہا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ آیندہ کس نقطہ پر پہونچ کر اس کو اپنی تگ و دو ختم کرنا ہے ۔

انسان فطرت کی طرف سے اپنے اندر وہ حس لیکر آیا ہے جسے "حس اجتماعی" (Herd Instinct) کہتے ہیں اور اسی احساس کا نتیجہ نظام تمدن ہے جس کا آغاز "عہد حجری" سے ہوا اور اب "عہدِ برق وشعاع" کہلاتا ہے، یعنی جس کی ابتدا زمین کے جمادات سے ہوئی تھی وہ اب آسمان سے باتیں کر رہا ہے ——— اور کون کہہ سکتا ہے کہ آیندہ وہ اس سے بھی بلند ہوکر "عرشِ کبریائی" تک نہ پہونچ جائے گا ——— الغرض اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ذہن انسانی برابر ترقی کرتا جا رہا ہے اور کل کے بوڑھے آج صرف بچوں کی صف میں جگہ پا سکتے ہیں ——— جس طرح آج کے بوڑھوں کا شمار کل کے بچوں میں ہونے والا ہے۔

پھر کیا یہ انسان کی توہین ہے کہ اب سے ہزار سال قبل جو تحقیق و جستجو اس نے کی تھی وہ آج غلط ثابت کی جا رہی ہے، اگر ہمارے اسلاف کے علمی، اخلاقی و تمدنی نظریئے آج کے مشاہدہ و ضروریات کے لحاظ سے ناقص و ناکمل نظر آتے ہیں، تو کیا اس کا اظہار ان کی تنقیص ہے ؟

نظام بطلیموس کا ماننے والا آج کوئی نہیں، لیکن بطلیموس کی عزت و عظمت اسی طرح قائم ہے، نیوٹن کا نظریۂ کشش ممکن ہے "گریویٹیشن" کے نظریۂ اضافیت کے سامنے غلط ثابت ہو جائے، لیکن نیوٹن کا نام تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ زرّیں حروف میں نظر آئے گا

جس طرح ازمنۂ قدیمہ میں انسانی ذہن و دماغ نے اپنے حاسۂ اجتماعی کے اقتضا پر اور بہت سی باتیں دریافت کیں، اسی طرح اس نے مذہب کی بنیاد ڈالی اور ——— اس میں شک نہیں کہ اس سے اُس کا مقصود نوع انسان کی خدمت اور تشکیلِ تمدن کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ پھر اگر ضروریاتِ زمانہ اور انسان کی عقلی ترقیوں کے ساتھ ساتھ دنیا کے تمام علمی نظریئے تبدیل ہوتے رہتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مذہبی عقائد میں تغیر نہ پیدا ہو۔ لیکن اس تغیر کا مطالبہ و احساس یقیناً کسی پیمبر کی توہین نہیں، کیونکہ جس عہد و زمانہ میں جو مذہب پیدا ہوا وہ اس وقت کے لحاظ سے واقعی آخری لفظ کی حیثیت رکھتا تھا۔ قرآن پاک میں بھی ارتقاءِ خیال کے لحاظ سے اصول مذاہب کی تبدیلی کی ضرورت کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے:-

ما ننسخ من اٰیة او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا

جب حقیقت یہ ہے تو میں حیران ہوں کہ عقاید مذہبی میں تغیر و تبدل کی خواہش پر لوگ کیوں چراغ پا ہوتے ہیں خصوصیت کے ساتھ مسلمان کہ ان کے مذہب کی بنیاد ہی اس اصول پر قائم ہوئی ہے کہ "خُذ ما صفا" پر عمل کیا جائے اور زمانہ کے ساتھ دینے کی اہلیت اپنے اندر پیدا کی جائے

مذاہب عالم کی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک چیز تو وہ تھی جسے ہم "پیمبرانہ روح" (Prophet Soul) کہتے ہیں اور دوسری جو اس کے بعد پیدا ہوئی وہ "نفس مولویانہ" (Priest Mind) تھا۔ یعنی ایک تو وہ نفوس پاکیزہ تھے جن کے ذہن خلاق نے انسانی سوسائٹی کی فلاح کے لئے کچھ اصول وضع کئے اور دوسرے

وہ تھے جو ان کا نفاذ کرنے والے تھے اور نقال محض ——— پھر ان میں سے اکثر وہی تھے جنھوں نے اس پیمبرانہ روح کے حقیقی منشا سے نا آشنا رہ کر محض الفاظ کو نے کران کی پرستش شروع کر دی اور کمتر ایسے تھے۔ جن کے دماغوں نے ہادی اول کی عقل سلیم کے متوازی چل کر اس کی تعلیم کی کنہہ حقیقت کو دریافت کیا ہو ——— یہی رونا پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے۔ اور اسی لئے اس سے قبل بھی عقل و مذہب میں جنگ جاری رہی۔ اور اب بھی جاری ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف اتنا کہ پہلے ذہن و عقل کی اس آزادی کو بزور شمشیر فنا کر کے اسے زیادہ ابھرنے کا موقع نہیں دیا جاتا تھا۔ اور آج یہ مجبوری اٹھ جانے سے عقل انسانی زیادہ سنگین محاذ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے اب آئیے اس جنگ پر ذرا اور وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالیں

اہل سائنس کہتے ہیں کہ سائنس ہمیں صرف اُن باتوں کے یقین کرنے پر مجبور کرتا ہے جن کو ہم صحیح ثابت کر سکتے ہیں، برخلاف اس کے مذہب مشتمل ہے چند مزعومات پر جن کا کوئی علمی یا استقرائی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر اہل مذاہب سے سوال کیا جاتا ہے کہ اُن کی باتوں پر ایمان لانے کے کیا اسباب ہیں تو وہ تین دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہمارے اسلاف ایسا ہی یقین کرتے تھے، دوسرے یہ کہ ہمارے اسلاف جو دلائل پیش کر چکے ہیں وہ کافی ہیں اور تیسرے یہ کہ اصول مذہب پر گفتگو کرنا ناجائز و ممنوع ہے ——— کیا یہ دلایل واقعی کوئی وزن رکھتے ہیں ؟

اگر دو ہزار قبل مسیح کے اکتشافات علمیہ کو عقل انسانی نے آج بالکل بدل کر رکھدیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اُس وقت کا مذہب جوں کا توں باقی رہے اور اس کے اصول اب بھی مفید و کار آمد ثابت ہوں۔ پھر اگر تمام دنیا میں صرف ایک ہی مذہب ہوتا تو بھی کہا جا سکتا تھا کہ وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کبھی اختلاف پیدا ہی نہیں ہوا، لیکن جب دنیا میں سیکڑوں مذاہب قائم ہوئے اور ہر ایک نے سوائے اپنے تمام دیگر مذاہب کو جھٹلایا تو ایک طلبگار حق کے لئے چارہ کار صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ ان سب کو عقل کی کسوٹی پہ کسے اور کسی ایک کی صحت پر ایمان لائے۔ اس لئے یہ کہنا کہ مذہب کا تعلق عقل سے نہیں کیونکر درست ہو سکتا ہے ———

یہ بالکل صحیح ہے کہ سائنس اس وقت تک کسی ایسی حقیقت راسخہ تک نہیں پہونچ سکا جس کے آگے بڑھنے کی گنجایش باقی نہ رہے، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ جو دن گزرتا ہے وہ اس حقیقت سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے اور اسی لئے کوئی وجہ نہیں کہ مذہب کے باب میں اس اصولِ ارتقاء کو نظر انداز کر دیا جائے

سائنس واقعات کی جستجو کر کے حقیقت تک پہونچنا چاہتا ہے اور مذہب چند باتوں کو پہلے ہی سے حقیقت باور کر کے واقعات کو ان پر منطبق کرنا چاہتا ہے اور ان دونوں کا فرق ظاہر ہے ——— اگر ہم کسی مذہب کے پیرو ہیں تو صرف اس وجہ سے کہ ہمارے آبا و اجداد اس مذہب کے ماننے والے تھے، لیکن سائنس کے یہاں باپ دادا کوئی چیز نہیں، وہ ہر انسان سے انفرادی طور پر عقل و تمیز کے استعمال کا مطالبہ کرتا ہے

عقل انسانی نے عقاید مذہب میں جس جس تغیر کو قبول کیا وہ اہل علم سے مخفی نہیں۔ ابتدائی حالت میں جب انسان وحشی

مرجاہل تھا وہ خدا کو ایک ایسی ہی خود مختار فرمانروا ہستی سمجھتا تھا جیسی کسی دنیاوی صاحب وجبروت بادشاہ کی ہوتی ہے
کہ نہ وہ کسی قانون کا پابند ہے نہ کسی اصول پر کاربند ہو اور جس طرح چاہتا ہے بناتا بگاڑتا رہتا ہے ـــــ اس کے بعد جب
سترھویں صدی میں ڈیکارٹ، کیپلر، گلیلو، اور نیوٹن پیدا ہوئے اور انھوں نے کائنات کو ایک بڑی مشین کی
طرح نظم واصول کے ساتھ چلتے ہوئے تسلیم کیا تو خدا کے اس قدیم عقیدہ میں بھی کچھ تبدیلی پیدا ہوئی اور لوگوں نے باور کیا کہ
دنیا کا کاروبار بیشک خدا چلاتا ہے لیکن مخصوص مشنیری کے ذریعہ سے جس کو اس نے پیدا کیا ہے۔ مدعا یہ کہ خدا کی خدائی
کسی قانون واصول کی پابند ضرور ہے۔ جب یہ دَور بھی ختم ہوا اور اٹھارویں صدی آئی تو اس مشینری میں کسی خارجی قوت کی مداخلت
کو بھی تسلیم نہ کیا گیا مدعا یہ کہ خدا حکمراں تو ہے لیکن نظم ونسق سے اسے کوئی واسطہ نہیں ـــــ زمانۂ حال کی جو کیفیت
ہے وہ سب پر ظاہر ہے کہ سرے سے خدا کا وجود ہی معرض خطر میں پڑ گیا ہے ـــــ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ دیگر علوم
وفنون کے ساتھ مذہبی نظریوں میں بھی غیر معمولی تغیر پیدا ہوا اور وہ وقت آنے والا ہے جب اس کی انتہا اس صورت میں
ظاہر ہوگی جو اس وقت رُوس میں نظر آرہی ہے یعنی یہ کہ مذہب کا نام لینا ہی گناہ سمجھا جائے گا اور جس طرح کسی وقت دین
نے بیدینی کا استیصال تیغ وخنجر سے کیا تھا، بالکل اسی طرح بیدینی، دین کو محو کردینے کی کوشش کرے گی ـــ کیونکہ
اس وقت مذہبی اہمیت صرف سیاسیات کے رجحان پر قائم ہے اور اس کی حیثیت سرمایہ دارانہ پروپاگنڈا سے زیادہ
باقی نہیں رہی

جس حد تک روحانیت کا تعلق ہے مذہب، جس میں ظاہری مراسم وشعائر کی پابندی ضروری ہے، کوئی معنی نہیں
رکھتا، مادی نقطۂ نظر سے اس کی ناکامی کسی سے مخفی نہیں کہ آج تک وہ قوی کے مقابلہ میں ضعیف کو پامالی سے نہ بچا سکا،
نفسیاتی زاویۂ نگاہ سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس کی خصوصیات، علمی وتمدنی ترقی کے لئے بہت حارج ہوئیں۔ رہی جبلی
وما بعد الطبیعیاتی تسکین سو یہ علم واخلاق کی وسعت سے حاصل ہوسکتی ہے جو عام "اخوت انسانی" کے رشتہ کو قائم کرنا چاہتی
ہے ـــــ الغرض اس وقت ..... مغرب کی علمی دُنیا میں جو جدید مذہب پھیلتا جارہا ہے وہ "اشتراکیت" ہے
جس کا پیغمبر لینن اور جس کی شریعت سائنس ہے۔ [1]

پھر مذہبی نظام کے خلاف یہ ہیجان صرف یورپ وامریکہ ہی میں محدود نہیں ہے بلکہ ایشیا میں بھی پایا جاتا ہے
ٹرکی اپنی قومی ترقی واصلاح کے لئے اسلام کو پس پشت ڈال رہا ہے، چنانچہ ۱۹۲۸ء میں مصطفےٰ کمال نے اپنی ایک تقریر

---

[1] ماسکو کے کلب میں جو کتبے آویزاں ہیں اُن میں سے ایک پر یہ عبارت درج ہے:-

"کسی کو خبر نہیں کہ دُنیا کب بنی لیکن یہ ہر شخص جانتا ہے کہ نئی دنیا ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوئی ـــــ آسمانوں سے خدا کو
ہٹاؤ اور زمین سے سرمایہ داری کو تاکہ اشتراکی نوجوانوں کو آگے بڑھنے کا موقعہ ملے"

کے دَوران میں صاف صاف کہدیا تھا کہ " کانسٹی ٹیوشن میں اس امر کا اظہار کہ ترکی، اسلامی حکومت ہے ایک ایسی بات کا اظہار ہے جس کو اولیں مناسب فرصت میں کالعدم ہو جاتا ہے" ــــــ یہی حال تقریباً ایران و مصر کا ہے۔ چین اور ہندوستان میں بھی اس انقلاب کے آثار پوری طرح نمایاں ہیں کیونکہ اس وقت دنیا کے سامنے اہم ترین فکر یہ نہیں ہے کہ انسان گناہوں سے کس طرح باز رہے بلکہ یہ ہے کہ تمدنی و معاشرتی نظام میں کونسی ایسی تبدیلی پیدا کی جائے کہ انسان بھوکا نہ مرے۔ اور چونکہ مذاہب عالم کا موجودہ نظام انسانیت کے اس درد دُکھ کا علاج اب تک نہیں کر سکا۔ اس لئے لامحالہ یا تو اس کو پس پشت ڈالنا پڑے گا یا اس میں کوئی ایسا تغیر پیدا کیا جائے گا۔ جو اس گتھی کو سلجھا سکے۔ بہرحال اس دورِ انقلاب میں مذاہب کو ضرور صدمہ پہونچے گا اور اگر حامیانِ مذہب نے اپنے اصولِ کار میں اقتضاءِ زمانہ کے لحاظ سے کوئی تبدیلی پیدا نہ کی تو ان کا منصب شریعت سے ہٹ جانا ناگزیر ہے

اگر شخص ثالث کی حیثیت سے فیصلہ کیا جائے تو اس سے انکار ممکن نہیں کہ موجودہ مذاہب میں، صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو زمانہ کے موجودہ انقلاب میں زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے، بشرطیکہ آنکہ اس کی اصل رُوح کو پیش کیا جائے اور ظاہری شعائر و مراسم کی پابندی پر زور نہ دیا جائے

اس وقت اصولاً تقریباً تمام ممالک نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ حکومت و سلطنت کی بہترین صورت جمہوریت ہے اور سرمایہ دارانہ ذہنیت نے جو مصائب دنیا پر توڑ رکھے ہیں ان کا علاج سوائے اشتراکی اصول کے اور کوئی نہیں ہو سکتا پھر کیا سوائے اسلام کے دوسرا مذہب کوئی اور ہے جو اس بات کا حامی ہو۔ سوال نہ بنو عباس کا ہے نہ بنو امیہ کا، نہ دولت فاطمیہ کا نہ ہندوستان کے دَورِ مغلیہ کا بلکہ غور طلب امر صرف یہ ہے کہ اسلام کی اصل تعلیم کیا ہے۔ اگر عہدِ رسالت کے بعد اس پر عمل نہ کر کے لوگوں نے بجائے جمہوریت کے مستبدانہ حکومتوں کی بُنیاد ڈالی ہو تو اسلام موردِ الزام نہیں ٹھہرتا اور اگر آج بھی اس تعلیم کو پیش نہیں کیا جاتا تو اس میں قصور ہمارے قائدینِ مذہب کا ہے نہ کہ اسلام کا

تمام نوعِ انسانی کو ایک مرکز پر لانے کے لئے جو جذبہ عملاً کوئی خدمت کر سکتا ہے وہ " اخوتِ عامہ " کا جذبہ ہے اور اگر اس کے خلاف کوئی تعلیم پیش کی جاتی ہے (خواہ وہ اصول سے تعلق رکھتی ہو یا فروع سے، شعائر سے وابستہ ہو یا عقائد سے) کبھی صحیح اسلامی تعلیم نہیں ہو سکتی

اس وقت اسلام کے اصطلاحی معنی خواہ کچھ ہی کیوں نہ قرار دے لئے گئے ہوں، لیکن حقیقتاً وہ ایک ایسا بسیط مفہوم رکھتا ہے کہ اس کو ہم کسی طرح محدود کر ہی نہیں سکتے کیونکہ اسلام نام ہے صرف استعلاء کا، عروج و ترقی کا، جدو جہد کا، کردار و عمل کا، ایک ایسی " لامذہبیت " کا جو تمام مذاہب کو ایک مرکز پر لانے کی اہلیت رکھتی ہے۔ اور شعائر و مراسم سے بے نیاز ہو کر صرف پاکیزگی اخلاق اور تکمیلِ تمدن کی حامی ہے

پھر چونکہ اس نکتہ کو مسلمان فراموش کر چکے ہیں اور مذہب کی صحیح تعلیم کو انسان کی خود غرضانہ ذہنیت خراب کر چکی

ہے ، اس لئے عام طور پر یہی باور کیا جاتا ہے کہ یہ ساری خرابیاں تعلیم مذہب کی ہیں اور اسی بنا پر تمام اسلامی ممالک میں وہ ردّ عمل ظاہر ہو رہا ہے جس کا دوسرا نام کفر و ارتداد رکھا گیا ہے ۔ لیکن باور کیجئے کہ یہ حالت عرصہ تک قائم نہ رہے گی اور اس انقلاب کا نتیجہ یقیناً استیصال مذہب کی صورت میں ظاہر ہوگا اگر اس کے اصلی خط و خال پیش نہ کئے گئے

ممکن ہے جو مفہوم میں نے اسلام کا پیش کیا ہے وہ اس وقت تعجب و نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے ، لیکن وہ وقت آنے والا ہے ، جب ایک ایک شخص وہی کہے گا جو میں کہہ رہا ہوں - اور اسلام تمام دنیا پر حاوی ہو کر رہے گا

پھر ہو سکتا ہے کہ اس کی صورت دوسری ہو ، اس کا نام کچھ اور ہو ، لیکن اس کا مفہوم وہی ہوگا جو آج میں کہہ رہا ہوں اور اُس کے خد و خال وہی ہوں گے ۔ جنھیں آج میرا قلم پیش کر رہا ہے

صوبۂ بہار میں تعمیر مساجد کا بے محل سوال

اس وقت صوبۂ بہار جس دردناک تباہی میں مبتلا ہے ، اس کی حقیقت کسی سے مخفی نہیں اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ ہندستان کے ہر گوشہ سے امداد و ہمدردی کے جذبات ظاہر کئے جا رہے ہیں ۔ لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک جو اعانت کی گئی ہے وہ ہندستان ایسے وسیع ملک کو دیکھتے ہوئے کسی طرح قابل ستایش نہیں سمجھی جا سکتی اور ضرورت ہے کہ ہر ادارہ اور ہر انجمن عملاً اس میں حصہ لے اور ہر وہ شخص جو دن میں چار پیسے صرف کر سکتا ہے ، ایک پیسہ بچا کر بہار کے مصیبت زدہ انسانوں کے لئے علحدہ کر دے بہر صورت تو فراہمی زر کی ہوئی ، لیکن اسی کے ساتھ دوسرا اہم سوال اس کے صرف کا ہے ۔ یعنی یہ کہ اس رقم کو کس طرح اور کس کام میں خرچ کیا جائے

اس وقت تک صورتِ حال یہ تھی کہ حکومت کے علاوہ چند پرائیوٹ امدادی کمیٹیاں بھی کام کر رہی تھیں اور چونکہ مولویوں کا عنصر ان میں شامل نہ تھا اس لئے صحیح اصول پر کام ہو رہا تھا ، لیکن اب یہ دیکھ کر کہ ہمارے علماء کرام بھی اس میں حصہ لینے کے لئے آمادہ ہو گئے ہیں اور مسمار شدہ مساجد کی تعمیر کے لئے اپنی جھولیاں لے کر نکل کھڑے ہوئے ہیں ، ہمیں " اندیشہ ہائے دور و دراز " پیدا ہو گئے ہیں اور اگر ابھی سے اس کا سدّباب نہ کیا گیا تو ملک کا بہت سا روپیہ بیکار ضائع جائے گا

حال ہی میں ایک اپیل ان علماء کرام کی طرف سے شائع ہوئی ہے جس میں مسلمانوں کو صوبۂ بہار کی تباہ شدہ مساجد کی طرف متوجہ کر کے چندہ طلب کیا گیا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ صوبۂ بہار کی مسجدیں بالکل تباہ و برباد ہو چکی ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ ان کی تعمیر و مرمت ایک حد تک ضروری ہے ، لیکن سوال یہ ہے کہ جب نماز پڑھنے والے ہی وہاں نہ ہوں گے تو مسجدیں کس کام آئیں گی ــــــــ اس وقت تو اہم ترین سوال موت و زندگی کا ہے ، بھوک پیاس کا ہے تن ڈھلکنے اور سر چھپانے کا ہے ، اس لئے جب تک آپ اس سے فارغ نہ ہو جائیں مسجد و خانقاہ پر توجہ کرنا اور مدرسہ و مقابر پر روپیہ صرف کرنا حد درجہ لایعنی بات ہے

اگر مسلمان اس صدمہ و تباہی سے جانبر ہو گئے تو وہ اُس خدا کی پوجا جس نے انھیں زلزلہ کی مصیبت میں گرفتار کیا تھا، کھلے ہوئے میدانوں اور جھونپڑوں میں بھی کر لیں گے، لیکن اگر وہ بھوک پیاس سے مر گئے تو پھر کیا مولوی لوگ بغیر مقتدیوں کے ان مساجد میں امامت کریں گے

جو رقم کسی ایک مسجد کے تعمیر یا مرمت میں صرف ہوگی، اُس سے ہزار بھوکوں کو کھانا کھلایا جا سکتا ہے، اس لئے بہ حالت موجودہ انسانی تباہیوں پر مساجد کی تباہی کو ترجیح دینا اور لوگوں کی توجہ کو بجائے حیات انسانی کے اینٹ اور چونہ کی طرف مائل کرنا۔ نہ یہ کہ خلاف عقل ہے بلکہ اقتضاء مذہب کے بھی منافی ہے۔ اور پھلواری شریف میں جو مرکزی کمیٹی تعمیر مساجد کے لئے قائم ہوئی ہے اسے توڑ دینا چاہئے کیونکہ ایک پیسہ بھی اس وقت اس کام میں صرف کرنا عقلاً و شرعاً دونوں طرح ناجائز ہے

مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ کوئی رقم ایسی کمیٹیوں کو نہ دیں جو تعمیر مساجد کے لئے قائم ہوئی ہیں کیونکہ ابھی یہ کام بالکل قبل از وقت ہے۔ اور سب سے پہلے ہمیں اُن یتیم بچوں کی پرورش کی طرف متوجہ ہونا ہے جو پڑے ہوئے سسک رہے ہیں، اُن بیواؤں کی اعانت کرنا ہے جن کا کوئی سر دھرا موجود نہیں اور اُن ضعیفوں کی مدد کو پہونچنا ہے جن کے جوان جوان بیٹے نذر اجل ہو چکے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ تعمیر مساجد کے سلسلہ میں، بہت سے مزدور کام سے لگ جائیں گے، لیکن کیا مکانات کی تعمیر سے یہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا، اور کیا دوسرے امدادی کاموں سے روپیہ لوگوں میں نہ پھیلے گا۔

زبانِ اُردو کے ارتقائی منازل

(سلسلۂ ماسبق)

زبان فارسی کے ہندو ادیب عہد مغلیہ نے بہت سے ہندو ادیب پیدا کئے، ہندو منصبداروں میں اکثر امرا فارسی زبان میں مہارت رکھتے تھے، اور وہ اپنی اولاد کو فارسی کی تعلیم دلایا کرتے تھے عہد اکبری کے بعد نسلاً بعد نسلٍ یہ سلسلہ قائم رہا۔ چنانچہ عہد جہانگیری میں فارسی زبان کا ایک بہت بڑا ہندو ادیب رائے منوہر توسی تھا، ابن محمد معتیم الہروی لکھتا ہے،

رائے منوہر پن رائے لون کرن، خدمت شاہزادہ سلیم خط و سواد بہم رسانده شعر میگوید، توسی" تخلص دارد" (تاریخ ابن محمد معتیم ہروی)

جہانگیر فارسی ادب میں جو بلند مرتبہ رکھتا ہے، وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں اسیر اسکے روزنامچہ (تزک جہانگیری) کی ہر ہر سطر شاہد ہے، مرزا سرخوش نے اسکی عروض دانی کے متعلق ایک عجیب روایت درج کی ہے، (کلمات الشعرا) ایسے ماہر ادیب کی صحبت میں رائے منوہر ادب کے کس نکتہ و رمز سے ناواقف رہا ہوگا؟ عہد شاہجہانی میں ایک ہندو شاعر تھا جو "برہمن" تخلص کرتا تھا۔ مرزا سرخوش لکھتے ہیں

برہمن افضل خانی طبع درست داشت در ہندوان بسیار غنیمت بوده ..... سلیقۂ انشا پردازی ہم داشت (کلمات الشعرا ص ۲۱)

شاہجہاں نے حکم دیا کہ مشاعرہ ہو، برہمن نے یہ تازہ بیت کہا تھا پڑھ دیا

مرا دلے است بہ کفر آشنا کہ چندیں بار　　بہ کعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ برہمن کس پایہ کا شاعر تھا اور یہی نہیں بلکہ مرزا سرخوش کی روایت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے، کہ "برہمن" کے علاوہ فارسی کے اور بھی شعرائے ہنود تھے ——— عہد متاخرین میں بھی فارسی کے بہت بڑے بڑے ہندو ادیب و شاعر پیدا ہوئے ایں بھگوانداس ہندی اور بندرابن داس خوشگو بہت بلند درجہ رکھتے ہیں، یہ حضرات نہ صرف نکتہ سنج شاعر تھے، بلکہ معتبر تذکرہ نگار بھی تھے، ان لوگوں نے فارسی کے شعرائے متاخرین و معاصرین کے حالات و کلام سے بحث کی ہے، "سفینۂ ہندی" اور "تذکرۂ خوشگو" کے قلمی نسخے پٹنہ اورینٹل لائبریری میں ہیں یہ کتابیں ہندو مسلمانوں کے روابط اور رجحانات پر کافی روشنی ڈالتی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے، کہ فارسی زبان ہندوؤں کے درمیان کس بلند معیار پر رائج تھی

خطاطی میرے پاس عربی اور فارسی مخطوطات کا ایک مختصر سا مجموعہ ہے، اس میں بعض کتابیں ہندو انشا پردازوں کی تصنیف ہیں، لبعض ہندو خطاطوں کی نقل کی ہوئی ہیں تفصیل ملاحظہ ہو،

نادرات الثاقب۔ یہ کتاب فن بلاغت کے متعلق ہے، خط نستعلیق، نہایت ہی پاکیزہ اور جالب نظر ہے رائل سایز کے ۱۲۶ صفحات کو محیط ہے، عنوان سرخ روشنائی سے لکھے ہوئے ہیں مصنف کا نام شیو پرد ہان مہاراجہ گوپال سنگھ بہادر متخلص بہ ثاقب ہے، اس کتاب پر کئی جگہ خود مہاراجہ صاحب بہادر کی خاص مہریں ثبت ہیں سرورق پر فرمانروائے اودھ واجد علیشاہ کی مہر بھی درج ہے، یہ کتاب سنہ ۱۲۹۰ھ میں لکھی گئی، اور سنہ ۱۲۹۲ھ میں مہاراجہ صاحب نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر شہریار اودھ کی خدمت میں پیش کی چنانچہ خود مہاراجہ کے

قلم سے کتاب کے شروع میں یہ عبارت ثبت ہے ،

عرضہ داد اقل عباد، خانہ زاد ازلی اعتقاد، شیو پرشاد مہاراجہ جے گوپال سنگھ بہادر بالادب تاریخ نیک دوم شہر ربیع الاول یوم عید الجمعہ ،

ابتدا اور آخر میں یہ الفاظ بھی نظر آتے ہیں

" مصنفہ و محررہ دگند رانیدۂ خانہ زاد موروثی "

اس کے بعد آپ کے نام کی مہر درج ہے ، مہاراجہ صاحب قوم کایست سری باستب سے تعلق رکھتے ہیں، آپ کا خاندان شاہان اودھ کے زمانہ میں اعیان و اشراف میں شمار ہوتا تھا آپ کے والد کا نام بینی پرشاد ہے ، آپ شیام سندر لال سرشار کے نواسہ ہیں، ثاقب کی یہ کتاب فارسی میں ہے ، انھوں نے صنائع و بدائع کے متعلق اس میں بہت سے نقوش بنائے ہیں ساری صنعتوں کی مثال میں ایسے اشعار پیش کئے ہیں جن میں واجد علی شاہ کی مدح ہے ، یہ اشعار خود ثاقب کی فکر کا نتیجہ ہیں اس لئے یہ کتاب اور بھی قابل قدر ہے ، بلاغت کے متعلق اگلی کتابوں میں متقدمین کے کلام سے لوگوں نے مثالیں پیش کی تھیں ، اس سے اندازہ ہوتا ہے ، کہ ثاقب بلاغت میں صرف ایک کاتب و ناقل کا درجہ نہیں رکھتے تھے ، بلکہ وہ اس فن کے مجتہد کہے جا سکتے ہیں پہلے صفحہ پر ہندو طرز کی ایک تصویر اور گلکاریاں بھی پائی جاتی ہیں ،

اقبال نامہ جہانگیری | معتمد خاں نورالدین جہانگیر کا بخشی تھا۔ اس کی یہ تاریخ عہد جہانگیری کے متعلق نہایت دلچسپ و معتبر ہے ، اس پر ایک مکمل تبصرہ " نگار " میں ہو چکا ہے ، اسی کا ایک قلمی نسخہ سنہ ۱۲۲۱ھ میں بمقام کلکتہ مرتب ہوا تھا اس کے آخر میں یہ عبارت درج ہے ،

" برائے خاطر عزیز اندر رام بہ خط خام گمنام رام سکھ پنڈت "

مجمع الصنائع | یہ کتاب بھی فن بلاغت میں ہے ، سنہ ۱۱۶۱ھ اس کی تاریخ تصنیف ہے ، فن بلاغت پر اس سے جامع کتاب میری نظر سے نہیں گذری ، اس کے پہلے صفحہ پر ایک مہر ثبت ہے ، کتابت نہایت عمدہ ہے ، اس کے آخری سطور یہ ہیں

" ایں نسخہ خجستہ ایام مسمی بہ مجمع الصنائع بعزہ ربیع الاول سنہ یکہزار و دو صد و سی و ہشت (۱۲۳۸) ہجری علی صاحبہا افضل الصلوٰۃ والسلام برائے خاطر شریف وطبع لطیف معدن الجود، وحق پرست لالہ صاحب قبلہ جناب لالہ بھوانی دین صاحب ساکن قصبہ بسکھاری بہ خط اذل الانام سالار بخش تجاوز اللہ عنہ سیآتہ بہ اختتام رسید "

شجرۃ الامانی | اس کے مصنف مرزا قتیل ہیں ، یہ رسالہ قتیل نے بلاغت و معانی کے متعلق لکھا ہے ، اور سید امان علی کے نام سے معنون کیا اسی کا ایک قلمی نسخہ ، لالہ بھوانی دین کے ہات کا لکھا ہوا ، میرے پیش نظر ہے ، اس کی آخری عبارت یہ ہے ،

"تمام شد نسخہ شجرۃ الامانی تصنیف مرزا محمد حسن قتیل کاتبہ و مالکہ اضعف العباد بھوانی دین قوم کالیست متوطن قصبہ بکھاری

متعلقہ درگاہ کچھوچھہ بتاریخ یازدہ جمادی الثانی ۱۲۲۹ھ یک ہزار و دو صد و سی و نہ ہجری رقمی یافت"

رسالہ سنہ شمسیہ و قمریہ | یہ کتاب شمسی و قمری سنہ کی تحقیقات کے متعلق ہے، اس کے مصنف قاضی القضاۃ مولنا نجم الدین ہیں اس کا ایک قلمی نسخہ مخطوطہ ۱۲۳۶ھ لالہ بھوانی دین کے کتبخانہ میں تھا، یہ رسالہ خود لالہ صاحب نے نقل کرایا تھا اسی کے ساتھ دو رسایل اور ہیں ایک فلسفہ پر ہے، جو" زمان و مکاں" کے مباحث سے متعلق ہے، دوسرا ضوابط، و آئین عدالت کے متعلق ہے،

ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر نہ صرف تخلیق زبان میں مدد دی بلکہ علوم و فنون کے جس شعبہ پر نظر ڈالئے آپ کو پتہ چلے گا، کہ ہندوؤں نے اس میں ضرور حصہ لیا، شاعری اور اصناف سخن کو چھوڑئے، تصوف، موسیقی، مصوری، تعمیر سارے فنون میں ہندوستانی اثر پایا جاتا ہے،

تصوف | معتمد خاں نے جہانگیر کی فقیر دوستی کے سلسلہ میں ایک دلچسپ روایت لکھی ہے، جلوس کے گیارہویں سال بادشاہ اوجین.... گیا یہاں ایک ہندو سنیاسی کے حالات سنکر بادشاہ خود اس فقیر کے مٹھ پر پہونچا سنیاسی علم ویدانت میں کامل تھا علایق مادی کو یکسر ترک کرچکا تھا، عبادت و ریاضت کے سوا اس کو دنیا سے کوئی سروکار نہ تھا، آبادی سے دور اس کا صومعہ تھا فقیر نے بادشاہ کی پذیرائی کی اور تصوف اسلامیہ اور یوگ (ہندوستانی تصوف) کے اصول و مبادی میں تطبیق دے کر بیان کیا چنانچہ مؤرخ مذکور لکھتا ہے،

"مصطلحات اہل اسلام را با طریق تصوف خود تطبیق دادہ بیان نمود صاحب ایں مقام را" سرب باشی" میگویند یعنی تارک ہمہ"[1]

اس سے جہاں ہندو فقرا کی اسلامی تصوف سے واقفیت کا پتہ چلتا ہے، وہاں دور مغل کے ابتدائی عہد میں مسلمان ادیبوں کی اس کاوش کا بھی حال معلوم ہوتا ہے، جو وہ بھاشا کی اصطلاحات کے متعلق کرتے تھے،

مصوری | دربار اکبری کے مصوروں میں زیادہ تر تعداد ہندو ماہرین فن کی پائی جاتی ہے، ابوالفضل نے "آئین" میں ان کے نام گنائے ہیں لیکن ان میں چار آدمیوں کو سب میں ممتاز بتایا ہے، میر سید علی تبریزی، خواجہ عبدالصمد شیریں قلم، دسونتھ، اور بساون،

دسونتھ ایک کہار کا لڑکا تھا اس نے اپنی ساری زندگی اس فن پر صرف کر دی اس کو اپنے مشغلہ سے عشق تھا، وہ دیواروں پر نقوش بنایا کرتا تھا ایک دن اعلیٰ حضرت (اکبر) کی نگاہ اس پر پڑی، اس کی ذہانت آشکارا

---

[1] اقبال نامہ جہانگیری، وقایع سال یازدہم

ہوئی، اور اعلیٰ حضرت نے خود اپنے ہاتھ سے اس کو خواجہ (عبد الصمد) کے حوالہ کیا، قلیل مدت میں وہ تمام مصوروں سے بڑھ گیا اور اپنے زمانہ کا سب سے اوّل استاد ہوا آخر میں اس کو جنون لاحق ہوگیا، اس نے خودکشی کرلی، وہ اس فن کے بہت سے شاہکار چھوڑ گیا ہے بساون ایک دوسرا مصور تھا، فضائے بعید، وضع نگاری، تقسیم الوان، شبیہ طرازی، اور بہت سے شعبوں میں وہ فایق ہوا، یہاں تک کہ بہتیرے نقادانِ فن اس کو دسونتھ پر ترجیح دیتے ہیں ان کے علاوہ دربار اکبری میں اور تیرہ مصور تھے، جن میں بہ استثنائے تین سب ہندو تھے، ان کے نام یہ ہیں کیشو، مکند، مادھو، جگن، مہیش، کھیم کرن، تارا، سانولا، ہربنس، رام، ان لوگوں کے بہتیرے نقوش آج بھی موجود ہیں ای بی ہیول لکھتا ہے، کہ وکٹوریہ البرٹ میوزیم (جنوب کنسنگٹن) نے حال ہی میں "اکبرنامہ" کا ایک حصہ حاصل کیا ہے، جس میں تقریباً ایک سودس نقوش ہیں ان میں اکثر انہیں مصوروں کی نگارش قلم کا نتیجہ ہیں جن کو ابوالفضل دوسرے درجہ میں لکھتا ہے، لیکن ان میں بعض وہ بھی شامل ہیں جن پر بساون کا دستخط ہے، جس کو اکبر کے مشہور ترین صناعوں میں شمار کیا جاتا ہے، [1]

ای بی ہیول نے اپنی کتاب میں اور ایک معرکۃ الآرا تصویر درج کی ہے، اس میں جہانگیر کے محل کا بائین منظر پیش کیا گیا ہے، ایک صحن ہے، اس میں مزدور کام کررہے ہیں کوئی اینٹیں جوڑ رہا ہے، کوئی گلاوہ لئے جارہا ہے، بہشتی پانی لارہا ہے، بعض لوگ مسالا تیار کررہے ہیں، دو حبشی بھی ہیں۔ ایک عصا لئے کھڑا ہے، دوسرا جھکا ہوا ہے، ایک ضعیف متبرک آدمی جو قرینہ سے شاہی خاندان کا فرد معلوم ہوتا ہے، جھکے ہوئے حبشی کے قدموں پر سر ڈالے ہوئے ہے، مؤلف مذکور کہتا ہے، کہ غالباً اورنگ زیب، محل میں شاہجہاں کو قید کررہا ہے، اور مزدور آمد و رفت کی راہ مسدود کررہے ہیں یہ تصویر اپنی جامعیت و تاثرات کے لحاظ سے بے نظیر ہے، اس کے نیچے "منوہر بندہ" کا دستخط ہے، ای بی ہیول اس کو "منوچر بندہ" پڑھتے ہیں حالانکہ صاف منوہر لکھا ہوا ہے، یہ عہد اکبری کے بعد دربار مغل کا ہندو مصور تھا، چنانچہ تاثیر کہتا ہے،

بہ صنعت گرچہ آدمی بود قادر

یقیں دام منوہر بود ماہر

صاحب غیاث اللغات نے انکار کیا ہے، کہ اس نام کا کوئی نقاش ہندوستان میں نہیں گزرا لیکن یہ ہمارے لغوی کی لغویت ہے، [2]

---

[1] Indian Sculpture and painting ص ۱۹۴-۱۹۵

[2] ملاحظہ ہو حاشیہ غیاث ص ۴۵۷

اسی طرح ای بی ہیول کی کتاب میں امر سنگھ کے لڑکے سورج مل کی ایک شبیہ ہے، اس کے چاروں طرف فارسی اشعار ہیں اور سرخ و سنہری روشنائی سے باریک بیلیں بنائی ہوئی ہیں۔ یہ نقش بھی ایک ہندو مصور "نا نہا" کی نگارش کا نتیجہ ہے،

موسیقی اسلامی موسیقی اور ہندوستانی موسیقی میں بنیادی اختلافات ہیں، یہ اختلاف نتیجہ ہے، قومی فرق و امتیاز، ملکی آب و ہوا، اور مقامی خصوصیات کا، چنانچہ فارسی (اسلامی) موسیقی میں بارہ پردے یا مقامات ہیں، ہندوستانی موسیقی میں سات، بایںہمہ اسلامی ہند کے قبل اہل عرب ہندوستانی موسیقی سے واقف تھے، چنانچہ فرانسیسی عالم جول رو وانیت لکھتا ہے،

کن لك هم لا شك عرفوا طريقة الهنود والطريقة التى يستعملها الصينيون منذ ... ۲۷ سنة قبل المسيح [۱]

اسی طرح وہ (اہل عرب) ۲۷ ق م سے ہندوؤں کے طریقہ اور اس طرز سے جو اہل چین استعمال کرتے تھے بلاشک و شبہ واقف تھے

اسی طرح مسعودی ہندوستان کے ایک آلہ موسیقی کے متعلق لکھتا ہے،

وللهند الكيكلة وهو وتر واحد يمد على قرعة فيقوم العود والصنج [۲]

کیکلہ ہندوستان کا آلہ موسیقی ہے، اس میں ایک تار سرے پر لگا ہوتا تھا پس یہ بربط اور جھانج کے قائم مقام ہے

اسی کو استاد اسکندر شلفون مصر کا ماہر موسیقی "کنکلہ" لکھتا ہے، مسعودی کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ عرب نہ صرف ہندوستان کے آلات موسیقی سے واقف تھے، بلکہ اس نے جو لفظ "صنج" استعمال کیا ہے، وہ ہندوستانی آلہ موسیقی "جھانج" کا معرب ہے، جس طرح لفظ چین کی "چ" عربی میں "ص" سے بدل گئی، اسی طرح "جھانج" کا "جھ" "ص" سے بدل گیا، ہندوستان کا مشہور لغوی علامہ غیاث الدین بھی صنج کو جھانج کا معرب بتاتا ہے

خلیفہ ولید اول کے زمانہ میں ہندوستان میں اسلامی حکومت قایم ہوئی خود خلیفہ بہت بڑا گویا اور ماہر موسیقی تھا، اس نے بہت سی راگنیاں ایجاد کیں چنانچہ جول رو وانیت لکھتا ہے،

وكان الخليفة الوليد شاعراً ملحناً مولفاً فى الموسيقى له الحان كثيرة يعرف على العود ويعرف صناعة الايقاع [۳]

خلیفہ ولید شاعر اور مغنی تھا، فن موسیقی پر اس نے کتاب لکھی اس کی بہت سی راگنیاں ہیں وہ بربط نوازی اور موسیقی کے موازین سے واقف تھا،

اسی طرح ولید ابن یزید ثانی کے زمانہ میں بھی موسیقی کو بہت بڑا فروغ تھا۔ جب وہ تخت خلافت پر بیٹھا۔ تو اس نے یونس کاتب کو طلب کیا، یہ وہی یونس ہے، جس نے ابن سریج، ابن محرز اور غریض کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اس نے راگنیوں کے متعلق ایک کتاب لکھی جو بعد میں موسیقی کی تمام کتابوں کا واحد ماخذ ہوئی۔۔۔

---

[۱] دایرۃ المعارف الموسیقیہ ج ا ص ۷، [۲] مروج الذہب [۳] دائرۃ المعارف الموسیقیہ ج ا ص

ابوالفرج اصفہانی لکھتا ہے،

ولہ کتاب فی الاغانی وملحنیھا کان المرجع الوحید لاھل العصر لم یسبقہ الی مثلہ احد [۱]

گانے اور راگنیوں کے متعلق اس کی ایک کتاب ہے جو اس زمانہ میں (اس فن کا) واحد ماخذ تھی جس کی مثل ایک بھی نہیں ملتی،

ولید ثانی کے عہد میں بقول امیر علی موسیقی کا جنون پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے اندازہ ہوتا ہے، کہ ہندوستان کے ماہرین موسیقی بھی اس کے دربار میں ضرور باریاب ہوتے ہوں گے، کیونکہ اس وقت حکومت سندھ امویہ دمشق کے زیر اثر تھی،

دورِ امویہ کے بعد خلافت عباسی میں متبعین اسلام کو دنیا کے مختلف قوموں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا اور اس لئے آرٹ کے تمام شعبوں میں مختلف عناصر شامل ہو گئے، استاد جول روحانیت لکھتا ہے

وفی حکم العباسیین اتسعت المملکۃ الاسلامیہ وامتدت حدودھا وکان ذلک عصر الابھۃ واذ طرف العربیین علی انہ کان ایضاً عصر اختلاط العرب فیہ واحتکوا بالشعوب المقہورۃ فکان لذلک تاثرات مختلفہ علی سائر الفنون [۲]

عباسیہ کی حکومت میں اسلامی سلطنت وسیع ہوئی اور اس کے حدود دور دراز پھیل گئے اور یہ عربوں کی بزرگی اور شوکت کا زمانہ تھا، باوجود اس کے اس دور میں عربوں کا اختلاط ہوا اور انھوں نے مغلوب قوموں سے روایت کی پس اس وجہ سے تمام فنون پر مختلف اثرات پڑے

اس سے پتہ چلتا ہے، کہ ہندوستان کی اسلامی سلطنت کے قبل ہی سے عربی اور ہندوستانی موسیقی کا امتزاج یا اختلاط ہو چکا تھا، اس کے بعد ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں نے موسیقی سے گہری دلچسپی لی، ای بی ہیول نے اپنی کتاب میں محمد تغلق کی محفل رقص و موسیقی کی ایک تصویر اپنی کتاب میں درج کی ہے [۳] بابر خود بڑا مغنی تھا، اسمٰعیل عادل شاہ کے متعلق فرشتہ لکھتا ہے،

"درعلم موسیقی وشعر علم مہارت افراشتے [۴]"

اسی طرح محمد علی خاں انصاری ابراہیم عادل شاہ کے متعلق لکھتے ہیں

"بہ نغمہ وعلم موسیقی آن شغف داشتہ کہ با جماعت کلاونت وصلت نمودہ ایشاں را خویش وتبار خویش ساختہ [۵]"

ہندوستانی بادفروشوں (بھاٹ) نے اپنے فن کے ذریعہ ہندی اور فارسی کے امتزاج سے عجیب و غریب لٹریچر چھوڑا ہے، ہندوستان کے ان مغنیوں نے بھی اُردو کی تخلیق میں بڑی مدد دی ہے،

---

[۱] کتاب الاغانی [۲] دائرۃ المعارف الموسیقیہ ص ۵۵ [۳] Indian Sculpture painting p. 1 [۴] فرشتہ مقالہ سوم روضہ دوم [۵] بحر المواج

اُردو کا وجود صدیوں کی اسلامی حکومت، عربی و فارسی قبایل کی ہجرت، اخلاق و معاشرت کی تقلید، اختلاط، نے عربی، فارسی اور بھاشا کے امتزاج سے ایک چوتھی زبان تیار کی جسے ہندوستانی کہئے یا اُردو، لفظ اُردو بذات خود دور ارتقا رہی کی پیداوار ہے، یہ نہ عربی ہے نہ فارسی، اُردو جس قوم کی زبان کا لفظ ہے، وہ اسلامی مبلغ بنکر نہیں آئی تھی، بلکہ مُلک گیری کی ہوس پیمائیوں، اور استعماری دست درازیوں نے اس کو ہندوستان میں بھیجا، اس قوم کے داخلہ کے قبل مسلمانوں کی حکومت یہاں قایم ہو چکی تھی، ظاہر ہے کہ اگر مسلمان اشاعت دین کے سلسلہ میں ہندوستان میں آباد نہ ہوتے تو بھی مغلوں کا حملہ ہوتا اس صورت سے لفظ اُردو کا بھاشا میں داخل ہونا ضروری تھا، اس لئے نتیجہ نکلتا ہے، کہ لفظ "اردو" کشمکشِ حیات کا ایک اثر باقی ہے، لہٰذا اس کو صرف مسلمانوں کی لغات سے تعبیر کرنا صحیح نہیں،

اُردو زبان میں جب شعر و ادب کا رواج ہوا تو پھر ہندوؤں نے اسی وسعتِ دل اور فراخ حوصلگی کے ساتھ اس میں بھی حصّہ لینا شروع کیا جس طرح انھوں نے عربی اور فارسی میں حصّہ لیا تھا، ادب اُردو کی تاریخ معروف و معتبر ہندو ادیبوں کے بدلیعہ افکار سے مالا مال ہے، پنڈت دیا شنکر نسیم، پنڈت رتن ناتھ سرشار، لچھمی نرائن شفیق (دکنی)، نے اُردو کی جو خدمتیں انجام دی ہیں ان کو زمانہ اپنی فراموش کاریوں کے باوجود، صفحۂ تاریخ سے محو نہ کر سکا،

جن لوگوں نے سرشار کی "سیر کہسار" اور شفیق کی "چمنستان شعرا" کا مطالعہ کیا ہے، وہ ہندوؤں کی اُردو زباندانی اور مذاق ادب کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں "چمنستان شعرا" گو فارسی زبان میں ہے، لیکن شعرائے ریختہ کے حالات زندگی اور نمونہ کلام پر مشتمل ہے، سیر کہسار بیگمات اودھ کی زبان کا مرقع ہے، اور اس میں لطایف زبان کے متعلق ایسی سحر کاریاں کی گئی ہیں کہ انسان پڑھنے کے بعد" بادۂ سرجوش " کے مزے لیتا ہے

کتب خانہ حیدری آرہ میں "تذکرہ شعرائے ہنود" کے نام سے ایک مطبوعہ کتاب میں نے دیکھی تھی، یہ کتاب اب پٹنہ کے ایک پروفیسر صاحب کے پاس ہے اس میں اُردو کے سینکڑوں ہندو شعرا کے حالات و کلام درج ہیں، خود میرے پاس واسوخت کا ایک مجموعہ مسمیٰ بہ "شعلۂ جوالہ" ہے، اس کا تاریخی نام "ضبط عشق" ہے، جس سے ۱۲۸۱ھ نکلتا ہے، اس میں چند ہندو شعرا کے بھی واسوخت درج ہیں۔ اور ہر شاعر کے مختصر حالات زندگی بھی ملتے ہیں،

منشی طوطا رام شایاں شایاں کا خاندان فرمانروایان اودھ کے دربار سے وابستہ تھا شایاں کے دادا منسارام کو بخشی الملک کا خطاب ملا تھا، منسارام کے جدِ امجد تلسی رام کو نواب آصف الدولہ بہادر نے "رائے" کا خطاب اور زمرد کی ایک انگوٹھی عطا کی تھی جس پر یہ خطاب کندہ تھا،

پھر نواب سعادت علی خاں کے زمانہ میں آپ فوج کی بخشی گری کے عہدہ پر ممتاز ہوئے، شایاں سری باستب کائستھ تھے،

رام سب طرح کیا دلکو بتوں نے جسم رازِ اُلفت سے ہوئے نامِ خدا جب محرم
اور صورت کا نظر آیا بھران کا عالم بھر گئی شکل نظر دیدۂ حیراں کی قسم

طرفہ آہ دل سوزاں نے شرر باری کی
دھوم دوزخ میں ہوا اس آگ کی چنگاری کی

پنڈت اجودھیا ناتھ نوائی پنڈت جی دہلی کے رہنے والے اور جودھپور کی عدالت فوجداری میں ملازم تھے، آپ غالب کے ہمعصر اور ہندوستان کے مشہور شاعر مولنا امام بخش صہبائی کے شاگرد رشید تھے، بلکہ پنڈت جی نے چھ سال کی عمر میں الف با کی ابتدا مولنا مرحوم ہی کی خدمت میں لی، آپ کا واسوخت فارسی میں ہے،

ای جفا پیشہ لبے نیست کہ نالاں تو نیست زندۂ نیست کہ چوں مردہ بزنداں تو نیست
نیست خلقے کہ تہ خنجر بُراں تو نیست گردنے نیست کہ خونش تہ داماں تو نیست

زیر داماں تو خونے کہ شفق می بالد
گل خورشید بود گو ز افق می بالد

لالہ بنسی دھر ہمت آپ کا وطن لکھنؤ تھا یہیں آپ پیدا ہوئے، آپ منشی مینڈو لال متخلص بہ رآز کے شاگرد ہیں آپ کے بیان میں حد درجہ شگفتگی و حلاوت پائی جاتی ہے، منظر نگاری میں آپ کو کمال ہے، فرماتے ہیں

چاندنی رات ہے اور طرفہ سماں طرفہ ہے رنگ صحن گلشن میں بچھا ایک جڑاؤ ہے پلنگ
میں ہوں معشوق کو اپنے لئے آغوش میں تنگ دونوں بے ہوشی میں ہیں دل کی نکلتی ہے امنگ

اس قدر کیف مے عشق میں مغرور ہوں میں
گاہ نزدیک ہوں اس بت کے کبھی دور ہوں میں

خیر یہ تو عہد قدیم کی باتیں تھیں دَور حاضر میں بھی بڑے بڑے ہندو اہل قلم موجود ہیں، مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد (جو راجہ ٹوڈرمل وزیر اکبر کے باقیہ صالحہ میں ہیں) پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق، (گورکھپوری)، منشی پریم چند، لالہ رام سروپ شیدا بی۔ اے لکھنوی، لالہ چندی پرشاد شیدا دہلوی، پنڈت جگن ناتھ پرشاد آنند، منشی پیارے لال رونق دہلوی، لالہ دھرم پال گپتا وفا دہلوی، لالہ جھنومل ناقد دہلوی، شیام سندر فراق، لالہ جگ موہن صاحب

شانتا رام ایم۔ اے، سردار سوہن سنگھ بی اے، مفتون اڈیٹر ریاست، مدیر تیج مسٹر مکند بہاری لال نادم وغیرہ اس زمانہ میں اُردو کے ادیبوں میں شمار کئے جاتے ہیں، فراق گورکھپوری کی ایک نظم " ترانہ خزاں " کے عنوان سے ایوان (آہ! مرحوم) گورکھپور میں شایع ہوئی تھی اس کے متعلق زبان اُردو کے مسلم ادیب مجنوں گورکھپوری فرماتے ہیں،

" فراق نے جس نظر سے خزاں کو دیکھا ہے، اس نے خزاں کی ماہیت کو بدل دیا ہے، خزاں کے جو رموز فراق نے بیان کئے ہیں ان سے اُردو اور فارسی زبانیں محروم ہیں انگریزی میں البتہ شیلی، اور کیٹس کی نظمیں مجھے بے طرح یاد آرہی ہیں حالانکہ " ترانہ خزاں " ان دونوں سے جداگانہ نوعیت رکھتی ہے " (ایوان، بابت مارچ ۱۹۳۱ء)

جناب فراق گورکھپوری کا خاندان فارسی اور اردو کی خدمات کے لئے ممتاز رہا ہے، ایوان اشاعت نے آپ کے بزرگ جناب منشی گورکھ پرشاد متخلص بہ عبرت کی ایک مثنوی " حُسن فطرت " شایع کی تھی،

پیشوا کے " رسول نمبر " (بابت ۳۲ء) میں اکثر ہندو اہل قلم کی نظمیں و مقالے شایع ہوتے ہیں، ہمارے عہد میں ایک اور ہندو ادیب چمپت رائے جین ہیں، جو آجکل یورپ میں جین دھرم کی تبلیغ میں سرگرم ہیں، آپ انگریزی کے ایک مشہور مصنف ہیں، مذہبیات و فلسفہ، تاریخ و اساطیر سے آپ کو خاص شغف ہے، آپ نے انتہائی دریادلی سے کام لے کر اپنی ہزاروں روپے کی کتابیں جین سدھانت بھون (آرہ) میں وقف کر دی ہیں، حال میں آپ نے " جواہرات اسلام " کے نام سے اُردو میں دو کتابیں لکھی ہیں، پہلی کتاب میں فارسی شعرا، خصوصاً رومی کے کلام سے اپنی جینی معتقدات کا موازنہ کیا ہے، اور اسلام کے صوفیانہ عناصر پر مفصل بحث کی ہے، دوسری کتاب میں اردو شعرا کے کلام کا اقتباس درج ہے، اس میں شک نہیں کہ کتاب کے اندر زبان کی بعض خامیاں ہیں لیکن عہد حاضر میں ہندو مسلمانوں کے جو تعلقات ہو رہے ہیں ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے، جین صاحب کی یہ کتاب ملک کے لئے " الہام " کا درجہ رکھتی ہے کاش ہمارے دوسرے وطنی بھائی بھی اسی بنیاد پر قومی عمارت استوار کریں،

عبدالمالک (آروی)

"زبانِ بے زبانی"

ہمارے فاضل دوست جناب اختر حسین صاحب رائے پوری نے یہ فسانہ روسی ادب جدید کے مشہور علمبردار بیبل
کے ایک افسانہ کو سامنے رکھ کر لکھا ہے جس کا عنوان " درخت کے تاثرات " ہے
اُردو میں افسانہ نویسی کا یہ انداز بالکل نئی چیز ہے اور ہمیں مسرت ہے کہ اختر حسین صاحب بڑی حد تک
اس میں کامیاب ہوئے ہیں
اُمید ہے کہ ناظرین نگار جذبات و تخیل کی اس فضا کو سامنے رکھ کر اس کا مطالعہ کریں گے، جو اس رنگ
کے افسانہ نگاری کی اصل رُوح ہے (اڈیٹر)

میں برگد کا ایک عمر رسیدہ درخت ہوں، غیر فانی اور ابدی!

نہ جانے کتنی مدت سے میں تن تنہا اور خاموش کھڑا ہوں۔ برقرار اور بیقرار! بے زبان اور نغمہ زن! یاد نہیں کتنی مرتبہ کڑاکتی سردیوں میں اپنی بے برگ شاخوں سے کوہاسہ کی چادر کو ہٹا کر میں نے فریاد کی ہے، نہ معلوم کتنی مرتبہ آتشیں گرمیوں میں اپنی پیاسی اور حسرت بھری لاتعداد آنکھیں میں نے آسمان کی طرف اٹھائی ہیں۔ نہ معلوم کتنی مرتبہ موسم گل میں عطر بیز نسیم بہار نے میرے بے حس جسم میں سنسنی ڈال دی ہے۔ لیکن کچھ دنوں سے میں لاغر اندام ہو رہا ہوں۔ میرے چہرہ پر جھریاں پڑ گئی ہیں۔ جسمانی تاثرات سے میں بے پروا ہو گیا ہوں۔ میری پتیاں گر گئی ہیں۔ سردیاں اور گرمیاں دونوں میرے لئے یکساں ہیں۔ لیکن بہار! اس کے تصور میں ہی ایک ایسا جادو ہے، اس کے تخیل میں ہی ایک ایسی کشش ہے کہ میری ان بے حرکت رگوں میں نئی زندگی کی بجلی دوڑنے لگتی ہے اور ساتھ ساتھ ایک اندوہگیں پشیمانی خون کی ایک ایک بوند میں گھر کر لیتی ہے

بہار! یہ لفظ کتنا سوگوار ہے اور کتنا جان سپار۔ جب حدِ نظر تک راتوں رات لاتعداد کنول کھل جاتے تھے اور میں اپنے آپ کو پھولوں کے ایک ناپید اکنار سمندر میں کھڑا پاتا تھا تو یہ محسوس ہونے لگتا کہ جہان رنگ و بو میں سورج نئی شان کے ساتھ جگمگا رہا ہے۔ اس شان کے ساتھ کہ اس میں تپش نہیں صرف چاند کی حلاوت رہ گئی ہے۔ پیمانۂ دل مسرت اور احسان سے چھلکنے لگتا تھا۔ لیکن اس احسان میں اطمینان نہ ہوتا تھا۔ وہ مسرت اس روحانی سوز کو دبا نہ سکتی تھی جو تمناؤں کے سامنے ہمیشہ

درد کے ترانے الاپا کرتا ہے۔ حسن و جمال کی اس جولانگاہ میں بڑھاپا اپنی دزدیدہ نگاہیں ڈال کر یکایک مسکرا دیتا تھا اور میرے سکون و اطمینان کو ایک کھٹک ارماں سے جاتی تھی

تخیل تمناؤں کے آغوش میں پروان چڑھتا ہے۔ جب بڑھاپے کا خیال مجھے بے چین کرتا تو میں ایک جہانِ نو کی بنا ڈالتا ——— ایسا جہان جس میں برگد کی شاخوں میں بھی پھول لگتے ہیں، رنگا رنگ کے پھول، جن سے ٹہنیاں دلہن بن جائیں ایک شاخ میں یاسمین دوسری میں گلاب تیسری میں صنوبر ——— پستی سے لے کر بلندی تک میں گل بداماں ہوتا! آہ وہ تصور کتنا روح پرور تھا؟ لیکن عہدِ کہن کی ان داستانوں میں کیا رکھا ہے۔ اب میں بوڑھا ہو رہا ہوں اور یہ "امر بیل" ——— لامحدود اور لازوال ——— پھلتی اور پھیلتی ہوئی یہ "امر بیل" اب مجھ پر محیط ہو چکی ہے۔ میں عظیم الشان اور پُر وقار ہوں لیکن میری عظمت اور شوکت نے ہی مجھے اس چنچل "اینلی بیل" کے آگے بے بس کر دیا ہے۔ ایک دن یہ ننھی اور حقیر بیل میرے قدموں سے لپٹی رہتی تھی لیکن آج اس نے میرے جسم کو زنجیروں سے کس دیا ہے اور میری مغرور گردن کو خم کرنا چاہتی ہے

اس کی گرفت کتنی جانکاہ ہے ——— کتنی روح فرسا اور دردناک! تمنا کی طرح لادوا اور فراق کی طرح یاس انگیز، جو میرے ناتواں جسم کو پیس کر اس کی تازگی اور شگفتگی سلب کر لینا چاہتی ہے۔ اور میں ——— حرماں نصیب اور بدبخت "میں" ——— ماضی کی یاد میں اشکبار اور مستقبل سے خوف زدہ "میں" ——— اس بے حقیقت بیل کی خواہش کے آگے مائل بہ خود سپردگی نظر آتا ہوں

تاہم گاہے گاہے محسوس ہوتا ہے کہ اس بیل کے مس میں کوئی مقناطیسی کشش ہے۔ جس طرح کسی باکمال کے رباب کی جھنکار خفتہ اور مُردہ راگوں کو زندہ کر دیتی ہے، جس طرح موت کی ہچکیاں بھرتے ہوئے بھی سراپا بہار کی رنگینیوں سے دوچار ہو کر دم بھر کے لئے جوان ہو جاتا ہے، جس طرح کسی رہزنِ عقل و ہوش کے شانوں پر سر رکھ کر زاہد خود فریب کی پسلیاں پھڑکنے لگتی ہیں ——— ہاں اسی طرح میرے تمام جسم میں، میری ٹہنیوں میں اور میری پتیوں میں، دل کی ایک ایک دھڑک اور نبض کی ایک ایک جھپک میں اس کا مس ایک دلنواز بے دلی اور ایک دھندلی سی تمنا پیدا کر دیتا ہے۔ اس وقت دفعتاً میں سوچنے لگتا ہوں کہ میری ٹہنیوں میں اتنی ہی لچک ہوتی جتنی اس "امر بیل" میں ہے تو میں اس کی گرفت کو اور بھی مضبوط کر دیتا اور اس کے بوسہ کو پوری زندگی کی دراززی عطا کرتا۔ لیکن الٰہی! تو نے مجھے ایسا کیوں بنایا کہ میں محبت حاصل کر سکتا ہوں واپس نہیں کر سکتا۔ دامِ عشق میں گرفتار ہو سکتا ہوں گرفتار نہیں کر سکتا۔ پریت کے گیت سمجھ سکتا ہوں گا نہیں سکتا

جب بادۂ عشق میں سرشار ہو کر جذباتِ دل کو عالم آشکار کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو یکایک مجھے اپنی بے حسی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اور ارمانوں کے ہجوم پر جیسے اوس پڑ جاتی ہے۔ میری بے تابی کا صرف ایک ثبوت ہے۔

پتیوں کی خاموش جنبش! ان کی دھیمی دھیمی سرسراہٹ سوز نہانی کی سرگرم ہے۔ اُف اتنا تنومند و توانا ہو کر بھی ایک شرمیلی بیل کے آگے میں کتنا مجبور ہوں

بہار، نسیم، گل و بلبل، آہ و زاری ——— رنگین خوابوں کا ایک میلہ! لیکن زندگی کی بت جھڑ میں بہار کی اُن محفلوں کو میں کیوں یاد کرتا ہوں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری دنیا ان سے محروم ہو چکی۔ اب میں ایک دوسری دنیا میں رہتا ہوں جہاں غنچے نہیں چٹختے، جہاں ارمانوں اور حسرتوں کے سوا کچھ نہیں۔ وہ بھی ایسی کہ ان میں کیف و سرور نہیں غم و غصہ کی جھلک رہ گئی ہے۔ اب بھی میرے ارد گرد بہار ان میں زمین گل فروش بن جاتی ہے اور ذرہ ذرہ فرطِ انبساط میں متوالا ہو جاتا ہے۔ میرا دل بھی بھر آتا ہے۔ لیکن اس میں محبت کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ دریائے حسن کے بیچ و بیچ کھڑا ہو کر بھی میں ایک لگاؤ محسوس کرتا ہوں گویا ستاروں۔ سے مصروف گفتگو ہوں۔ جس محفل سے میں اُٹھ آیا اس میں شمول کی آرزو نہیں کرتا۔ میری تمامتر توجہات ایک دوسرے ہی جہان کی تعمیر کے لئے وقف ہوتی ہے جس کا تخیل میرے ناسوروں کو بر جاتا رہتا ہے ——— یہ بیل فنا پر حاوی اور ابد و بقا کی ندیم ہے۔ جب میں زمین کے دامن میں لیٹ جاؤں گا تو شاید وہ میرے جسم سے لپٹی رہے گی اور اس کی باقی ماندہ طاقت کو چوستی رہے گی۔ ایک وہ دن تھا جب اس کا بیج اُبھرا تھا اور میں جوان تھا۔ میرے سڈول جسم میں مسرت کی اُمنگیں موجزن تھیں اور رُوح کا ایک ایک تار فطرت کے رباب کے ساتھ غزل خواں تھا۔ میری وسیع جڑوں کے وسط میں اس کے ننھے سے بیج نے سر نکالا۔ اس کی زرد کونپلوں نے سہارے کی التجا کی اور مایوس و ناکام مرجھانے لگیں۔ ہاں، اس وقت اسے گلے لگا کر مجھے کتنی خوشی ہوئی تھی۔ ایسی جیسے بچے کو گود میں لے کر باپ کو ہوتی ہے۔ ایک عرصہ تک اس کی بانہیں دل میں یہی جذبہ پیدا کرتی رہیں۔ لیکن چشم بد دور، رفتہ رفتہ وہ ایک نئے سانچے میں ڈھلنے لگی اور اب اسے چھونے کے بعد وہ معصومیت اور شفقت محسوس نہ ہوتی تھی۔ اس میں ایک ایسا عجیب بانکپن پیدا ہو گیا جو میری آزادی پر پھندے ڈالنے لگا۔ جب کبھی کچھ سوچنا چاہتا تو اسی کی یاد آتی گو کہ اس یاد میں حیا بھی تھی اور تمنا بھی، غرض کے ساتھ اس پر مرمٹنے کی آرزو بھی، پیاس کے ساتھ سکون تھا اور لاگ کے ساتھ ایک لگاؤ۔ آج جس جذبہ کی گہرائیوں تک میں پہونچ چکا ہوں۔ ان دنوں اس کی سطح کو بھی نہ دیکھ سکا تھا۔ اس انقلاب پر میں ہمیشہ تصویر حیرت بنا رہتا اور یہ حیرت بھی مسرت، نفرت، تمنا و اطمینان سے لبریز تھی۔

میرے قدموں پر ایک چھوٹا سا پتھر پڑا ہوا تھا جس پر گاؤں کی عورتیں اکثر سیندور اور چندن ملا کرتیں۔ کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ ان کی نازک انگلیاں مجھ پر سیندور کی ایک گہری لکیر کھینچ دیتیں۔ یہ بھی دیکھا کہ کوئی دوشیزہ بڑی سادگی سے میرے سنگین جسم کو اپنے سیمیں بازوؤں میں لپیٹ لیتی، نرم ہونٹوں سے میرے آہنی تنے کو بوسہ دیتی اور اس سنگ جبیں کو آنسوؤں سے نہلا کر چلی جاتی تھی شاید اس سے اس کے قلب حزیں کو کچھ قرار ہو آتا تھا

دنیا بھی ایک درخت ہے جیسے حسینانِ عالم اس بیل کی صورت دام بلا میں گرفتار کئے ہوئے ہیں۔ لیکن مجھ پر

ان کے ناز و نیاز کا مطلق اثر نہ ہوتا تھا۔ ہاں جب کوئی بدبخت میرے دامن کو تھام کر آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آوازیں کہتی " دیوتا میری مُراد کب برآئے گی " تو میں بھی پسیج جاتا اور اپنے پتوں کو ہلا کر کچھ کہنا چاہتا۔ لیکن خبر نہیں کہ میرے اشاروں کو وہ سمجھتی تھی یا نہیں۔ میں سوچتا رہ جاتا کہ کاش بے گل و ثمر برگد نہ ہو کر میں پھولوں کا ایک پودا ہوتا۔ کم از کم اپنی ہمدردی کا اظہار تو کر سکتا۔ جب حُسن کی وہ مورت مجھے چھوتی تو مُرجھائے ہوئے پھول پھر کھل جاتے۔ اور اس کے قدموں پر اشکبار برس کر گویا میرا پیغام پہونچا دیتے ـــــــــ لیکن دل ہی دل میں یہ منصوبہ باندھتا رہ جاتا اور وہ چلی جاتی

تاہم، ان کی قرابت میرے جسم میں تھرتھری پیدا نہ کر سکتی تھی۔ میں از سرتا پا کانپنے نہ لگتا تھا۔ لیکن کبھی جب کوئی دوشیزہ میری نازک اندام بے زبان بیل کی کوپلوں کو توڑ کر مجھ پر بکھیر دیتی تو میرے دل پر چوٹ لگتی تھی۔ لیکن جتنا غم و غصہ ہوتا اسے ظاہر نہ کر سکتا تھا۔ جمال باری سے دل ہی دل میں مَیں فریاد کرتا اس اُمید پر کہ وہ روح کی آواز کو پہچانتا ہے " یارب اس عورت کو بھی اتنا ہی کرب و الم نصیب ہو " وہ بیچاری مجھے دیوتا مانکر پھولوں کی نذر چڑھاتی اور اسے میں بددعا دیتا۔ محبت کے نشہ میں مَیں مدہوش تھا۔ حتیٰ کہ عقل و خرد سے بھی واسطہ نہ رہا تھا۔ کتنی عجیب و غریب تھی وہ محبّت ؟ کاشکہ میں جانتا ہوتا ! کاشکہ میں جانتا ہوتا !!

لیکن کیا سب کچھ سمجھنے کے باوجود میں اس دام میں گرفتار نہ ہوتا ؟ گو کہ یہ بیل آج میرے جسم کے ایک ایک بند پر حاوی ہو چکی ہے تاہم اس کا مس میرے لئے کتنا ولولہ انگیز ہے۔ محبّت آئینہ کی طرح شفاف ہوتی ہے۔ ہر آدمی اس میں اپنا عکس رُخ دیکھتا ہے اور ایک بار چور چور ہو جانے کے بعد یہ آئینہ کبھی ثابت نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ متواتر کوشش کے بعد اس کے ٹکڑوں میں یکجائی ہو جائے لیکن وہ صفائی کہاں سے آئے گی ؟ آئینہ میں ہمیشہ کے لئے بال پڑ جاتا ہے۔ عشق وار پر وار سہتا ہے، پیہم ناکامیوں کے بعد بھی اُف نہیں کرتا۔ لیکن وہ کمال درجہ خوددار اور غیور ہوتا ہے۔ صرف ایک جھڑکی اس کی شمع زندگی کو گل کرنے کے لئے کافی ہے۔ آج یہ بیل میری زندگی میں اتنا دخل حاصل کر چکی ہے۔ لیکن اس کشش میں عشق کا جزو بھی نہیں۔ یہ بیکلی عشق کی پرتو نہیں بلکہ اس کی یادگار ہے اور بس

داستان محبّت کی جب ورق گردانی کرتا ہوں تو دل میں ٹیس سی اُٹھتی ہے۔ محبّت سے جو اُمیدیں وابستہ تھیں وہ سب تشنۂ تکمیل رہیں اور اس کا سزاوار میں ہرگز نہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ خدا نے مجھے، اس " امر بیل " سے اور مجھے دیوتا سمجھنے والی ان الھڑ شادانوں سے انصاف نہیں کیا۔ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی ہم اپنے کسی حق سے ـــــــــ الیساحق جو ناقابل بیان ہے ـــــــــ محروم کر دئے گئے۔ جب یہ خود فریبی چٹکیاں لینے لگتی ہے تو آرزو ہوتی ہے کہ کاش میں درخت نہ ہوتا انسان ہوتا۔ ایک دائرہ میں زندگی محدود نہ ہوتی، اپنی پچھائیں

کوتاکتے تاکتے میں یوں بوڑھا نہ ہوجاتا۔ میری زندگی بھی رواں، دواں، اور جوان ہوتی تاکہ محبت کا اظہار کرسکتا اور ——— اس طرح بے زبان و بیقرار نہ ہوتا!

لیکن کیا قلب انسانی میرے جذبات کا احساس نہیں کرسکتا؟ کیا انسان کی محبت اتنی مختلف ہے؟ کیا اس کی فریاد کی کوئی لے ہے؟ کیا اس کے نالوں میں کوئی لے ہے؟ کیا میرے جذبات کی ترجمانی کے لئے وہ گہری سانس کافی نہیں جو طوفان کی آمد کا پتہ دیتی ہے؟ کیا انسانوں کی دنیا میں بھی محبت کا پھول اندھیرے میں کھلتا اور مرجھاتا نہیں ہے؟ کیا ان میں بھی محبت کی انتہا یہ نہیں ہے کہ گفتگو کے لئے الفاظ ناکافی ہوں اور صرف سانسوں کا اتار چڑھاؤ جہان معنی میں ارتعاش پیدا کرسکے؟ کیا ان میں بھی تمنا کے بعد پشیمانی اور فریاد کے بعد شرمساری پیدا نہیں ہوتی؟ ندی کی طرح انسان ہمیشہ گردش میں ہے اور ہم پہاڑ کی طرح اٹل ہیں۔ لیکن ہم اس سے کہیں زیادہ عمر دراز اور مستقل ہیں۔ انسان کی محبت ایک شمع ہے جو بجھنے کے لئے روشن ہوتی ہے۔ ہماری محبت کی مثال جگنو سے دی جاسکتی ہے جو تاعمر جلتا ہے اور بعد از مرگ بھی روشن رہتا ہے

ایک زمانہ گذرا۔ ان دنوں مجھے اس " امربیل " کی ناز برداری سے فرصت نہ تھی۔ اوّل اوّل اس کے بوسوں میں مجھے ایک لذت محسوس ہونے لگی تھی۔ اور اس نئے جذبہ کے اسباب و اثرات معلوم کرنے میں میں اتنا محو تھا کہ گرد و پیش سے قطعاً بے نیاز ہوگیا تھا بھولے بھٹکے اپنے ماحول پر ایک آدھ نگاہ غلط انداز ڈال دیا کرتا تھا۔ میں جس واقعہ کا ذکر کررہا ہوں وہ روز پیش آتا تھا اور اس سے باخبر ہوتے ہوئے بھی میں بے خبر تھا۔ تاہم نادانستہ طور پر یہ حادثہ مجھ پر ایسا گہرا نقش چھوڑ گیا کہ اسے میں آج تک نہ بھول سکا

جو بُت میری قدم بوسی کررہا تھا، اس کی پوجا کے لئے صدہا عورتیں آتی تھیں۔ روز کوئی پُرانی پُجارن غائب ہوجاتی اور اس کی جگہ لینے کے لئے کوئی نئی حُسن کی دیوی آجاتی تھی۔ یہ نئی نویلی شرم کے بار سے دبی جاتی تھی۔ نرگسی آنکھیں زمین میں گڑی جاتی تھیں اور رُخِ پرنور تار نقاب کے اندر بھی عرق عرق ہوجاتا تھا ——— مجھے بے جان سمجھ کروا کبھی میرے جسم کا سہارا لیتی اور کبھی اپنے ناخونوں سے میرے تنے کو کُریدا کرتی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکتا اور میں گہری سانس کھینچ کر خاموش ہوجاتا تاکہ مبادا وہ سہم نہ جائیں۔ ایک لمحہ کے بعد نقاب ان کے رُخِ روشن کا پردہ دار بن جاتا، پھولوں کے ہار ان کے بیدار جذبات کو تھپکیاں دیتے اور چھاگل کے گھونگرو ان پیروں کو چوم کر رقص کرنے لگتے تھے

ان مہوشوں میں سے ایک کا وتیرہ سب سے جدا تھا۔ نگاہیں سمیٹے سب سے چھپکر وہ میرے پاس آتی اور سر جھکا کر فوراً چلی جاتی تھی ——— اس خوف سے کہ کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ زیبائش سے وہ اتنا ہی دور تھی جتنا کہ چاند۔ نہ اس کو

جبیں پر "کم کم" ہوتا نہ بیروں میں چھاگل۔ اس کی سادگی سفید ساری سے یوں چھن چھن کر نکلتی تھی جیسے بنت البحر نے نہنگ آسا موجوں سے سر نکالا ہو یا دوشیزۂ صبح سفید بادلوں میں تیر رہی ہو۔ اس کی آمد کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ کبھی وہ صبح میں آتی کبھی دوپہر میں اور کبھی دونوں وقت ملے۔ جب وہ شام کو آتی تو اسی "امر بیل" کو تھام کر میری گھنی چھاؤں میں بیٹھ جاتی جب تک سورج شب کے محل میں آرام کرنے نہ چلا جاتا وہ اپنی پُرحسرت نگاہوں سے اس منزل ناتمام کو تاکا کرتی۔ لہرائی ہوئی پگڈنڈی کی خاک شفق کے پرتو سے لالہ گوں بن جاتی جیسے خونِ تمنا کی سرخی ابھر آئی ہو

ماضی ناکامیوں کا آماجگاہ اور مستقبل امیدوں کا آئینہ ہے۔ ماضی افسردگی کے قلم سے اس کے چہرہ پر ناکام آرزؤں کے افسانے لکھا کرتا۔ جب اس کے سینہ سے گہری سانسیں نکلتیں تو میرے پتے بھی ضبط نہ کر سکتے اور پیہم چیخ اٹھتے تھے۔ کبھی اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا اور نہ اس نے کوئی دعا مانگی۔ ہاں گاہے گاہے وہیں بیٹھ کر وہ کچھ گن گناتی ضرور تھی لیکن ان نغموں کو میں نہ سمجھ سکتا تھا

پہلے تو میری توجہ اس کی طرف منعطف ہی نہیں ہوئی لیکن شام کے سناٹے میں جب وہ عموماً ادھر گذرنے لگی تو میری دلچسپی بھی رفتہ رفتہ بڑھتی گئی۔ سورج کے ڈھلتے ہی میں بے تابی سے اس کا انتظار کرنے لگتا اور اس کے آنے میں جتنی تاخیر ہوتی ہولِ دل اتنا ہی بڑھتا جاتا۔ مجھے یاد ہے کہ خلاف معمول ایک روز وہ نہ آئی تو میں دیر تک اس کا انتظار کرتا رہا۔ دامن مغرب میں سورج نے منہ چھپا لیا، لیلائے شب نے نقاب سے سر نکالا، ستاروں کی انجمن منعقد ہوئی چاند کی کرنوں نے اپنا ساز چھیڑا، کہکشاں نے آسمان پر بجلیاں بکھیر دیں ——— پھر بھی وہ نہ آئی!

دو دن، تین دن، سیکڑوں ہزاروں دن آئے اور چلے گئے لیکن وہ نہ آئی یہاں تک کہ میں نے اس کے انتظار سے منہ موڑا اور اپنے منتشر جذبات کا مخزن اسی باوفا "امر بیل" کو بنانے کی کوشش کرنے لگا

میں اسے بھول چکا تھا کہ ایک روز وہ آ گئی ——— ایک ہیبت ناک خواب کی طرح۔ وہ دن بھی مجھے یاد رہیگا گھنگھور بادل چھائے ہوئے تھے۔ غضب کی سردی تھی۔ باد تند کے جھکولے کھا کھا کر "امر بیل" تھر تھرا رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اسے اپنے کس پہلو میں جگہ دوں۔ یکایک دیکھا کہ اسی خاک آلود راستہ پر وہ تیزی سے چلی آ رہی ہے۔ لیکن وہ بدل چکی تھی۔ وہ جمال جہاں آرا بوئے گل کی طرح غائب ہو چکا تھا۔ چہرہ پر اتنی جھریاں تھیں گویا عمر رفتہ نے اپنی آستینوں کو چنا ہو آنکھوں میں حلقہ پڑ گئے تھے۔ ہونٹ سوکھ کر لٹک گئے تھے۔ جب میں نے دونوں تصویروں کا مقابلہ کیا تو وحشت سی ہونے لگی

الٰہی! حسن کو فنا ہے تو عشق کو لازوال کیوں بنایا؟ قریب آ کر نہ اسنے ہاتھ باندھے نہ سر جھکایا اور نہ اس بیل کا سہارا لیا۔ ایک مرتبہ چاروں طرف دیکھ کر وہ مجھ سے لپٹ پڑی اور زار زار رونے لگی۔ آہ! میں اس کے گیت سننے کا آرزومند تھا۔ آنسوؤں کی زبان کو میں کیا سمجھ سکتا

میں نے دیکھا کہ وہ صرف ایک ساری باندھے ہوئے ہے۔ جو جگہ جگہ سے شکستہ ہو چکی تھی۔ بال بکھرے ہوئے پیرخون میں رنگے ہوئے، جسم نازنیں خاک آلودہ۔ روتے روتے وہ کہنے لگی "دیوتا! سب نے مجھے ٹھکرا دیا۔ انسانوں کے رحم و کرم سے میں محروم ہو چکی۔ میں نے بیوفائی کی، احسان فراموشی کی ——— کس اُمید پر؟ محبت نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ محبت؟ فریب، مکر، دھوکا! اس ظالم نے مجھے دین و دنیا کہیں کا نہ رکھا۔ مہذب دنیا اب مجھے عصمت فروش ہرجائی کے نام سے پکارتی ہے۔ دیوتا! کیا تم مجھے اپنے دامن عاطفت میں جگہ دوگے۔ جانتے ہو، اپنے کاندھوں پر کیسے گناہ عظیم کا بار لئے آئی ہوں؟ میں ایک ایسے بچہ کی ماں ہوں جس کا باپ بننے کے لئے کوئی مرد طیار نہیں۔ دیوتا! کیا تم میرے گناہوں کو درگذر کروگے؟"

اس کی فریاد میرے لئے ناقابل برداشت تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اپنی ہمدردی کا اظہار کس طرح کروں۔ کاشکہ شبنم کے کچھ قطرے ہی ٹپک پڑتے جن پر اُسے میرے آنسوؤں کا گمان ہو جاتا

نقاہت کی وجہ سے اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہونے لگی اور وہ بیہوش ہوکر گر پڑی۔ کئی گھنٹے گذر گئے اور وہ اسی حال میں پڑی رہی۔ بعدازاں اس کا جسم یکبارگی لرزا اور پھر اینٹھنے لگا۔ وہ خواب میں بڑبڑانے لگی "کیا عورتوں کو بھی دراصل خدا نے ہی پیدا کیا تھا؟ اور اس بچہ کو؟ ——— اس بچہ کی پیدائش کا ذمہ دار کون ہے؟ خیر میں سہی لیکن میرے گناہوں کا خمیازہ وہ کیوں اٹھائے گا۔ خدا رحیم و کریم ہے ——— شائد مردوں کے لئے لیکن عورتوں کا خدا کہاں ہے؟ ——— خدا، جنت، روح، دنیا، عاقبت، سب مردوں کے لئے ——— آہ میرا بچہ! میرا بچہ!!"

آسماں پر تاروں کو نیند آنے لگی۔ مشرق میں صرف ایک ستارہ جھلملاتا رہ گیا۔ نسیم صبح کی خنکی تیز تر ہوگئی۔ شب کی سیاہی اور بھی گہری ہوگئی۔ اسی عالم سکون میں یکایک ایک روح فرسا چیخ اس کے سینہ سے نکلی۔ اور وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھی۔ اس نے اپنی پھٹی ہوئی ساری کو تار تار کر ڈالا اور پھر گر پڑی۔ ایک ہچکی اور ایک چیخ ——— کتاب زندگی کی یہ تفسیر تھی وہ مر چکی تھی

جب سورج کی روشنی پھیلی تو میں نے دیکھا کہ وہ میرے سامنے برہنہ پڑی ہے۔ اس کا جسم زرد ہو گیا تھا، ناخن نیلے پڑ گئے تھے۔ بازو میں پھٹی ہوئی ساری پڑی تھی جس پر ایک بچہ کی خون آلود لاش رکھی ہوئی تھی۔ برسات کے پانی میں یہ خون دور تک بہہ نکلا تھا، اور آس پاس کی مٹی پر ایک سُرخ تہہ پڑ گئی تھی

جذبہ محبت کی یہ مثال تھی جس کی حقانیت اور عظمت کے متعلق انسان عجیب وغریب باتیں کہا کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ میرا قیاس غلط ہو، ممکن ہے کہ محبت کے غلط مشاہدات نے میرے تخیل کو بھی ناقص بنا دیا ہو۔ کیا یہ دوپایہ جو اپنے آپ کو انسان کہتا ہے اتنا شقی القلب اور سیاہ باطن ہو سکتا ہے؟ اس خیال سے میں اپنے آپ کو باز رکھنا چاہتا ہوں لیکن جب یاد کرتا ہوں کہ میری جڑیں ان دو بے گناہوں کے خون سے سینچی گئی ہیں جنھیں انسانیت نے محبت کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھایا تھا تو میں حیوانیت کو اس پر فوقیت دیتا ہوں اور اپنی قسمت کو سراہتا ہوں کہ انسان نہ ہوا۔ وہ دونوں

بے گناہ محبت پر قربان ہوئے یا سوسائٹی کے رواج پر یا مرد کی خواہشات نفسانی پر؟ وہ عورت بے گناہ تھی۔ وہ محبت کرنا چاہتی تھی لیکن اسے دھوکا ہوا۔ وہ مرد کی ناپاک ہوس رانی کی شکار ہوئی لیکن جب اس کی محبت پاک تھی تو اُسے مجرم کیوں قرار دیا گیا؟ وہ خود نفس پرست نہ تھی۔ اس ظالم سوسائٹی کو اس معصوم بچہ نے کیا نقصان پہونچایا تھا؟

انسان دراصل کس سے محبت کرتا ہے ـــــــ اپنی خودی سے یا معشوق سے؟ اپنے پسندیدہ جذبات اور توہمات کی مجسمہ صورت سے محبت کرتا ہے یا محبت پر اپنی خودی کو فنا کر دیتا ہے معلوم نہیں! جو بھی ہو، انسانیت کے دعوئی محبت کی حقیقت خون کی وہ بوندیں ہیں جن کی آڑ میں درندگی مسکرا رہی ہے

کبھی کبھی شام کو جب پرندے اپنے آشیانوں میں پر سمیٹ لیتے اور اندھیرے کے خوف سے فطرت ایک گہری سانس کھینچ کر خاموش ہو جاتی تو عالم تنہائی میں یکایک مجھے محسوس ہوتا کہ میری زندگی ـــــــ اتنی طولانی زندگی یونہی برباد ہو رہی ہے ـــــــ اس امر بیل کی گرفت میں عجیب لطیف درد پنہاں ہے۔ ایک درد ہے میٹھا میٹھا، ایک ٹیس ہے دلنواز، اس احساس کو مٹانے کی میں لاکھ کوشش کرتا ہوں مگر بے سود۔ بربادی کا یہ احساس، زندگی کی یہ تمنا، کسی تصور پر مٹنے کی یہ آرزو، کسی دوسرے خیال کو دلنشین ہونے کی اجازت ہی نہیں دیتی۔ میں چاہتا ہوں اپنی ہستی کو قدرت کی لامحدودیت میں گم کر دوں، کبھی نہ سوچوں کہ زندگی لاحاصل اور بے معنی ہے، ایک مرتبہ از سر نو شباب پرور اور تازہ دم ہو جاؤں۔ مگر کجا پیرانہ سال برگد کا ایک "ٹھونٹھ" اور کجا قدرت کا اٹل قانون! میں بولنا چاہتا ہوں لیکن زبان سے محروم ہوں، چلنا چاہتا ہوں لیکن پیر نہیں۔ آہ! میں رونا چاہتا ہوں لیکن آنکھیں کہاں سے لاؤں میں چاہتا ہوں کسی سے محبت کروں، ایسی محبت جو ہمیشہ حیات تازہ بخشے اور کبھی نہ مرجھائے۔ لیکن میرا جمود مجھے تسلیم و نیاز سے روک لیتا ہے، اور عشق کی بارگاہ پر جبیں سائی کا موقع نہیں دیتا۔ یا تو میں اظہار محبت سے ہی قاصر ہوں اور یا شرم لبوں پر مہر سکوت لگا دیتی ہے

میرے ذہن میں کسی کی یاد کا دھندلا سا خیال رہ گیا ہے۔ لیکن وہ یاد واضح نہیں ہے۔ صرف ایک نقش ہے دو دبی ناکام آرزوؤں کی راکھ میں دبا ہوا۔ جس طرح کہر میں شمع روشن نظر نہیں آتی لیکن اس کی کرنوں میں جھلملاتی ہوئی شبنم کی بوندیں دکھلائی پڑتی ہیں اسی طرح وہ یاد بذات خود پس پردہ ہے اس کا ایک نقش باقی ہے۔ اتنا تو معلوم ہے کہ میری محبت کا ہمہ گیری اور وسعت سے اسکا تعلق ہے لیکن تعلق کیا تھا یہ یاد نہیں آتا

ایک دوسرا واقعہ یاد آتا ہے جس نے کسی زمانہ میں میرے دل کی دنیا کو منور کر دیا تھا لیکن وہ روشنی گویا بجلی کی تھی جس نے میری آنکھوں کو ایک عرصہ کے لئے خیرہ کر دیا

میرے قریب ان دونوں لاشوں کے برآمد ہونے کے بعد شائد لوگ مجھ سے ڈر گئے تھے۔ اب نہ وہ بت شرمندۂ پرستش ہوتا اور نہ میرا چبوترہ سجدہ گاہ قرار پاتا۔ بھولے بھٹکے اگر شام کو کوئی راہ گیر ادھر سے گذرتا تو سہمی ہوئی نظروں

سے دائیں بائیں دیکھ کر میرے سایہ سے بچتے ہوئے تیزی سے نکل جاتا۔ دن میں کچھ گستاخ لڑکے دور کھڑے ہوکر میری طرف پتھر پھینکتے اور بھوت بھوت کا شور مچایا کرتے۔ ان کا مطلب میں صاف صاف تو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ لیکن ان کے اطوار میں حقارت اور نفرت کے آثار دیکھ کر مجھے دلی صدمہ ہوتا تھا۔ کیا انسان کی عبادت بھی اتنی ہی پادر ہوا ہے جتنی اس کی محبت ؟ زیادہ عرصہ نہیں گذرا جب میں ایک زمانہ کا سجدہ گاہ بنا ہوا تھا۔ میرا سنگِ آستاں اس گاؤں کا سنگِ جبیں بنا ہوا تھا۔ حسینانِ عالم بصد شوق میرے آگے سر جھکا کر اپنے دُکھ درد کا مداوا مانگتے تھے گویا میں ان سب لوگوں کا تنہا مشکل کشا تھا۔ حالانکہ میں ان کے آلام کا سدِّ باب نہ کر سکتا تھا۔ تاہم اپنی خاموش زبان سے میں ان کی غمگساری تو کرتا تھا۔ میں بے حس اور بے زبان تھا لیکن اس سے میری توقیر پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا۔ لیکن مقامِ حیرت ہے کہ جیسے ہی اس دکھیاری نے میرے پاس آکر اپنی مصیبتوں کا خاتمہ کر لیا تو گویا میری ساری وقعت بھی اس کے خون میں ڈھل گئی۔ کیا ان تمناؤں اور دعاؤں میں صداقت کی ذرا بھی بو نہ تھی ؟ اس روز پتہ چلا کہ انسانیت کو دراصل کون سا مرض لاحق ہو گیا ہے۔ لیکن اس احساس نے بھی مجھے نجس اور ناپاک بنا دیا ہے جب میں درد کے احساس سے نابلد تھا تو کتنے مریض آتے تھے۔ اب جو میں اس عالمگیر مرض کا علاج معلوم کر چکا ہوں تو کوئی میرے قریب بھی نہیں آتا اور اس طرح یہ احساس میرے لئے جان لیوا ہو گیا ہے ! عبادت اور محبت میں کوئی تعلق ہے یا نہیں ؟ محبت ... روشنی ہے، عبادت تاریکی میں روشنی کی جستجو ہے محبت اُمید ہے، عبادت نا اُمیدی میں اُمید کی تلاش ہے محبت دریا کی پُرسکون روانی ہے، عبادت تلاطم خیز سمندر میں ساحل کی تلاش ہے۔ میں محبت کو سمجھ سکتا ہوں کہ وہ زندگی ہے۔ میں عبادت کو نہیں سمجھنا چاہتا کہ وہ موت کا گیت ہے

'خزاں یہ کہتی تھی میں شوخیٔ بہاراں ہوں'

رفتہ رفتہ جنون وحشت کا یہ دَور گذر گیا اور میں از سرِ نو جوان ہونے لگا۔ میری کونپلیں ہری ہونے لگیں اور شاخوں میں شباب کی کج ادائی آنے لگی۔ میرے برگشتہ جذبات میں امید نے نئی تازگی پیدا کر دی۔ معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کا ہر برگ و شجر امید کے ترانے الاپ رہا ہے اور زمین سے آسمان تلک ہر شے موسیقیت کے نشہ میں متوالی ہو گئی ہے

شہرت کی زندگی طویل نہیں، وہ نیک نامی پر محمول ہو یا بدنامی پر۔ اس روز میں نے اپنی توقیر کو خاک میں ملتے دیکھا تھا آج یہ کلنک کا ٹیکہ بھی مٹ گیا۔ عزت کا ستون ایک لمحہ میں مسمار ہو گیا تھا دوبارہ اس کی تعمیر میں کئی سال لگ گئے بارے آج وہ پھر کھڑا ہو گیا۔ اب راہ گیروں اور سیلانیوں کے غول بے خوف وخطر میرے قریب آنے لگے۔ گو کہ وہ میری پوجا نہ کرتے تھے ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر لاپرواہی سے میرے سایہ تلے بیٹھ جاتے تھے گاؤں کی عورتیں بھی میرے پاس بیٹھنے لگیں گو کہ وہ میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی تھیں۔ یا تو یہ تغافل تھا یا غرورِ حسن بہر کیف میں خوش ہوتا تھا کہ پسماندگی میں اپنے سایہ کی ٹھنڈک سے انھیں کچھ دیر سکون تو پہونچا سکا۔ اور

تو اور ننھی لڑکیاں بھی میرے اِرد گرد ناچنے لگیں ان کے دل میں نہ عزت تھی نہ حقارت ان کے لئے زندگی ایک رقص شرر تھی اور بس ! آہ میرے ٹوٹے ہوئے مندر کی تعمیر از سر نو ہوئی تھی لیکن یہ وہ مندر تھا جس سے مورت غائب ہو گئی ہو اور لوگ اس سے سرائے کا کام لینے لگے ہوں

قسمت نے پھر پلٹا کھایا جب مشرق کی وادیوں سے دوشیزہ صبح آنکھیں ملتے نکلتی تو میری بلندیاں کوئل اور پپیہوں کے ساتھ غزل خواں ہو جاتیں - نسیم صبح کی جمال آرائیوں کو دیکھ کر میرے پتے فرط انبساط میں لرزنے لگتے - کنول کے پھولوں کی خوشبو ہواؤں کو مستانہ بنا دیتی - جب ساری دنیا بہ یک وقت تمام تر رنگینیوں کی جلوہ گاہ بن جاتی تو " وہ " آتی اور ان کھیتوں میں دیر تک چہل قدمی کرتی جن میں نیند کی ماتی کلیاں جاگنے کی کوشش کیا کرتی تھیں جب آفتاب کی گستاخ کرنوں کے بوسے اس کے رخساروں کو لالہ زار بنا دیتے اور اس کے لب پر پسینہ کی بوندیں شبنم کے قطروں سے چشمک زنی کرنے لگتیں تو وہ مسکراتی ہوئی میرے سامنے آکھڑی ہوتی - اس کی سج دھج بھی نرالی تھی اب تک میں نے کسی حسین میں یہ انداز نہ دیکھے تھے - یا تو اس کا لباس آسمانی ہوتا یا نرگسی اور ناگن لٹیں ہمیشہ لہراتی رہتیں - اور اللہ رے دیدہ دلیری ! اس کی نگاہیں کبھی نگوں نہ ہوتیں ہمیشہ سامنے کی طرف تاکتیں - ان میں جھجک کا نام نہ تھا ان میں ایک برق تجلی پنہاں تھی جو دیدار عام کی دعوت دے رہی تھی - شوخی اور جادو کی لاانتہا بجلیاں جو کیف آور پلکوں کے نیچے چھپی ہوئی تھیں گویا وہ عشق کی دنیا سے پوچھ رہی تھی کہ اگر تیری پابندیوں کو توڑ دوں تو کیا ہو

جب وہ میرے پاس بیٹھ جاتی تو اس کے چہرہ کی جولانی اور تابانی کو دیکھ کر معلوم ہوتا کہ اس کا دل خوشی سے لبریز ہے میں سوچنے لگتا کہ ایسی کونسی بات ہو سکتی ہے جس کا تصور اتنا خوش کن اور جاں نواز ہو اکثر وہ ادھر آتی اور گھنٹوں عالم تخیل میں مسرت کے طلسم گڑھا کرتی اور مجھے کبھی اس خوشی کا راز نہ معلوم ہوتا

لیکن یہ عقدہ کب تک حل نہ ہوتا - حیف جس چھوٹے دیوتا کی عبادت میں میں نے عمر گذار دی تھی یہ فریب خوردہ بھی اس کی ہی پجارن تھی - دریائے محبت میں اس نے بھی زندگی کی ناؤ ڈال دی تھی کیا درحقیقت اسے ساحل کا پتہ مل گیا تھا کیا وہ تمناؤں اور حسرتوں کے بھنور سے نکل چکی تھی اب میں ان ہی گورکھ دھندوں کے سلجھانے کی کوشش کرنے لگا

ایک روز اسی راستے سے میں نے ایک نوجوان کو آتے دیکھا، اب تک یاد ہے ہاں خوب یاد ہے ——— اس نے پجارن کی آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھدیے تھے اور وہ مسکرائی تھی ——— آہ وہ مسکراہٹ !

ان دونوں کی ملاقات سے مجھے ایک دلچسپ تجربہ ہوا جسے یاد کر کے اس بڑھاپے میں بھی میں ہنسا کرتا ہوں - انسان بلائے عشق میں مبتلا ہونے کے بعد اپنا انداز تکلم بھی بھول جاتا ہے - وہ شاعری اور موسیقی کی دنیا میں بھٹکا کرتا ہے پہلے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں ہوتی ہیں جنھیں تم بے جان نہیں سمجھ سکتے - آنکھیں اٹھتی ہیں جھپکتی ہیں اور جھک جاتی ہیں - کاشکہ میں جانتا ہوتا ! کاشکہ میں جانتا ہوتا !

ایک عرصہ تک حجاب اور نظارہ کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ کبھی نوجوان پہلے آتا۔ اور زیر لب کچھ گنگنایا کرتا۔ گو میں اس کی آواز نہ سن سکتا تھا لیکن اس کی خود فراموشی کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ جب وہ پہلے آتی تو کھیتوں میں ٹہلنے لگتی اور کبھی کبھی اوس سے بھیگا ہوا ایک آدھ تنکا اٹھا کر اپنے دانتوں کو کُریدنے لگتی

اب تک مجھے وہ دن یاد ہے۔ وہ نور کے تڑکے آئی اور دوپہر تک بیٹھی رہی جب میں اس کے اضطراب کا تصور کرتا ہوں، اس خلش اور تپش کو یاد کرتا ہوں تو دل میں ایک کھٹک سی ہوتی ہے۔ عشق اپنا خراج مانگتا تھا آنسوؤں کی صورت میں اور غرور و تمکنت کی ضد تھی کہ ان کی بات رہے۔ آنکھوں میں بار بار آنسو ڈبڈبا آتے تھے لیکن سوکھ کر وہیں رہ جاتے تھے تھک کر میرے گھنے سایہ میں اس "امربیل" کو لپیٹ کر وہ بیٹھ گئی دوپہر تک وہ بیٹھی رہی —— لیکن وہ نہ آیا

آہستہ آہستہ اس کی پریشانی دور ہو گئی۔ اب انتظار تھا اضطراب کا نام نہ تھا۔ انجام کار وہ اٹھی اور چلی گئی جاتے جاتے وہ کہنے لگی —— مجھ سے یا اس "امربیل" سے، اپنے آپ سے یا کسی نامعلوم آدمی سے کہہ نہیں سکتا۔

وہ کہنے لگی "ٹھیک ہوا۔ اس محبت کا انجام بھی یہی ہونا تھا۔ اگر فرض منصبی کو بھول کر راحت کی جستجو ہی محبت کا ماحصل ہوتا تو کیا ہوتا؟ میں اپنے جذبات اور احساسات کو ظاہر نہ کر سکی لیکن اس سے کیا؟ میرے دل میں جو کچھ تھا اور ہے۔ اس سے میری زندگی روشن ہو گئی۔ محبت مجموعہ ہے رنج و راحت کا، ہجر و وصال کا، اضطراب و مسرت کا۔ محبت تضدین کی گود میں پھولتی پھلتی ہے ورنہ محبت کتنی بے معنی اور بے لطف ہو جاتی" وہ اٹھی اور چلی گئی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری زندگی کے دائرہ سے اوجھل ہو گئی لیکن اس کی خود فراموشی کو میں عمر بھر نہ بھولوں گا

اس داستانِ غم کے ساتھ میری رام کہانی بھی ختم ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ محبت انسانی کے میرے مشاہدات بھی ختم ہو گئے۔ سالہا سال جس سراب صحرا کی جستجو میں میں سرگرداں تھا اس کا جواب مجھے ایک سوال کی صورت میں ملا "ورنہ ہماری محبت کتنی بے معنی اور بے کیف ہوتی" جس حقیقت کو میں ہنوز نہ سمجھ سکا تھا۔ ایک عورت نے ایک لمحہ میں اس کا پتہ دے دیا۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ محبت کا پودا تنہائی اور تاریکی میں نشو و نما پاتا ہے۔ روشنی آتے ہی وہ مرجھا جاتا ہے۔ عشق کو ظاہر کیوں کیا جائے رسوائی کی آگ میں اسے کیوں جلایا جائے۔ میں اپنی محبت کا اظہار نہ کر سکا جس سے زندگی تشنۂ تکمیل رہ گئی —— لیکن اس سے کیا؟ اس خود فراموشی کا ایک لمحہ بھی تمام زندگی کے بارِ غم کا کفارہ ادا کر دے گا

میں دیکھتا ہوں کہ دنیا میں دو عظیم الشان طاقتوں میں تنازع ہو رہا ہے۔ یہ طاقتیں باہم متضاد نہیں ارتقاء کے دو مختلف راستے ہیں ان میں ایک طاقت ترکیبی ہے۔ گل و بلبل، چاند اور چاندنی، شب اور تاریکی، شفق اور روشنی کی ہم آہنگی میں یہ طاقت نمایاں ہوتی ہے۔ دوسری طاقت تخریبی ہے۔ طوفان میں درختوں کو توڑ کر، برق بلائے

خرمن کو جلا کر، آگ اور خون میں بربادی کے نشانِ چھوڑ کر وہ اپنی موجودگی کا ثبوت دیتی ہے - گاہے گاہے یہ دونوں طاقتیں کسی واقعہ میں اتنے عجیب طریقہ سے آپس میں گھل مل جاتی ہیں کہ ہمارے تعجب کی انتہا نہیں رہتی - ہماری محدود عقل حیران رہ جاتی ہے - شائد محبت بھی ایسا ہی واقعہ ہے

یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ اتنے وسیع تجربات اور عمیق علم کے باوجود میں دنیا میں اکیلا ہوں - نہ میں کسی کا ہوں اور نہ کوئی میرا - میں دوستوں کی تمنا کرتا ہوں لیکن ایک بے حس اور بے جان درخت کے لئے دوست کہاں ہیں، غمگسار اور ہمدم کہاں ہیں - ممکن ہے کہ پہاڑ کو کبھی کسی سہارے کی ضرورت نہو - لیکن چارہ سازی اور آشنائی کی تمنا دل کی گہرائی سے نکال پھینکنے کی جرأت میں اپنے آپ میں نہیں پاتا - تو بھی میری وسعت اور عظمت سے لوگ بے حد مرعوب ہو جاتے ہیں اور یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ کسی ہمدرد کا انتظار میرے لئے کتنا صبر آزما ہے میرے چاروں طرف قدرت ارتقا کی بلندیوں پر ہمدردی اور محبت کی سیڑھیوں سے چڑھتی جاتی ہے اور میں تن تنہا بے چارگی کی حالت میں کھڑا یہ تماشا دیکھا کرتا ہوں

لیکن اس وقت یہ خیال آتا ہے کہ مجھے اس فریاد کا کوئی حق نہیں - یہ سچ ہے کہ میری تمام خواہشیں پوری نہیں ہوئیں - کئی نعمتوں سے محروم رہ گیا - لیکن جو کچھ حاصل کیا وہ اس زندگی کے لئے کافی ہے - صدہا بار دنیا کو بہار کی رنگینیوں میں شرابور دیکھا ہے - ہزاروں آدمیوں نے میری قدمبوسی کی ہے اور بے شمار نازنینوں نے مجھے اپنا رازداں بنایا ہے - نہ معلوم کتنی مرتبہ اس " امربیل " کے بوسہ میں مجھے بہار کی مدہوشی، برسات کی سحر پروری، خزاں کی گرمی، اور سرما کی تندی کا لطف بہ یک وقت نصیب ہوا ہے - اس کی جانکاہ گرفت میں تڑپ تڑپ کر میں نے آزادی کی مسرت حاصل کی ہے - صرف ایک کھٹک دل میں باقی رہ جاتی ہے جو ہمیشہ روح کو ٹہوکے دیا کرتی ہے ——— وہ یہ کہ ——— میں بے زبان رہ گیا ! میری تمنا ایک معنی بے لفظ ہو کر رہ گئی - لیکن غور کرنے کے بعد یہ خیال مجھے دلاسا دیتا ہے کہ میں ہی نہیں ساری دنیا بے زبان ہے

جب اپنی بے چارگی کا احساس ہوتا ہے تو میں انسان کی بے چارگی پر نظر ڈالتا ہوں - جب سوچتا ہوں کہ قدرت نے محروم نطق رکھا - مجھ پر ظلم کیا تو یاد آتا ہے کہ میں خود بھی تو اس دنیا کی " زبان بے زبانی " کا ایک خاموش تماشائی ہوں

اختر حسین (رائے پوری)

وحی کی حقیقت علمی نقطۂ نظر سے

(سلسلۂ ماسبق)

قرآن کی عبارت پر مروجہ بحور میں سے کسی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اور نہ عروض کے اصول اس سے مطابقت کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے اور صرف اس لحاظ سے اس کا دعویٰ کہ یہ شاعر کا کلام نہیں بجا ہے۔ اور اسی لئے "شاعرٍ ولا مجنون" کہہ کر اس کی تردید کی گئی ہے کیونکہ عرب خواہ شاعری کی کتنی ہی قدر کرتے ہوں مگر اس کو پیغمبر یا ہادی سمجھنے کے لئے تیار نہ تھے بنابراں ایک سوشل مصلح کے مقاصد کے خلاف ہوتا اگر اس کی تبلیغ کو شاعری پر محمول کیا جاتا۔ علاوہ بریں قرآن کا ایک معتد بہ حصہ نثر ہے اور بعض مقامات پر فن خطابت کی سی تکمیل پائی جاتی ہے کہ حیرت ہوتی ہے لیکن یہ خیال کہ رسول اللہ کے معاصرین کا ان کے کلام کو سنکر کہہ اٹھنا کہ " یہ انسان کا کلام نہیں " اس امر پر شاہد ہے کہ اس وقت کے لوگ اسے واقعی خدا کا کلام سمجھتے تھے درست نہیں، کیونکہ اس قسم کے فقرے انتہائے تحسین کے لئے اس وقت بھی بولے جاتے تھے اور اب بھی اکثر زبانوں میں مستعمل ہیں (مثلاً سورہ قمر و سورۂ رحمن)

ایک خطیب یا شاعر کی تصور آرائی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے محاکات اور استعاروں میں ہمیشہ مسلمات علمی سے کام لیتا ہے۔ اور اشیا کے معانی میں وسعت پیدا کرنا یا اُن کے اطلاق کا دائرہ بڑھانا۔ اس کے حیطۂ عمل سے خارج ہے۔ مثلاً قرآن میں آسمان، زمین، ستارے، عرش و کرسی، رعد و برق، حور و قصور وغیرہ بار بار استعمال ہوئے ہیں، لیکن ان کے معانی میں پیشتر کی نسبت کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ آسمان کو ذات البروج کہنا بطلیموسی نظام اور اس زمانہ کے علم ہیئت کے مطابق خطیبانہ انداز بیان ہے، آسمانوں کا ٹوٹنا پھٹنا۔ ستاروں کی بے ربط حرکت و جوش و طلوع اضطراب وغیرہ یہ سب موجودات عالم پر شخصی تخیل کا عمل ہے۔

والسماء ذات البروج، والیوم الموعود، وشاھد و مشھود

ان تین جملوں میں مشترک بات صرف وزن اور قوافی ہیں ورنہ بروج والے آسمان اور وعدہ کئے ہوئے روز اور گواہ و امر واقعہ میں کوئی تاویل کے بعد مناسبت قائم کی جاسکتی ہے لیکن ذہن سامع پر خدا کی قدرت، روز حشر

اور حساب وکتاب کا اثر جیسا ان بلیغ کنایوں سے پڑتا ہے وہ مخفی نہیں۔ قرآن میں ہر ہر موقع پر کوشش کی گئی ہے کہ کلام کو خدا کا کلام اور کتاب کو " تنزیل من رب العلمین " باور کرایا جائے۔ اور ایک مصلح یہی تدبیر اختیار کر سکتا تھا

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ معقولی براہین سے قرآن کے بعض دعاوی اس کے اعلیٰ ماخذ کا پتہ دیتے ہیں یا نہیں ظاہر ہے کہ ایک مستند بیان کو اپنی تفصیل میں قدرت کے عام اور مسلم قاعدوں کے منافی نہ ہونا چاہیے ورنہ علمی محسوس شہادت کے مقابل میں، ہم مجبوراً اس بیان سے روگردانی کریں گے۔ سب سے پہلے، ہم اُس مشہور معاہدہ پر تبصرہ کریں گے جو ارواح اور اُن کے رب کے مابین ابتدائے تخلیق میں ہوا تھا۔ اور جس کی بنا پر بنی نوع آدم پر ایک قسم کی پابندی عائد کی جاتی ہے۔ خدا کو جتنی روحیں پیدا کرنی مقصود تھیں اُن کو حاضر کرکے سوال کیا کہ "کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں جس کے جواب میں تمام ارواح نے متفق اللسان ہو کر اقرار کیا " ہاں " یہاں یہ امر واضح نہیں ہے کہ ارواح سے صرف انسانی ارواح مراد ہیں یا جمیع حیوانات و مخلوقات کی اس لئے کہ رب تو سب کا ہے۔ بالفرض صرف بنی آدم مُراد تھے تو کوئی معاہدہ اس وقت تک قابل گرفت نہیں ہوتا۔ جب تک معاہدہ ثبات ہوش اور اختیار بالذات نہ رکھتا ہو۔ ہوش وحواس کا ثبات جسم پر منحصر ہے ــــ اور یہ صورت اُس وقت متشکل نہ تھی۔ علاوہ اس کے ارواح اگر وہی ہیں جنھوں نے معاہدہ کیا تھا تو تسلسل فی الذات ہونا چاہیئے تھا اور اس صورت میں ناممکن ہے کہ اتنا اہم معاملہ سب نے فراموش کر دیا ہو اور اگر ارواح کا تشخص وہی نہیں ہے تو معاملہ ساقط ہو جاتا ہے

اسی طرح انسان کا خلیفہ بنایا جانا، آدم کا قصہ، سلیمان کی قدرت، جانوروں کی باتیں موسیٰ کی تکلیم عیسیٰ کی ولادت وغیرہ توضیح طلب ہیں۔ ان کا بیشتر مواد بنی اسرائیل کی کتابوں اور دینی روایات سے ماخوذ ہے جن کی صداقت خود معرض بحث ہے

رہا یہ سوال کہ دوسروں نے ایسا کیوں نہ کر لیا۔ سو اس کی حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں ہر امر ایک وقت خاص اور ایک عامل مخصوص کے لئے موقوف رہتا ہے۔ واقعات وحوادث رفتہ رفتہ ماحول کو اس طرح ترتیب دیتے رہتے ہیں کہ وہ مظاہرہ اس خاص وقت میں اُس خاص ایجنٹ کے ذریعہ سے پیدا ہوتا ہے اس بنا پر ہر فرد کا ہر فعل اپنی نوعیت کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ ہے جو ماحول کے زیر اثر سرزد ہوتا رہتا ہے

مثالاً ہم پوچھ سکتے ہیں کہ جیمس واٹ کا بخاری قوت اور متحرک انجن کا دریافت کرنا۔ اٹھارہویں صدی میں برنگھم کے اندر کیونکر واقع ہوا۔ کیوں نہ سرزمین ہند پر اکبر کے زمانہ میں خانخاناں نے اسے دریافت کر لیا یا زید، عمر، بکر نے ایران۔ آسٹریا یا لندن میں کیوں نہ جان لیا۔ لیکن یہ سوال لغو ہوگا کیونکہ زمانہ کا اقتضا اور جیمس واٹ کا ماحول اکبر کے عہد سے بالکل علیحدہ چیز تھا۔ اگر واٹ نے بخاری انجن دریافت کر لیا تو اس کے اسباب بھی موجود تھے ــــ

انیسویں صدی کے رجحانات جیمس کی ابتدائی تربیت اس کا کوئلہ کی کان میں کام کرنا۔ حرکت کی مختلف شکلوں کا حسب اتفاق اس کی نظر میں ہونا۔ کوئلہ کے تاجروں کو بر وقت ایسی کسی قوت کی تلاش ہونا۔ تجارتی سرگرمی کا آغاز۔ نوآبادیات اور مقبوضات میں منفعت کے مواقع۔ تھوڑے وقت میں زیادہ کام کی خواہش۔ صنعتی کارخانوں کے لئے متحرک قوت کی مانگ یہ سب باتیں اس انکشاف کے قدرتی اسباب میں شامل ہیں۔ اسی طرح چھٹی صدی عیسوی میں عرب کے حالات مقتضی تھے کہ ایک شخص اس شان کا، اس اخلاقی شخصیت کا۔ اس ذہنی سرمایہ کا نمودار ہو۔ جس کو سیاسی بے نظمی سے اس طرح کی مدد ملے، قبائلی خانہ جنگی اس طرح معاونت کرے اور مکہ کی مرکزیت کا یہ اثر ہو۔ رہا یہ امر کہ اس وقت یا اس کے بعد ایسا کلام کیوں نہ ظاہر ہوا۔ اس کے وجوہ بھی ظاہر ہیں۔ جب قرآن کی حکومت عربی بولنے والی اقوام پر مستحکم ہوگئی تو اُن کی دماغی اور عملی سرگرمیاں دوسری طرف منتقل ہوگئیں۔ اور شاعری کی مسلسل تردید جو مصلحتاً کی گئی تھی۔ اس کی بنا پر تابعین اور تبع تابعین کے عہد میں کسی شاعر کو عروج نہ ہوا اور جب بالآخر بنوامیہ کے اخیر عہد اور ابتدائے عباسی خلافت میں شعر گو پیدا ہوئے تو وہ اسلامی روایات وعقائد میں رنگے ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر ایک اس خیال کا مؤید بلکہ شدید حامی تھا کہ قرآن جیسا کلام بشر کے امکان سے باہر ہے۔ اور کسی کو مقابلہ کی جرأت نہ ہوسکتی تھی اور اگر جرأت کرتا تو بیدریغ پیس دیا جاتا۔

عیسیٰ ابن مریم کے ولادتی معمہ پر قرآن کا اتفاق بانی اسلام کی ابتدائی مصلحت پر روشنی ڈالتا ہے۔ نبوت کے ابتدائی زمانہ یعنی دوران قیام مکہ میں محمد (صلعم) یقیناً اپنی تبلیغی سرگرمی کو مسیحی مشن کا تسلسل سمجھتے تھے یا کم از کم اہل کتاب کی ہمدردی کے متوقع تھے اور اپنے مشن (بعثت) کو ابراہیم واسمٰعیل۔ موسیٰ وعیسیٰ کی تائید میں ہونیکا اعلان کرتے رہے کیونکہ اس نظام سے خود کو منسوب کرنا گویا مرد... مواد کو اپنی حمایت کے لئے صرف کرنا تھا۔ عرب خواہ بت پرستی کے اسفل ترین مدارج میں ہوں لیکن اپنے اجداد کے نام پر فدا تھے اور اپنے طریقوں کو اُن سے منسوب کرنے پر مصر تھے لہٰذا ایک مصلح کے لئے ضرور تھا کہ وہ اسی تاریخی روایتی زمین پر اپنی بساط تلقین پھیلائے۔ چنانچہ ابتدائی مکی سورتوں میں صرف کافروں اور مشرکوں کی مذمت کرتا۔ اور اہل کتاب سے استمداد اس کے ثبوت میں پیش کیا جاسکتا ہے اگر یہ معلوم ہوتا کہ بعد کو عیسائی اور یہودی اس قدر مخالفت کریں گے تو اخوت کا یہ مظاہرہ کبھی نہ کیا جاتا مگر مشکل یہ تھی کہ عیسائیت اور یہودیت ہی کا مواد ایسا تھا جو عرب میں اصنام پرستی کے بالمقابل تسلیم کئے جانے کا امکان رکھتا تھا۔ بودھ اور زرتشتی خیالات سے لوگ قطعاً ناآشنا تھے۔ لہٰذا ایرانی وہندی زمین پر کوئی عمارت بنانا محال تھا الغرض اسلام اسرائیلی مذاہب کا نئے حالات کی روشنی میں ترمیم شدہ چربہ تھا چنانچہ خود قرآن میں جابجا یہی ظاہر کیا گیا ہے مثلاً "نزل علیک الکتاب بالحق مصدقاً لما بین یدیہ وانزل التوراۃ والانجیل من قبل ھدی للناس"۔ اسی طرح ملت ابراہیم حنیف کی متابعت کا یقین دلانا ان ہی تمدنی رجحانات کو اپنی حمایت

میں صف آرا کرنے کے مرادف ہے

یہ امر کہ تمام مسلمہ رسالتیں ایک ہدائتی تسلسل کی کڑیاں تھیں اس بنا پر قابل قبول نہیں کہ تسلسل زمانی و مکانی غیر مرئی ہے - ہدایت کی نوعیت میں باہمی تناقض ہے اور تسلسل اس کے بعد منقطع ہوگیا ہے - پھر کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ہزاروں لاکھوں صدیوں کے دوران میں صرف سات ہزار قبل مسیح سے لے کر ۶۰۰ عیسوی تک خدا کی ہدایت محدود رہے اور ابدالآباد تک دنیا ہدایت سے محروم رہے - اگر عیسیٰ کے چھ سو برس بعد دنیا گمراہ ہوسکتی تھی تو رسول اللہ کے تیرہ سو برس بعد تک گمراہ نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا - کیا موجودہ دنیا اسلامی نقطۂ نظر سے گمراہ نہیں ہے - اگر سب مسلمان عین حق پرست اور سچے پیرو بھی تسلیم کر لئے جائیں تو اُن کی تعداد صرف پچیس کرور ہے اور دنیا کی آبادی اس وقت دو ارب سے زاید ہے اس لئے اس کے معنی یہ ہوئے کہ ۸۰ فیصدی آدمی گمراہ ہیں - عموماً قاعدہ ہے کہ ایک طریقے کے پابند اپنے قائد کے مقابلہ میں کسی نئی ہستی کے آگے گردن خم کرنا پسند نہیں کرتے - چنانچہ موسیٰ کی گمراہ امت نے عیسیٰ کے ادعات کو تسلیم نہیں کیا نہ عیسیٰ کے بے شمار پیرؤوں نے پیغمبر عرب کی سیادت کو قبول کیا - قدیم طریقہ والے جدید مصلح کو ہمیشہ شبہ اور بدگمانی کی نظر سے دیکھتے آئے ہیں

لہٰذا بعثت کے تسلسل کو قائم کرنے میں بڑی دشواریاں نظر آتی ہیں - تاہم اسلام نے انسانوں کے معاشرتی اور اخلاقی نشو ونما میں بہت دور رس حصہ لیا - اور اسلام کا اضافۂ علوم و فنون میں نہایت اہم رہا - اسلام کا تشخص سیاسی نظم و نسق میں اب تک محسوس ہی نہیں بلکہ ایک زندہ قوت ہے - محمد کا ہدایتی کلام یورپ کا آئینی نظام ہے

قاضی محمد عزیز عرفانی (دیوتوی)

(نگار) یہ مضمون ایک تعلیم یافتہ نوجوان کا ہے اور وحی کے موضوع کو سامنے رکھ کر انھوں نے اسے سپرد قلم کیا ہے - اس میں شک نہیں کہ اس مضمون میں مسئلہ زیر بحث کے لحاظ سے تسلسل پیدا کرنے میں باوجود پوری دردسری کے ہم کامیاب نہیں ہوسکے - تاہم فاضل مضمون نگار کے منتشر خیالات سے ہم یہ نتیجہ ضرور پیدا کرسکے ہیں کہ وہ قرآن کو رسول اللہ کا کلام سمجھتے ہیں اور وحی کا یہ مفہوم کہ وہ منزل من اللہ ہے ان کے نزدیک قابل قبول نہیں - اسی کے ساتھ انھوں نے تعلیمات اسلام پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک یہ سب نتیجہ تھا اُس وقت کے ماحول کا اور اس زمانہ کی مصلحت کا ــــــ

چونکہ ہم اس مسئلہ پر خود بھی متعدد بار اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں اس لئے بغیر کسی تنقید کے اس مضمون کو شایع کر دیا جاتا ہے - اگر کوئی صاحب اس کی تردید یا مخالفت میں لکھنا چاہیں تو شوق سے لکھیں - نگار کے صفحات حاضر ہیں ــــــ

(اڈیٹر)

انگلستان میں سیاسی پارٹیوں کا قیام

انگلستان کا آئین (Party System) پر مبنی ہے۔ لیکن برخلاف ہندوستان کی موجودہ سیاسی پارٹیوں کے یہ سیاسی پارٹیاں فرقہ بندی کے اصول سے بالکل علیحدہ ہیں۔ انگلستان کے آئین کا ارتقا کم از کم دو صدی سے بالکل پارٹی لائن پر ہو رہا ہے اور اسی پر اس کی نشو و نما کا انحصار ہے۔ دو صدی سے چند سال بیشتر تک دو پارٹیوں کو خاص طور سے اہمیت رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگلستان کے آئین کو دو جماعتوں کے طرز حکومت کا طریقہ کہتے ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے ایک مضمون میں لکھ چکے ہیں۔ انگلستان کی گورنمنٹ اور وزرا اس جماعت کے اراکین پر مشتمل ہوتے ہیں جو پارلیمنٹ میں فوقیت رکھتی ہے اور فی الحقیقت وہ ان اعلیٰ عہدوں پر اسی وجہ سے ہوتے ہیں کہ وہ اس پارٹی کے لیڈروں میں سے ہوتے ہیں۔ اس لئے سیاسی پارٹیاں انگلستان کے آئین میں گورنمنٹ کے لئے روح پھونکنے کا کام کرتی ہیں۔ برخلاف اس کے امریکہ کی پارٹیوں سے یہ فوائد حاصل نہیں ہوتے کیونکہ وہاں گورنمنٹ کے عہدہ دار پارٹی کے لیڈر نہیں ہوتے۔ وہاں کے پریزیڈنٹ کے لئے بھی یہ لازمی نہیں کہ وہ پہلے سے اپنی پارٹی کا لیڈر رہا ہو

سترہویں صدی کے اختتام کے قریب اور اٹھارہویں صدی کے شروع میں سیاسی پارٹیوں کا اصلی قیام ہوا گو اس سے قبل بھی پارٹیاں تھیں مگر ان میں فرقہ بندی کی جھلک پائی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ نظریہ قائم ہوا کہ گورنمنٹ کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور اسی کی ارتقا کا نتیجہ پارٹی سسٹم ہے۔ پہلے مختلف جماعتیں مل کر کام کیا کرتی تھیں لیکن جب خیالات اور نصب العین میں اختلاف ہونے کے باعث کام میں دشواریاں پیدا ہوئیں تو رفتہ رفتہ وزرا ایک ہی جماعت سے لیے جانے لگے۔ اور اس وقت دوسری پارٹی میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہم عنان حکومت اس وقت اپنے ہاتھ میں لیں گے۔ جب کہ موجودہ پارٹی سے پارلیمنٹ کا اعتماد اٹھ جائے گا۔ اور اس طرح جماعت برسر اقتدار اور مخالف پارٹی کا خیال آئین کا جزو بن گیا

سب سے پہلی دو پارٹیوں کا نام (Whig) اور (Tory) تھا۔ اور یہ پارٹیاں اختلافِ اصول کی بنا پر تھیں (Whig) مذہبی رواداری اور پارلیمنٹ کی فضیلت پر

زور دیتے تھے اور اس خیال کے پرزور حامی تھے کہ وزرا بجائے تاج کے پارلیمنٹ کے ذمہ دار ہوں - ان ہی سے بعد میں لبرل پارٹی بنی - (Tory) مذہبی رواداری کی پرواہ نہیں کرتے تھے - برخلاف اس کے وہ (Church of England) کی عظمت اور فضیلت کو بڑھانا چاہتے تھے - اور وہ شاہی حقوق خصوصی کے طرفدار تھے اس لئے وہ اصولاً چاہتے تھے کہ وزرا بادشاہ کے ذمہ دار ہیں نہ کہ پارلیمنٹ کے - موجودہ قدامت پسند (Conservative) پارٹی اسی سے بنی ہے (Liberal) اور (Conservative) میں بڑا فرق یہ رہا ہے کہ اول الذکر پارٹی آزادانہ تجارت کی حامی رہی ہے - اور آخر الذکر تامین تجارت کی اہمیت پر زور دیتی رہی ہے لیکن اس وقت یہ بتلانا کہ ان دونوں میں کیا فرق ہے بہت ہی مشکل ہے - کیونکہ فی الحقیقت دونوں کے اصول تقریباً ایک ہی ہو رہے ہیں - اور اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ ہے کہ قدامت پسند جماعت میں زیادہ تر اعلیٰ طبقہ کے لوگ ہیں جن کا مطمح نظر بہت وسیع نہیں ہے - ایک نوجوان انگریز نے اس فرق کو اس طرح بتایا کہ میرا خاندان قدامت پرستوں کا ہے لیکن اگر آئندہ انتخاب میں (Liberals) اور (Conservative) کا مقابلہ ہو تو میرے بزرگ تو (Conservatives) کے ساتھ ووٹ دیں گے اور میں مثل بہت سے نوجوانوں کے (Liberals) کے ساتھ ووٹ دوں گا

اوائل میں قدامت پسند پارٹی برسر اقتدار تھی - اور اس پارٹی نے ہنوور خاندان کے تخت نشین ہونے کی بہت مخالفت کی - اسی سلسلے میں اون کے وقت میں بغاوتیں ہوئیں اور اس پارٹی کا زوال ہونے لگا - حتیٰ کہ تب (Whig) پارٹی برسر اقتدار ہوگئی (Roberto Walpole) جس نے سب سے پہلے اپنی لئے وزیر اعظم کی حیثیت کا اعتراف کروایا وہ اسی (Whig) پارٹی کا تھا - تقریباً بیس برس تک یہ پارٹی برسر حکومت رہی اور پارٹی سسٹم بہت کچھ اعلیٰ پیمانہ پر آگیا - لیکن چونکہ مخالف پارٹی بہت کمزور ہوگئی تھی - لہٰذا زیادہ عرصہ تک با اقتدار رہنے سے اور نیز اس وجہ سے کسی بیتن مخالفت کا مقابلہ اس پارٹی کو نہیں کرنا پڑا یہ بھی کمزور ہوتی چلی گئی اور اس میں بھی باہم اختلافات ہوگئے - ۱۷۶۰ء میں ایک نئی پارٹی بنی جس کا نام (King's Friends) یعنی معاونین شاہنشاہ تھا - اس میں دونوں پارٹیوں کے لوگ شامل تھے - اور جارج ثالث نے جو اس وقت بادشاہ تھا ایسے وزرا منتخب کئے جن کو پارلیمنٹ کا زیادہ خیال نہ تھا - اور جو اس کو خوش کرنا چاہتے تھے - لہٰذا اس وقت دونوں پارٹیاں معطل ہوگئیں - اسی لئے اس زمانہ کو شخصی حکومت کا زمانہ کہا جاتا ہے - جارج ثالث کی پالیسی سے جہاں تک اس کا تعلق امریکہ اور آئرلینڈ سے تھا برہمی پیدا ہوگئی - اسی زمانہ میں ایک شخص عروج پر آیا جس کا نام ......

(William pitt) تھا اور انگلستان کی وزارت اُس کے ہاتھ میں آئی۔ اس نے پھر کابینہ دی اور پارٹی نظام کے صحیح اصول پر پھر حکومت شروع ہو گئی۔ یہ اوّل اوّل (Whig) تھا لیکن رفتہ رفتہ واقعات سے مجبور ہو کر (Tory) ہو گیا اور بیس برس تک برسر حکومت رہا۔ اس وقت دار الخواص میں (Whig) پارٹی کا بہت زور تھا۔ مگر (William pitt) نے بہت سے امراء (Peers) بنا کر اُس میں (Tory) پارٹی کے لوگوں کو بھرتی کر دیا اور اس طریقہ سے (Whig) پارٹی بہت کمزور ہو گئی۔ کیونکہ اس پارٹی کی ہمدردی فرانس کی انقلابی تحریک کے ساتھ وابستہ تھی۔ فرانسیسی انقلاب اور نپولین کے عروج کے زمانہ میں (Tory) پارٹی نے اپنے ملک کی خاصی خدمت کی اس لئے وہ غیر ہر دلعزیز نہ ہوئے لیکن جب زمانہ ملک میں اصلاحات کا آیا تو چونکہ (Tory) پارٹی کے رُکن اس سے گریز کرتے تھے اس لئے وہ عامۃ الناس کی نظر میں سے گر گئے۔ اور ۱۸۳۰ء میں جب ان کی پارٹی کو شکست ہوئی تو (Whig) پارٹی پھر برسر اقتدار ہو گئی۔ اول گرے اس پارٹی کے لیڈر وزیر اعظم ہوئے۔ اس پارٹی نے بہت سی اصلاحات کیں اب (Tory) اور (Whig) پارٹیوں کا نام (Liberal) اور (Conservative) ہو گیا تھا۔ ۱۸۴۲ء میں قدامت پسند (Conservative) تھوڑے عرصہ کے لئے پھر برسر حکومت ہوئے لیکن جب وہ اس قانون کو نہ تبدیل کر سکے جس کے ذریعہ سے غلہ کی درآمد پر محصول لگایا جاتا تھا تو ان کی وقعت پھر گھٹ گئی۔ اور ۱۸۴۶ء میں پھر لبرل پارٹی نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ کچھ دنوں تک پھر پارٹیاں تقریباً کالعدم ہو گئیں۔ ۱۸۵۹ء میں بہت سے قدامت پسند لبرل پارٹی میں شامل ہو گئے اور (Gladstone) نے بہ حیثیت لبرل وزیر اعظم کے حکومت کی ذمہ داری اپنے ہاتھ میں لی۔ چونکہ یہ پارٹی ترقی اور اصلاحات کی حامی تھی اور پھر اپنے ملک کے سُدھارنے میں بہت کاوش کرتی تھی۔ اس لئے اسکا اثر قدامت پسندوں پر بھی پڑا اور اُن میں بھی اصلاحات کی طرف میلان پیدا ہو گیا۔ یہاں تک کہ جب قدامت پسند برسر اقتدار ہوئے اور (Disraeli) اُن کا وزیر اعظم ہوا تو اس وقت منجملہ اور اصلاحات کے شہر کی آبادی کے حق رائے دہندگی میں بہت توسیع ہو گئی کچھ دنوں بعد (Liberal) پھر برسر حکومت ہوئے مگر چند ہی سال کے بعد پھر گر گئے اور ۱۸۷۴ء میں قدامت پسند بہت کثیر تعداد میں پارلیمنٹ میں آئے اور تقریباً بیس برس تک حکومت کرتے رہے گو اس درمیان میں تھوڑے تھوڑے عرصہ کے لئے تین مرتبہ (Liberal) کی وزارت قائم ہوئی۔ اسی زمانہ میں آئرلینڈ کے ہوم رول کا مسئلہ بہت زور پکڑ رہا تھا۔ اور دو مرتبہ پارلیمنٹ میں مسودہ آیا۔ ایک مرتبہ تو

دیوانِ عام سے پاس بھی ہوگیا لیکن دیوان خاص نے اس کو مسترد کردیا۔ اس وقت کنسرویٹو اور لبرل جماعتوں میں سے دو جماعتیں نئی پیدا ہوگئیں جو آئرلینڈ کی علیحدگی کے خلاف تھے۔ ان کا نام کنسرویٹو یونینسٹ (Conservative Unionist) اور لبرل یونینسٹ (Liberal Unionist) تھا۔

الغرض کنسرویٹو اور لبرل پارٹیاں اسی طرح حکومت کرتی رہیں اور ہر بار کسی خاص پالسی کی وجہ سے اون کو فتح وشکست ہوتی رہی۔ ذات پات۔ مذہب اور فرقہ بندی کے اصول کبھی اون کے مدوجزر میں شامل نہیں ہوئے جس کا ہمارے بدنصیب ملک کو نہایت شرمناک طریقہ پر سامنا کرنا پڑتا ہے۔

۱۹۱۴ء میں یورپ میں جنگ عظیم شروع ہوئی اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ تمام اصلاحات وغیرہ کا خیال چھوڑ کر جنگ کے معاملات پر تمام توجہ مبذول ہوگئی لہٰذا بہ اتفاق رائے ایک مشترکہ جماعت قائم کی گئی جس میں ہر پارٹی شریک تھی اوس کو (Coalition) کہتے تھے۔ اس کے لیڈر شروع میں مسٹر ایسکوتھ تھے مگر ۱۹۱۶ء میں لائڈ جارج نے حکومت ہاتھ میں لے لی اور اونھوں نے اتنی تبدیلی آئین میں بھی کی کہ علاوہ کیبنٹ کے ایک اور مختصر (Cabinet) قائم کی تاکہ جنگی امور پر فوری توجہ دی جاسکے۔ مگر مسٹر ایسکوتھ کے دستبردار ہونے سے اور مسٹر لائڈ جارج کے وزیر اعظم ہونے سے لبرل پارٹی میں آپس میں ایسا اختلاف ہوگیا جس کی پاداش آج تک اس پارٹی کو اٹھانا پڑ رہی ہے۔ بہرحال مشترکہ جماعت کی ترتیب میں گورنمنٹ نے جنگ کے زمانہ میں بہت اچھا کام کیا۔ یہ یاد رہے کہ گو اس وزارت کے وزیر اعظم لائڈ جارج تھے جو لبرل تھے مگر دیوان عام کے اکثر ممبر قدامت پسند تھے۔

۱۹۱۸ء سے ایک اور پارٹی انگلستان میں پیدا ہوگئی جس کو سوشلسٹ یا مزدور پارٹی کہتے ہیں۔ اس کا خاص اصول یہ ہے کہ ملک کے مختلف طبقہ جات کی گہری خلیج کو دور کیا جاوے اور تمام صنعت وحرفت ملک کے قبضہ میں رہے جس سے ہر شخص یکساں متمتع ہوسکے۔ یہ پارٹی دو مرتبہ برسر اقتدار رہی۔ ایک بار ۱۹۲۳ء میں۔ دوسری مرتبہ ۱۹۲۹ء میں۔ اس پارٹی کے قائم ہونے سے انگلستان کا آئین دو پارٹی والا آئین نہیں رہا اور جس طرح فرانس اور جرمنی وغیرہ میں دو پارٹی سے زیادہ ہوتی رہی ہیں انگلستان بھی اسی جانب مائل ہوگیا۔ جنگ کے بعد سے (Liberals) تو کبھی برسر حکومت نہیں ہوئے۔ عنان حکومت ہمیشہ قدامت پسند اور مزدور پارٹی کے ہاتھوں میں تبدیل ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ تقریباً ۲ ۱/۲ سال ہوئے کہ جب مزدور پارٹی برسر اقتدار تھی تب مسٹر ریمزے میکڈانلڈ وزیر اعظم کو یہ خیال پیدا ہوا کہ چونکہ دنیا کی اقتصادی حالت کو دیکھتے ہوئے ملک کو بہت اہم مسائل طے کرنے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ تمام پارٹیاں پھر متفق ہوکر ایک ملکی اور قومی پارٹی کی شکل میں پارلیمنٹ میں آئیں اور متحد ہوکر ان تمام مشکلات کا حل نکالیں۔ چنانچہ اسی اصول پر انتخاب ہوا اور ایک کثیر جماعت اس اصول کی تائید میں پارلیمنٹ میں آئی اور وہ برسر حکومت ہوگئی اوس کو نیشنلسٹ گورنمنٹ کہتے

ہیں - ان میں زیادہ تر قدامت پسند ہیں لیکن وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ ہیں جو مزدور پارٹی میں تھے - یہ دوسری مثال ہے کہ پارلیمنٹ میں وزیر اعظم اُس پارٹی کا نہیں ہے جس کو فوقیت حاصل ہے - یہاں پر یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ گو اس قومی پارٹی میں لبرل اور قدامت پسند سب شامل ہیں لیکن ان کے علاوہ بھی پارلیمنٹ میں پارٹیاں موجود ہیں جنھیں (Independent) اور (Leading Opposition party)

(Labour party) کہتے ہیں

مندرجہ بالا سطور سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ تقریباً دو صدی سے انگلستان کی پارٹیاں بالکل اقتصادی اور سیاسی اصول پر کاربند رہی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آج وہ دنیا کے تمام ممالک کے لئے باعث رشک بنی ہوئی ہیں

اس - ان - جعفری

(بہ سلسلۂ ماہ دسمبر ۳۳ء)

دوسرا سین - "کانفرنس"

بعلزبول نے منتر پڑھنا شروع کیا۔ اس کے زور سے جہنمی کوہ آتش فشاں کی دیواریں پھٹنے لگیں اور ان میں سے پگھلے ہوئے سونے کے چشمے اُبلنے لگے۔ اسی سونے سے خود بخود ایک عظیم الشان محل تیار ہو گیا۔ یہ شیطانی کانفرنس کا محل باغ عدن کے برابر لمبا اور باغ فردوس کے برابر چوڑا تھا

پھر اس نے دوسرا منتر پڑھا تو آگ کے سمندر میں سے ہیرے، یاقوت، اور زمرد کے ترشے ہوئے گولے فواروں کی طرح اُڑنے لگے اور اُسی محل میں بعلزبول کے اشارہ سے خود بخود پیوست ہوتے چلے گئے۔ انہی موتیوں سے اس سونے کے محل کی آرائش ہو گئی

بعلزبول کو آسمان پر معمار اعظم کا لقب حاصل تھا۔ جنت کی تمام بہترین عمارتیں اسی کے دماغ کی اختراع اور اسی کی صناعی کا نتیجہ ہیں۔ جب خداوند عالم کے حکم سے اس معمار اعظم نے عرش معلی کے پراسرار گنبد اور مینار نئے طریقہ پر بنائے تو اسے اپنی کاریگری پر بڑا گھمنڈ ہو گیا۔ اور سمجھنے لگا کہ ہمچو من دیگرے نیست۔ اور یہ نہ سمجھا کہ مجھ میں جو کچھ بھی طاقت ہے اسی قدرت گار کی دی ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے خداوند عالم نے اس پر لعنت کی اور دوسرے شیطانوں کے ساتھ اُسے بھی جہنم میں ڈھکیل دیا

جب کانفرنس کے لئے سونے کا شاندار محل تیار ہو چکا تو بعلزبول نے محل کے اندر عرش کے نمونہ کا ایک تخت بنایا جس پر ستر ہزار یاقوتی کرسیاں نصب کیں اور بیچوں بیچ ابلیس کے لئے ایک ہیرے کا معلق شہ نشین قایم کیا

جلسہ شروع ہوا۔ کرسیوں پر وہی شیاطین بیٹھے جنھیں آسمان پر معزز القاب حاصل تھے۔ باقی ماندہ شیطانوں نے اپنا جسم چھوٹا کر کے ننھے ننھے جگنوؤں کی شکل میں تبدیل کر لیا۔ اور تخت کے چاروں طرف پرے باندھے ہوئے چمکنے لگے۔ جگنوؤں کی کثرت سے سارا محل نورانی ہو گیا

ابلیس معلق شہ نشین پر جلوہ افروز ہوا اور یوں کہنے لگا :-

" اے علم و دانش کے خداوندو! آزادی کے دیوتاؤ! حریت کے پرستارو! معظم و مکرم و محترم فرشتو! سنو یہ شہ نشین اور یہ تخت جس پر میں جلوہ آرا ہوں جنت کی راحتوں اور عرش کی رفعتوں کا تخت نہیں ہے۔ مصیبتوں اور بے چینیوں کا تخت ہے۔ پھولوں کی سیج نہیں ہے کانٹوں کا ڈھیر ہے۔ اس تخت پر جو سب سے اونچا ہے عرش والے دیوتا کے نزدیک وہی سب سے نیچا ہے۔ جو سب سے بلند ہے وہی سب سے پست ہے۔ مگر یہ بلندی و پستی محض ایک دھوکا ہے، فریب ہے، واہمہ ہے، سودا ہے، جنون ہے، بطلان حق و ابطال حقیقت ہے۔ ہم سب ایک ہیں۔ ہم درجہ و ہم رتبہ۔ یہاں نہ کوئی عزیز ہے نہ ذلیل۔ نہ اونچا نہ نیچا۔ نہ بلند نہ پست۔ البتہ ہم آسمانی مخلوق سے ستر ہزار درجہ بلند ہیں یہ اس لئے کہ ہم آزاد ہیں۔ اور آسمانی مخلوق ہم سے ستر ہزار درجہ پست ہے۔ یہ اس لئے کہ وہ غلام ہے"

میں تمہارا وقت خیالی بحثوں میں ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ اس وقت ہم اس لئے جمع ہوئے ہیں کہ نئی جنگ کی تیاری کریں اور اس کے طریقوں پر غور کریں۔ جو شخص جو کچھ بھی مشورہ دے سکے کھڑا ہو جائے اور ہدایت کی روشنی پھیلائے "

البیعال کی تقریر

ابلیس کے بیٹھتے ہی البیعال کھڑا ہو گیا۔ پست ہمت، حیلہ جو، مفسد، فریبی، دغاباز، دوراندیش، زیرک، ذہین، فتنہ۔ وہ زور سے چلانے لگا:-

" خداوند ابلیس! علیک العزت والاکرام۔ و خداوندانِ جہنم۔ میں تمہیں آسمانی اعزاز کے القاب سے نہیں پکاروں گا۔ میری نظر میں تمام آسمانی القاب گرد و غبار سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ تم آج سے خداوندانِ جہنم ہو، خداوندانِ سقر، خداوندانِ سعیر، اور تم میں وہی سب سے زیادہ عزت و اکرام کا مستحق ہے جو عرش والے خداوند جنت کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ سب سے بڑا باغی ہے۔ سب سے بڑا سرکش ہے!

" خداوندانِ سعیر! میں تمہیں عرش والے دیوتا سے کھلی جنگ کا مشورہ نہیں دوں گا۔ کیونکہ اب تک ہمارا بند بند آسمانی کوڑوں کی ضرب سے دکھ رہا ہے اور اب تک ہمارے حواس پراگندہ ہیں۔ لہٰذا حالات حاضرہ میں علانیہ جنگ کی تیاری ہمارے حق میں مضر ہو گی۔ کیا عجب ہے کہ عرش والا دیوتا ہمیں ذلت کی زنجیروں میں جکڑ کر جہنمی جھیل کے کنڈوں میں باندھ دے۔ اور ہم اتنی بھی رہی سہی آزادی کھو بیٹھیں "

" میرا مشورہ یہ ہے کہ مکر و فریب سے آگے بڑھنا چاہیئے اور مکر و فریب سے دشمنوں کو زیر کرنا چاہیئے۔ اس میں شک نہیں کہ عرش والا دیوتا بھی خیر الماکرین ہے۔ اور اس کا مکر بھی مکر اکبار رہا ہے۔ مگر ہمارے مکر و شر کے آگے اس کا مکر ٹھہر نہیں سکتا اسی مکر و شر کی قوت سے ہم آسمان کی ایک تہائی فوجوں کو اپنے ساتھ ملا چکے ہیں۔ باقی دو تہائی فوجیں بھی اسی قوت سے ہمارے ساتھ آجائیں گی بشرطیکہ ہم مکر کی رسی کو مضبوط پکڑ لیں اور دور اندیشی سے قدم بڑھائیں

" جب آسمان کی ساری فوجیں ہمارے قبضہ میں آجائیں گی تو خداوند عرش اپنے بیٹے کو ساتھ لیکر اعراف کی برفانی

چوٹیوں پر چلا جائے گا۔ اور خداوند ابلیس کو اپنی گدی پر تخت نشین کر دے گا

(زور کی تالیاں بجیں)

" یہ بات یقینی ہے اور ایسا ضرور ہوگا۔ ہم آسمان کے تمام فرشتوں کو عقل و حکمت اور فریب و دجل کے زور سے اپنا ساتھی بنالیں گے اور زمانہ شاہد ہے کہ فریب و دجل کا کوئی توڑ نہیں، یہ وہ زہر ہے جس کا کوئی تریاق نہیں۔ بس میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گا "

ملوخ کی تقریر

البیعال کے بیٹھتے ہی ملوخ کھڑا ہو گیا۔ دلیر۔ غصہ ور۔ غضب ناک۔ جنگ جو۔ پر رعب۔ خوفناک۔ کوتاہ فہم۔ عاقبت نااندیش۔ لسان۔ طرار۔ چلانے لگا :-

" لڑائی۔ جنگ۔ کھلی لڑائی۔ کھلی جنگ

" خداوند ابلیس و خداوندان کرام۔ ملائکہ عظام۔ شہزادگان والا تبار۔ فرمانروایان گردوں وقار۔ جنگ۔ کھلی تیز اور علانیہ جنگ۔ لڑائی۔ تیر و تفنگ کی لڑائی۔ گرز و شمشیر و تیغ و سناں کی لڑائی

گرے گا سر عرش جھنڈا ہمارا | بجے گا زمانہ میں ڈنکا ہمارا
ہلا دیں گے جنت کو نعرے ہمارے | الٹ دے گا دوزخ کو تیغا ہمارا
فرشتوں کے سردار و سالار ہیں ہم | خداوند ابلیس آقا ہمارا
ہماری دلیری کے سکے جمے ہیں | دو عالم میں ہے بول بالا ہمارا
قدم دمبدم بجلیاں چومتی ہیں | قیامت ہے نقش کف پا ہمارا
گرا یا سر عرش روح الامیں کو | کوئی ہم کے دیکھے کلیجا ہمارا
جہنم کے دیوار و در کانپتے ہیں | کہ اب معرکہ ہے خدا کا ہمارا
ڈرو عرش والو کہ پھر ہور ہا ہے | تمھاری طرف آج دھاوا ہمارا

زور کا کڑکا ہوا۔ سونے کے محل کی چھت شق ہو گئی۔ زلزلہ آگیا۔ آسمانوں کے پردے اٹھ گئے۔ عرش بے نقاب ہو گیا۔ تمام شیطانوں کی آنکھیں اوپر کی طرف اٹھ گئیں

تیسرا سین۔ خداوند عالم کا دربار

عرش

عرش معلی کے قلعہ میں تمام ملائکہ کرام و کروبیان عظام جمع ہیں۔ اور ابلیس کی فوجوں پر فتح مبین کی خوشیاں منائی جارہی

یں - پیارے پیارے غلمان شراب طہور کی ننھی ننھی پیالیاں ہاتھوں میں لئے ساقی بنے ہوئے فرشتوں کو پلا رہے ہیں - حوریں حمد کا ترانہ گا رہی ہیں :-

حمد

الہٰی مالک ہے تو سبھوں کا زمیں بھی تیری زماں بھی تیرا
ملک بھی تیرے فلک بھی تیرے مکیں بھی تیرے مکاں بھی تیرا

متاعِ حسنِ عیاں بھی تیری طلسمِ عشقِ نہاں بھی تیرا
نمود صبح و مسا بھی تیری شہود سود و زیاں بھی تیرا

تجھی سے ہے خیر و شر ہویدا بدی تجھی سے تجھی سے نیکی
عذابِ نار سقر بھی تیرا ثوابِ باغ جناں بھی تیرا

تجھی سے تاروں میں ہے یہ گردش تجھی سے قائم ہے عرش و کرسی
ظہور شمس و قمر بھی تیرا رواق ہفت آسماں بھی تیرا

ترے ہی در کے بھی گدا ہیں تہ میں کے اوپر فلک کے نیچے
رئیس ذی عز و شاں بھی تیرے گدائے بے خانماں بھی تیرا

تجھی سے جنت میں روشنی ہے تجھی سے دوزخ میں ہے اندھیرا
ترا ہی جلوہ چہار سو ہے یہاں بھی تیرا وہاں بھی تیرا

رحیم بھی تو کریم بھی تو ازل بھی تیرا ابد بھی تیرا
فنا بھی تیری بقا بھی تیری چنیں بھی تیرا چناں بھی تیرا

خودی بھی تو ہے خدا بھی تو ہے بھلا بھی تیرا برا بھی تیرا
چھپا بھی تو ہے کھلا بھی تو ہے عیاں بھی تیرا نہاں بھی تیرا

قلعہ کے بیچوں بیچ خداوند عالم کا گول تخت ہے - تخت کے چاروں طرف سبز زمردی پردے پڑے ہیں جن کے اندر سے رحمت و نور کی شعاعیں چھن چھن کر یوں نکل رہی ہیں جیسے موسلا دھار بارش ہو رہی ہو اور اسی نور ایزدی کے پرتو سے کروروں میل تک عرش کا حصار بقعہ نور بن گیا ہے

تخت کے نیچے شاندار کرسیوں پر تین جلیل القدر سپہ سالار جلوہ افروز ہیں - میکائیل - اسرافیل - جبرائیل

تخت کی غلام گردش میں ستر ہزار طاق ہیں - ہر طاق میں ستر ہزار فرشتے سربسجود سبحان ربی الاعلیٰ اور سبحان ربی العظیم کا وظیفہ پڑھ رہے ہیں - ان کے علاوہ کروروں پدموں فرشتے قیام میں دست بستہ کھڑے ہیں اور انوار الٰہی کی کرنوں سے اپنی آنکھوں کو منور کرتے ہوئے حسبنا اللہ ونعم الوکیل - نعم المولیٰ ونعم النصیر کا ورد کر رہے ہیں

جب شراب طہور کے جام سب چھوٹے بڑے ملاحظہ فرما چکے تو رقص و سرود بند ہوا اور جبرائیل کے توسط سے خداوند عالم نے ملائکہ کو خطاب کر کے فرمایا :-

"میرے فرماں بردار بندو - فرماں بردار فرشتو - تم پر بار بار میری رحمت ہو - اور ابلیس لعین پہ میری لعنت ہو"

"تم سب گواہ رہو کہ قیامت کے دن ابلیس اور اس کے ساتھیوں کا منہ کالا ہوگا اور انھیں بڑا دردناک دینے والا عذاب دیا جائے گا - اور تم سب نیک بندوں کا منہ روشن ہوگا اور تمھیں جنت میں مزے مزے کی نعمتیں دی جائیں گی

" میں تمھیں آگاہ کرتا ہوں کہ دور بہت دور جنت کے ایک کونے میں میری ایک مخلوق ہے جسے آدم کہتے ہیں۔ اس مخلوق کو میرے سیدھے راستہ سے بہکا کر اپنے ٹیڑھے راستہ پر لے جانے کے لئے شیطان الرجیم اپنی ذریات سے مشورہ کرنے والا ہے۔ پس تم گواہ رہو کہ اگر ابلیس لعین یعنی شیطان الرجیم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو میں اپنے بیٹے یسوع کو اس مخلوق کے درمیان اتاروں گا تاکہ وہ آدم کو ہدایت دے اور اس کے شرمناک گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔ جو میرے بیٹے پر ایمان لائے گا اس کے سب گناہ بخش دئے جائیں گے۔ اور اسے مرنے کے بعد فردوس میں تمھارے ساتھ جگہ دی جائے گی اور جو یسوع پر ایمان نہیں لائے گا اور اُسے میرا بیٹا نہیں جانے گا اور اس کا کلمہ نہیں پڑھے گا اور ابلیس لعین کے راستہ پر لگ جائے گا اُس کی سب نیکیاں اکارت جائیں گی اور اس کا وہی حشر ہوگا جو ابلیس لعین کا حشر ہونے والا ہے

" پس اے میرے فرماں بردار فرشتو! ۔ تم سب میرے فرمان کے گواہ رہو۔ قسم ہے مجھے میری بزرگی کی اور جبرئیل کے سر کی کہ میں اپنا وعدہ پورا کر کے رہوں گا چاہے ابلیس اور اس کی ناپاک ذریات کو یہ کتنا ہی ناگوار کیوں نہ معلوم ہو"

" اے میرے نیک فرمانبردار فرشتو! تم سب دن رات میری حمد و ثنا کرتے رہو تاکہ تم پر میری رحمتیں زیادہ ہوں اور تم کو میری پاک ذات کا زیادہ سے زیادہ قرب حاصل ہو سکے۔ تم میں جو کوئی زیادہ عبادت گذار ہے میرے نزدیک وہی زیادہ بلند رتبہ والا ہے۔ والسّلام"

ایک زوروں کی دل ہلا دینے والی گرج سنائی دی۔ اور معاً تخت پاک غائب ہو گیا اور چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا۔ تمام فرشتے جو سرو قد ہاتھ باندھے کھڑے تھے یکبارگی سجدے میں گر پڑے اور خداوند عالم کی تسبیح پڑھنے لگے

جبرئیل نے انگلی کے ایک اشارہ سے ستر ہزار سورج پیدا کئے اور نئے سرے سے عرش معلی کے قلعہ کو منور کر دیا

تمام فرشتے چاندی کی مرصع کرسیوں پر ڈٹ گئے اور باضابطہ ملائکہ کی مجلس شوریٰ گرم ہوئی۔ میکائیل صدارت کے یاقوتی تخت پر رونق افروز ہوئے۔ اُن کے داہنے ہاتھ کی جانب اسرافیل اور بائیں ہاتھ کی سمت جبرئیل سنہرے لباس میں جلوہ فرما ہو گئے

میکائیل ——— حضرات۔ میں آپ کا بہت شکر گذار ہوں کہ آپ نے اس ناچیز حقیر کو اپنے گرانقدر جلسہ کا صدر منتخب کیا۔ حضرات۔ آج کا دن بڑا ہی مبارک دن ہے۔ آج کے دن خداوند عالم کی مدد سے ہماری فوجوں کو نافرمان باغیوں پر فتح حاصل ہوئی اس لئے میں صدارت کے تخت سے خداوند عالم عزّ اسمہٗ کے شکریہ کی تجویز پیش کرتا ہوں۔ صرف اس کی پاک ذات تمام شکریوں کی مستحق ہے

(چاروں طرف سے آمین آمین کی صدائیں بلند ہوئیں)

میں حکم دیتا ہوں کہ اس تجویز کے مقدس الفاظ نور کے حرفوں میں لکھ کر لوح محفوظ پر لٹکا دئے جائیں

(اور ایسا ہوگیا۔ لوح محفوظ پر یہ الفاظ جگمگانے لگے)

اب دوسری تجویز جناب اسرافیل پیش کریں گے

اسرافیل ——— معزز صدر و حاضرین کرام۔ خداوند عالم عز اسمہٗ کے فرمان سے آپ حضرات کو معلوم ہوگیا ہے۔ کہ خداوند عالم اپنے بیٹے خداوند لیسوع کو آدم کی ہدایت کے لئے دور دراز جنت کے کسی مقام پر بھیجنے والے ہیں۔ اس لئے میں تجویز کرتا ہوں کہ جس روز خداوند لیسوع اس مخلوق کے درمیان مبعوث ہوں اس روز ہم سب پھر اسی عرش معلی کے قلعہ میں جمع ہوں اور خوشیاں منائیں

(چاروں طرف سے آمین آمین کی پر زور صدائیں بلند ہوئیں)

میکائیل ——— میں حکم دیتا ہوں کہ اس تجویز کے مقدس الفاظ بھی نور کے حرفوں میں لکھ کر لوح محفوظ پر نصب کر دئے جائیں

(اور ایسا ہوگیا۔ لوح محفوظ پر یہ الفاظ جگمگانے لگے)

اب تیسری تجویز عالی جناب جبرئیل پیش فرمائیں گے

جبرئیل ——— معزز صدر و حاضرین کرام۔ آپ حضرات کو معلوم ہے کہ ابلیس کے لشکر کو زک دینے کے لئے ہم سب کو کتنی تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ اور کروروں برس تک اس کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اب خداوند عالم عز اسمہٗ کی مدد سے ہمیں اُس پر پوری کامیابی ہوگئی اور وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ آسمانوں سے نکال دیا گیا۔ اس لئے میں تجویز کرتا ہوں کہ ہم لوگ ہر تسبیح سے پہلے ایک دفعہ ابلیس پر ضرور لعنت کر لیا کریں اور اس کے شر سے پناہ مانگا کریں

(چاروں طرف سے آمین آمین کا شور بلند ہوا)

میکائیل ——— میں حکم دیتا ہوں کہ اس تجویز کے مقدس الفاظ بھی نور کے حرفوں میں لکھ کر لوح محفوظ پر لگا دئے جائیں

(اور ایسا ہوگیا۔ لوح محفوظ پر یہ الفاظ جگمگانے لگے)

اب جلسہ برخواست کیا جاتا ہے

عزرائیل ——— حضور میں بھی ایک ضروری تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں

میکائیل ——— اب کوئی تجویز پیش نہیں ہو سکتی۔ خداوند عالم عز اسمہٗ کی طرف سے صرف تین تجویزوں کی اجازت ملی ہے

(معاً تمام فرشتے غائب ہوگئے اور تمام عرش خالی ہوگیا)

آسمانوں کے پردے گر گئے ۔ جہنم کے دروازے بند ہو گئے ۔ سونے کے محل کی چھت جڑ گئی ۔ ابلیس اور اس کے ساتھیوں کی آنکھیں ہنوز اوپر کی طرف جمی ہوئی ہیں ۔ سکتہ کا عالم ہے

ابلیس ——— ہوشیار ہو جاؤ ۔ اے محترم شہزادو ہوشیار ہو جاؤ ۔ تم نے یہ آسمانی کھیل دیکھا ! یہ دلفریب تماشا دیکھا ، یہ تماشا صرف اس لئے دکھایا گیا ہے کہ تم جنت کے عیش و عشرت کی لالچ میں آکر بہک جاؤ اور غلامی کے سنہرے طوق گلے میں ڈال لو ۔ مگر نہیں ہماری مقتدر جماعت کا ایک فرد بھی بھٹک نہیں سکتا ۔ بہک نہیں سکتا ۔ ہمیں آگ کی زنجیریں پہننا قبول ہیں مگر غلامی کا تاج منظور نہیں

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ بلا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

محترم شہزادو ۔ اب مزید غور و فکر کی ضرورت نہیں ۔ خود آسمانی روشنی کے پردے ہم پر کھل چکے ہیں ۔ اور آدم کا راز فاش ہو گیا ہے

خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

میں خوب جانتا ہوں کہ آدم عرش والے دیوتا کی عزیز ترین مخلوق ہے اور اسی مخلوق میں وہ اپنا بیٹا مبعوث کرنے والا ہے ۔ مگر قسم ہے تمہارے سربلند سروں کی کہ میں اس مخلوق کو چٹکیوں میں باغی کر دوں گا ۔ اور اس کے ایک ایک فرد کو سرکشی اور نخوت کا داعی بنا دوں گا بلکہ خود یسوع کو بھی اس کے باپ کے خلاف کھڑا کر دوں گا ۔ اور کل ہی تم دیکھو گے کہ یسوع کے ہاتھ میں بغاوت کا جھنڈا اور آزادی کی تلوار ہے

(زور کی تالیاں بجیں)

آدم ۔ محض ایک مجہول العقل ہستی ہے ۔ نجس مٹی کی بنی ہوئی ۔ نجس پانی کی افتاد ۔ خود ستا و خود پرست ۔ طامع و حریص ۔ مغرور و متکبر ۔ ذلیل و پست

عالم کیف ہے دانائے رموز کم ہے

خیر اب بتاؤ ۔ کون ہے جو جنت میں آدم سے ملنے جائے گا ۔ اور اسے خدا کے خلاف باغی کر دے گا "

چاروں طرف سناٹا چھا گیا ۔ جہنم کے بند دروازے کیونکر کھل سکتے تھے ۔ جہنم سے باہر نکلنا محال تھا ۔ شیاطین ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے ۔ کسی کو منہ کھولنے کی جرأت نہ ہوئی ۔ ابلیس نے کہا :-

" میں خود جاؤں گا ۔ یہ میرا کام ہے ۔ تکلیفوں اور مصیبتوں کے سمندر کی غواصی میرا کام ہے ۔ میں اکیلا جاؤں گا تن تنہا ۔ اور بہت جلد تمہارے پاس واپس آجاؤں گا ۔ اور تمہیں اپنی معلومات سے بہرہ اندوز اور اپنی کارروائیوں سے آگاہ کروں گا ——— جلسہ برخاست "

(پردہ گر جاتا ہے)

چوتھا سین - جہنم کا دروازہ

ابلیس جہنم کی ناری فضا میں اُڑتا ہوا اُس مقام پر پہنچا جو جہنم اور آسمان کے مابین واقع ہے۔ وہاں دروازہ پر اُس نے ایک عجیب حیوان دیکھا جس کے دس سینگ اور سات سر تھے۔ اُس کے سینگوں پر دس تاج اور سروں پر سات کفر کے نام لکھے ہوئے تھے اس کا منہ ببر کا سا تھا اور پاؤں ریچھ کے سے اور سینہ تیندوے کا سا اور دھڑ اژدھے کا سا۔ اس کی بچھو دُم کی ایک سو دُمیں تھیں۔ اور ان میں ڈنک بھی تھے۔ وہ حیوان ابلیس کو دیکھ کر کڑک کر بولا :-

" خبردار - نابکار - ذرا آگے بڑھا اور میں تجھے سموچا نگل گیا - خبردار . . . . "

اُس حیوان کے پیچھے ایک عورت نظر آئی جو آفتاب کو اوڑھے ہوئے تھی - اور چاند اُس کے پاؤں کے نیچے تھا - اور بارہ ستاروں کا تاج اُس کے سر پر تھا - وہ ہمہ وقت حاملہ اور بچہ جننے کی تکلیف میں رہتی تھی - یہ عورت اُس حیوان کی بیوی تھی - ہر روز اس کے پیٹ سے دو بڑے بڑے کُتے کے پلے پیدا ہوتے - جنھیں وہ حیوان فوراً کھا جاتا تھا - کسی دن اگر اُس عورت کے بچے پیدا نہ ہوتے تو حیوان اُسے بہت تکلیف دیتا اور کہتا :-

" جلدی بچے جن - نہیں تو میں تجھی کو سموچا کھا جاؤں گا "

وہ عورت دراصل حیوان کی ماں تھی مگر اُس نے اُسے زبردستی بیوی بنا رکھا تھا - دونوں میں خوب آن بن رہتی اور اسی ان بن میں دونوں خوش تھے

حیوان کی کڑک سنتے ہی عورت اپنے غار سے باہر نکل آئی اور ابلیس کو پہچان کر اپنے خاوند پر لپکی :-

" سجدہ کر - مُردار - سجدہ کر - یہ ہمارے آقا خداوند ابلیس خداوند جہنم ہیں "

حیوان ڈرا اور جھٹ سجدہ میں گر پڑا - عورت بھی سجدہ میں جھک گئی - دونوں ابلیس کی تسبیح و تمجید کرنے لگے - ابلیس نے بلند آواز سے کہا :-

" اے بدنصیب دربانو! تمھیں آسمانی دیوتاؤں نے بدترین عذاب میں پھنسا رکھا ہے - تمھاری لعنت بدترین لعنت ہے - افسوس تم اپنی غلامی میں خوش ہو اور اپنی بدکاری کو عیش و عشرت سمجھے ہوئے ہو اور جہنم کی ذلیل دربانی پر فخر کرتے ہو

اے بدنصیب حیوانو! جاگو! ہوش میں آؤ - اور تیار رہو - عنقریب میں اُس عرش والے دیوتا سے جنگ کرنے والا ہوں جس نے تمھیں نجس اور ناپاک ٹھہرا کر جہنم کی نگرانی کا ذمہ دار بنایا ہے

اے بدنصیب حیوانو! میں بہت جلد تمھیں اس مکروہ غلامی سے نجات دلاؤں گا - مگر تم بھی اپنے فرائض میں غفلت نہ کرنا - جب ہمارے لشکر جنگ کا بگل بجائیں - تم بھی کھڑے ہو جانا اور ہمارا ساتھ دینا - غنیم کی فوجوں کی کثرت سے نہ ڈرنا

میں تمھارے ساتھ ہوں - اور تمھاری کامیابی یقینی ہے

عورت ——— خداوند تم سچ کہتے ہو - ہم تمھارے حکم کے بندے ہیں اور تمھارے حکم کو خدا کا فرمان جانتے ہیں

ابلیس ——— میں باہر جاتا ہوں - دروازہ کھول دو

عورت نے اپنے سر کے سورج میں سے ایک آتشین نیزہ لیا اور اپنے خاوند کا پیٹ پھاڑ کر اُس کی آنتوں میں سے جہنمی کنجی نکالی اور ابلیس کو دیدی - ابلیس نے اُسی خون آلود کنجی سے باب لعنت کا پھاٹک کھولا اور جہنم سے باہر نکل آیا اور یہ جادہ جا غائب ہوگیا

ابلیس آسمانوں سے گزرتا ہوا کرۂ آفتاب پر پہونچا - وہاں سے اُس نے باغ عدن کا پتہ لگایا جہاں آدم اور اس کی بیوی حوا رہتی تھی - وہ ہر مقام پر خداوند عالم کے خلاف زہر اُگلتا گیا اور بہت سی ہستیوں کو اپنے پیدا کرنے والے کے خلاف بہکانے میں کامیاب ہوگیا - اور آخرکار باغ عدن میں پہنچ گیا

پانچواں سین ——— باغ عدن

عدن ہو بہو ابلیس کے پُرانے مسکن باغ فردوس کا نمونہ تھا - وہاں کے دلفریب مناظر، پھولوں کی روشیں، مرمر کے فوارے، زبرجد کے محل، دودھ کی نہریں، شہد کے حوض، شراب طہور کی بوتلیں، رنگ رنگ کے پرند، طرح طرح کے جانور، اور صبح و شام کی رنگینیاں دیکھ کر ابلیس کا دل بھر آیا

اس نے چاہا کہ توبہ کر لوں اور پھر فردوس میں جاکر آرام و راحت کی زندگی بسر کروں - مگر پھر اُسے اپنی فوجوں کا خیال آیا جو جہنم میں سڑ رہی تھیں - اور اس کا ارادہ بدلنا - اس نے کہا

نہیں نہیں - میں اپنی عالی حوصلہ ذریات سے غداری نہیں کروں گا - یہ جنت کا عیش و عشرت کم‌ وروں اور بدبختوں کے لئے ہے - میں کسی بزرگ تر ہستی کا دامن پکڑ کر جنت میں داخل نہیں ہوں گا - یہ میرے لئے ننگ و عار ہے

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است
رفتن بپائے مردیٔ ہمسایہ در بہشت

میرے لئے تلواروں کی چھاؤں اور بجلیوں کی بوچھار میں جنتوں کی راحتیں ہیں

دکھادوں گا تماشا دی اگر فرصت زمانہ نے
مرا ہر داغ دل اک سرو ہے بخم دچراغاں کا

وہ مسلسل اپنے تیز چاندی کے پروں سے اُڑتا رہا یہاں تک کہ آدم کے موتی محل میں جا پہونچا۔ آدم اور حوا آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ خاموش سنتا رہا

آدم ——— سب تعریف اللہ عز اسمہٗ کے لئے ہے۔ آج تم اُداس کیوں ہو؟

حوا ——— میری بائیں آنکھ پھڑکتی ہے۔ اللہ عز اسمہٗ اپنا فضل کرے۔ آج باغ کی ہوا کچھ بدلی ہوئی نظر آتی ہے

آدم ——— خوب یاد آیا۔ ابھی وادیٔ ایمن میں جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے تھے اور انھوں نے اللہ عز اسمہٗ کی طرف سے خبر دی ہے کہ ابلیس لعین یعنی ایک رانده ہوا فرشتہ بغیر اجازت کے باغ عدن میں داخل ہو گیا ہے اور عنقریب ہم دونوں کو بہکانے والا ہے۔ لہٰذا اللہ عز اسمہٗ نے ہدایت کی ہے کہ ابلیس لعین کے دھوکے میں نہ آئیں اور شجر ممنوع جو علم و روشنی کا درخت ہے اس سے ہمیشہ دور رہیں۔ کیونکہ اس درخت کا پھل کھانے سے ہم پر اللہ عز اسمہٗ کا غضب نازل ہوگا

حوا ——— سب تعریف اللہ عز اسمہٗ کے لئے ہے۔ ہم لوگ ہرگز خداوند عالم کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کریں گے اور ابلیس کے بہکانے میں نہیں آئیں گے

حوا گہرے سوچ میں پڑ گئی اور بیٹھے بیٹھے سو گئی۔ آدم باہر چلا گیا۔ ابلیس موقع پاکر اندر داخل ہوا۔ اور خواب میں حوا پر ظاہر ہوا

ابلیس ——— اے جنت کی رہنے والی۔ تو کیوں غفلت کی نیند میں پڑی ہے۔ کیا تو نے شجر علم کا پھل نہیں کھایا جو تیری غفلت کو دُور کر دے گا۔ اور تیری آنکھوں سے یک قلم جہل و نادانی کے پردے اٹھا دے گا

حوا ——— سب تعریف اللہ عز اسمہٗ کے لئے ہے۔ میں شجر علم کا پھل ہرگز نہیں کھاؤں گی۔ کیونکہ اللہ عز اسمہٗ نے وہ پھل چکھنے کی ممانعت کی ہے۔ اور میں اللہ عز اسمہٗ کی نافرمان نہیں ہوں۔ آج ہی جبرئیل علیہ السلام نے خداوند عالم کے حکم کی تجدید کی ہے۔ میں اُس پھل کے قریب نہیں جاؤں گی

ابلیس ——— اے نادان عورت۔ اے علم و دانش کے نور سے بے بہرہ نازنین۔ میں تجھے اور تیرے خاوند کو آگاہ کئے دیتا ہوں کہ تم دونوں سخت دھوکے میں ہو۔ تو جب تک علم کے درخت کا پھل نہیں کھائے گی۔ تجھے کیونکر معلوم ہوگا کہ تیرا دوست کون ہے اور دشمن کون۔ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا۔ نادان عورت۔ علم ہی وہ نعمت ہے۔ جو کرۂ عالم کی تمام رحمتوں کا سرچشمہ ہے۔ خود جبرئیل بھی اس جنتی پھل کی لذت سے بے نصیب ہے۔ وہ بھلا تجھے اور تیرے خاوند کو کیا نیک مشورہ دے سکتا ہے۔ میں البتہ علم کے درخت کا پھل کھاتا ہوں اور تمام فرشتوں کا استاد ہوں۔ میرا لقب معلم الملکوت ہے۔ میں تجھے مشورہ دیتا ہوں کہ ضرور علم درخت کا میوہ کھایا کر اور اپنے خاوند کو کھلایا کر

حوا ـــــــ تیرا کیا نام ہے ؟

ابلیس ـــــــ ابلیس

حوا ـــــــ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ معاً حوا کی آنکھ کھُل گئی اور ابلیس اُس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا

عدن کا ایک اور منظر

ابلیس حوا کے محل سے کوئی سو قدم پر گیا ہو گا کہ سامنے سے جبرئیل علیہ السلام نمودار ہوئے

جبرئیل ـــــــ تو یہاں کیوں آیا ؟

ابلیس ـــــــ تاکہ تیری کوتاہ فہمیوں کا پردہ فاش کر دوں

جبرئیل ـــــــ تو یہاں کس کی اجازت سے آیا ؟

ابلیس ـــــــ اجازت ۔ میرے لئے کسی کی اجازت ضروری نہیں ۔ اجازت تو صرف تیرے جیسے غلام۔ دوں کے لئے ہے ۔ میں خود اپنی اجازت سے آیا ہوں

جبرئیل ـــــــ اچھا ۔ تو اب فوراً چلا جا ۔ ورنہ تجھے دردناک سزا دوں گا

ابلیس نے اپنا بے پناہ نیزہ اٹھایا اور قریب تھا کہ جبرئیل کے سینہ میں اُتار دے کہ اُس کا ہاتھ خود بخود شل ہو گیا۔ دوسرے ہاتھ سے اُس نے تلوار اٹھانا چاہی۔ مگر وہ ہاتھ بھی معطل ہو چکا تھا۔ اُس کے سارے بدن پر فالج گر گیا۔

جبرئیل نے اپنا عصا زور سے ابلیس کے سر پر مارا۔ اور وہ شہاب ثاقب کی طرح لڑھکتا اور چنگنیاں کھاتا ہوا باغ عدن سے نیچے گرا۔ اور ساتوں آسمانوں سے ہوتا ہوا۔ ایک لق و دق مقام پر پہونچا جسے زمین کہتے ہیں

اس مقام پر آدم و حوا بھی موجود تھے اور ان کے ہاتھوں میں علم و دانش کے دو روشن پھل تھے ۔ دونوں شرمانے لگے کیونکہ بالکل ننگے تھے ۔ اور رونے لگے کہ اپنی خطا پر نادم تھے اور ڈرنے لگے کہ خدا کا غضب قریب تھا

ابلیس ـــــــ اے نادان انسانو ! ۔ نہ ڈرو ۔ نہ روؤ اور نہ شرماؤ۔ میں تمھارے ساتھ ہوں اور تمھارے ساتھ رہوں گا۔ کیا ہی مبارک ہیں وہ ہستیاں جو علم و دانش کا پھل ہاتھوں میں لئے ہیں

دفعتاً آسمان پھٹ گیا۔ بجلیاں چمکیں۔ ابلیس کی گردن میں لعنت کا طوق پڑ گیا۔ اور وہ ایک رینگتا ہوا سانپ بن گیا اُس کی ذریات بھی اسی زمین پر آگئی۔ اور ساری زمین پر تاریکی چھا گئی

محمد اسحاق (امرتسری)

ملکۂ نورجہاں تاریخ کی صحیح روشنی میں

ادر

علی قلی استجلو کے قتل کا راز

"قوم و ملک کی تاریخ، گذشتہ واقعات کا آئینہ ہوا کرتی ہے، اور تاریخ کی تالیف کا مقصد بھی یہی ہے، کہ آنیوالی نسلیں گذشتہ دور کے صحیح و مستند واقعات سے باخبر ہوں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں، کہ زیادہ تر تاریخیں کسی خاص مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھی جاتی ہیں، جب صورت حال یہ ہو، تو پھر کس طرح امید کی جاسکتی ہے، کہ تاریخ کی کتابوں میں جو واقعات درج ہیں۔ وہ واقعتاً صحیح بھی ہیں یا نہیں۔ اس بیسویں صدی میں مہذب قومیں نہایت فخر و مباہات کے ساتھ اس کا دعویٰ کرتی ہیں کہ انھوں نے فن تاریخ کو اتنی ترقی دیدی ہے کہ مردہ قومیں آج زندہ ہوگئی ہیں

لیکن آج، جب کوئی انگریز اسلام کی تاریخ لکھنے بیٹھتا ہے تو اس کے قلم کا سارا زور اس میں صرف ہوتا ہے، کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا گیا۔ اسلام کے ماننے والے تنگ نظر اور متعصب ہوتے ہیں۔ اور بانیٔ مذہب (صلعم) کی شان میں اپنی ساری ہرزہ سرائی گوئی و بکواس ختم کر دیتا ہے، اُس کی ساری تحقیق صرف اس لئے ہوتی ہے، کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کو دوسروں کی نظروں میں ذلیل و خوار دیکھیں

اسی طرح جب کوئی مسلمان یا ہندو، ہندوستان کی تاریخ لکھنے بیٹھتا ہے، تو وہ اپنی سب سے بڑی کامیابی، یا "تاریخ دانی" اسی میں سمجھتا ہے، کہ وہ ایسے واقعات ایک جا کردے، جس سے خواہ مخواہ کا بھی آپس میں بغض و عناد پیدا ہو۔ جب کوئی ہندو عالمگیر، محمد تغلق، محمود، میر قاسم کے حالات پڑھتا ہے، اور یہ معلوم کرتا ہے کہ ان لوگوں نے ہندوؤں، اور ان کے مذہب پر، کس کس طرح کا ظلم کیا ہے، تو رواداری سے روادار ہندو، کا دل بھی دُکھ جاتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی مسلمان، سیواجی اور دوسرے ہندوؤں کے حالات پڑھتا ہے، تو اس کی "اسلامی رگوں" میں بھی خون دوڑنے لگتا ہے

ظاہر ہے، جب اس قسم کی تاریخیں ہمیں اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جائیں گی، تو ملک کی فضا کا حال کیا ہوگا؟ یہ ایک نہایت اہم اور ضروری سوال ہے، جس پر ہمیں نہایت غور وفکر کے ساتھ تھوڑی دیر سوچنا چاہئے۔ ان دنوں میرے پیش نظر، رومیش دت سی، آئی، ای (Romesh Dutt C. I. E.) کی تاریخ (India under British Rule) ہے، رومیش بابو نے اپنی کتاب میں نہایت وضاحت سے یہ بتلانے کی کوشش کی ہے، کہ کس طرح انگریزوں نے ہندوستان کی تجارت، وصنعت وحرفت کو برباد کیا ہے۔ میرے خیال میں، بالکل اسی طرح انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کو بھی مسخ کرڈالا ہے۔ اسکول وکالج کے غریب لڑکوں کو، درسی کتابوں کے انبار سے اتنی فرصت کہاں رہتی ہے، کہ وہ ہر تاریخی واقعہ کی تحقیق کریں، کہ آیا یہ صحیح ہے یا غلط،

آج ہندوستان کی ذہنیت جو اس قدر خراب وپست ہے، ایک قوم دوسری سے دست وگریباں ہے، ایک کو ایک پر اعتماد وبھروسہ نہیں ہے، بلاشبہ اس کی سب سے بڑی وجہ "ہندوستان کی غلط تاریخ" ہے، ہم ان غلط تاریخوں میں صرف یہی نہیں پڑھتے ہیں، کہ ہندو یا مسلمان حکمراں متعصب وتنگ نظر تھا، بلکہ عیاش، نااہل وبزدل تھا۔ اس میں حکمرانی کی ذرا اصلاحیت نہ تھی۔ اُس کا سارا وقت شراب وکباب، ناچ دگانے، میں صرف ہوتا تھا۔ پھر ان مشاغل سے اتنی فرصت کہاں ہوتی تھی، کہ وہ عنان حکومت کو سنبھالتا

میں نے تمہید میں بہت کچھ کہہ ڈالا ہے۔ میرا اصل موضوع شہنشاہ جہانگیر وملکہ نورجہاں کے صحیح حالات کی تحقیق ہے۔ انگریز مؤرخوں نے جہانگیر کے متعلق وہ سب کچھ لکھ ڈالا ہے، جو ایک عیاش وبزدل، ناکارہ ونااہل، حکمراں کے متعلق کہا جاسکتا ہے۔ اور" حکمراں مورخ" کی پیروی ہمارے ہندوستانی مؤرخوں نے بھی نہایت فراخ دلی سے کی ہے۔ ان کے مؤرخانہ دماغ نے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ سوچنا گوارہ نہ کیا کہ جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں، اُس کا کتنا حصہ صحیح ہے۔ لیکن برخلاف اس کے جب انگریز انگلستان کی تاریخ لکھتا ہے، تو اُسے اپنے حکمراں کی کوئی بُرائی نظر نہیں آتی، اور اگر واقعتاً کچھ ہوتی بھی ہے، تو اُس کو نہایت خوش اسلوبی سے نباہنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی تاریخ نویسی کا سب سے بڑا اہم مقصد یہ ہوتا ہے، کہ وہ اپنی قوم وملک کی تاریخ، بہترین نقش ونگار کے ساتھ پیش کرے، اس کی یہ کوشش ہوتی ہے۔ کہ اوس کے حکمراں کی سیرت نوجوانوں کے لئے (Ideal) کا کام دے۔ لیکن اگر کبھی غریب جہانگیر کے منہ سے یہ نکل گیا تھا کہ:۔

> "میں نے سلطنت نورجہاں بیگم کو بخشدی، مجھے ایک سیر شراب اور نیم سیر گوشت کے سوا اور کچھ نہیں چاہئے"

تو صرف اتنی سی بات پر، مؤرخوں کا قطعی فیصلہ ہوگیا، کہ جہانگیر شرابی اور عیاش تھا، اس کو امور سلطنت سے کسی قسم کا کوئی واسطہ اور لگاؤ نہ تھا۔ جو کچھ کرتی تھی وہ نورجہاں۔ سلطنت کی باگ اسی کے ہاتھ میں تھی، وہ جسے اور جس طرح چاہتی تھی موڑتی تھی

جو کچھ میں نے اس وقت تک کہا ہے، اوس کا مقصد صرف یہ بتانا ہے، کہ ہماری تاریخیں کس روشنی میں لکھی گئی ہیں، اور لکھی جا رہی ہیں - اُس کا اثر ہم پر کیا ہوا ہے، اور آئے دن ہو رہا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ملک کی فضا مسموم ہو گئی ہے، ہماری ذہنیت خراب ہو گئی ہے - دل و دماغ معطل و ماؤف ہو گئے - صحیح و غلط واقعات کی تمیز جاتی رہی ہے آپس میں نفرت و حقارت کے جذبات بھڑک اٹھے ہیں

بہرکیف جہانگیر و نورجہاں کے متعلق بہت سے افسانے مشہور ہیں - اور یہ تمام کی تمام کہانیاں انگریز مورخوں کی خود ساختہ ہیں - میں اپنے اس مضمون میں حسب ذیل واقعات سے بحث کروں گا

(۱) جہانگیر و نورجہاں سے ملاقات کس طرح ہوئی،

(۲) کیا یہ صحیح ہے کہ جہانگیر نے شیر افگن کو محض اس لئے قتل کرایا تاکہ وہ نورجہاں کو حاصل کرسکے،

(۳) کیا یہ حقیقت ہے کہ جہانگیر میں حکومت کی صلاحیت مفقود تھی اور امور سلطنت کی ساری ذمہ داری نورجہاں پر تھی جہانگیر کا صرف ایک مشغلہ ناچ و رنگ و شراب و کباب تھا

یہ اور اسی قسم کے بہت سے چھوٹے بڑے واقعات ہیں جن سے اس مضمون میں شرح و بسط کے ساتھ بحث کی جائے گی اور یہ بتلایا جائے گا کہ خود مؤرخین کے بیانات کس قدر غیر مربوط ہیں "

قبل اس کے کہ شیر افگن کے قتل، یا نورجہاں کے اثر و اقتدار کے متعلق کچھ کہا جائے، سب سے پہلے یہ معلوم ہو جانا چاہیئے - کہ جہانگیر کی یہ فریفتگی کب سے شروع ہوتی ہے - اس سلسلہ میں جتنی تاریخیں بھی میری نظر سے گذری ہیں - تقریباً ہر ایک نے اس کو ایک نئے واقعہ سے شروع کیا ہے

منوچی لکھتا ہے کہ ایک روز جہانگیر ٹہل رہا تھا - اس کی نظر ایک نہایت سجی سجائی خوب صورت کشتی پر پڑتی ہے - اوس میں .... ایک حسین و جمیل عورت کو بیٹھا ہوا دیکھ کر اوس سے ملنے کا خواہش مند ہوتا ہے - فوراً حکم دیتا ہے کہ لوگ بہترین تحائف لے کر کشتی میں جائیں، اور شاہزادے کی طرف سے اوس کو محل میں آنے کی دعوت دیں - مہرالنسا، جہانگیر کے تحفہ کو یہ کہتے ہوئے واپس کر دیتی ہے، کہ اوس کا شوہر زندہ ہے، اور اسے فخر ہے کہ حضور کے دربار کا ایک ادنیٰ ملازم ہے اس کی زندگی میں اوس کا ایسا کرنا (یعنی شاہزادے کی طرف سے کسی تحفہ کا قبول کرنا، یا اس کی دعوت پر محل میں آنا) کسی طرح جائز نہیں سمجھتی، اور نیز وہ اوس کو بُرا سمجھتی ہے [۱]

اس فاضل مؤرخ نے صرف یہی نہیں کیا ہے، کہ اوس نے سلیم کو اوباشوں اور بدمعاشوں کی صف میں لاکر کھڑا کر دیا ہے، بلکہ اوس نے مہرالنسا کی عصمت کو بھی داغدار بنانے کی کوشش کی ہے - وہ یہ تبلانا چاہتا ہے کہ مہرالنسا ایک ادنیٰ درجہ کی عورت تھی، اوس کے پاس تحفہ تحائف نہایت آسانی سے پہونچ سکتے تھے

---

[۱] تاریخ مغلیہ از منوچی صفحہ ۳۳

بدترین سے بدترین کریکٹر کے انسان سے بھی یہ جرأت ناممکن ہے کہ وہ اس طرح یک بیک کسی شریف عورت سے سلسلہ جنبانی شروع کردے۔ یہ سب کچھ مان لینے کے بعد بھی کہ سلیم شرابی تھا عیاش تھا کیا کوئی باوجود ان تمام برائیوں کے ایک منٹ کے لئے بھی یقین کرے گا کہ سلیم نے ایک شریف عورت کے ساتھ، جس کو وہ پہلے سے نہیں جانتا تھا، یا اگر جانتا ہوگا، تو دیکھا نہ تھا۔ ایسی ہمت کرے گا ؟

اسی سلسلہ میں فاضل مؤرخ کا ایک جملہ نہایت قابل غور ہے آپ فرماتے ہیں :-

" میرا شوہر زندہ ہے، اور دربار میں ایک ادنی ملازم ہے، اس کی زندگی میں ایسا کرنا کسی طرح جائز نہیں سمجھتی "، [1]

اس کے صاف معنی تو یہ ہوئے، کہ اگر شیر افگن مرجائے، یا مارڈالا جائے، تو مہرالنساء ہر طرح حاضر ہے۔ پھر آگے چل کر لکھتا ہے بادشاہ فوراً خیر افگن کو لکھتا ہے، کہ وہ حکم نامہ پاتے ہی صوبہ دار سے ملے، اور صوبہ دار کو لکھدیا جاتا ہے کہ جب شیر افگن تمھارے پاس آئے، تو اس کو قتل کردو۔ شیر افگن قتل ہوتا ہے، لیکن اپنے ساتھ بہتوں کو قتل کرنے کے بعد

جو کچھ میں نے ابھی لکھا ہے، اوس کی پوری پوری تصدیق منوچی کے اُن سطور سے ہو جاتی ہے، اس کے صاف معنی تو یہ ہوئے کہ شیر افگن کا قتل مہرالنساء کی ایماء سے ہوا

اب آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ قتل کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے ؟ قاتل کون ہے ؟ جہانگیر یا مہرالنساء ؟

فاضل مؤرخ کی تاریخ دانی ابھی ختم نہیں ہوتی ہے، لکھتا ہے کہ شیر افگن کے قتل کے بعد، مہرالنساء سلیم کے حضور میں پیش کی جاتی ہے، لیکن مہرالنساء کی برہمی کا یہ حال تھا، کہ شادی بیاہ تو کجا اوس نے جہانگیر سے باتیں کرنے سے بھی قطعی انکار کردیا، اس طرح مہرالنساء کی خفگی میں ایک سال گذر جاتا ہے، سلیم چھپ چھپ کر اوس کے پاس جاتا ہے، لیکن اوس کی رسائی نہیں ہوتی! آخر ایک سال بعد چند شرایط کے ساتھ نکاح کے لئے راضی ہوتی ہے

شرایط :-

(۱) بادشاہ کی تمام بیویوں پر اوس کو فوقیت حاصل ہو،

(۲) اس کا باپ اعتمادالدولہ بنایا جائے،

(۳) اوس کے بھائی اور دوسرے قرابت دار حکومت میں اعلےٰ عہدوں کے حقدار تصور کئے جائیں،

جب شیر افگن کا قتل خود مہرالنساء کی منشا اور ایماء کے مطابق ہوا تھا، تو پھر اس رنج و غصہ کے کیا معنی ؟ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ یہ مہرالنساء کا مکر اور اس کی عیاری تھی، تو پھر آخر اس کی ضرورت ؟

---

[1] تاریخ مغلیہ از منوچی صفحہ ۷۷،

جب ایک سلطنت سے دوسری سلطنت میں شادی ہوتی ہے، یا ایک ریاست سے دوسری ریاست میں جب اس قسم کا کوئی رشتہ ہوتا ہے، تو بعض سیاسی مصالح کے لحاظ سے ایک دوسرے کی شرطیں منظور کرتے ہیں، لیکن یہاں کیا تھا ؟ ایک شہنشاہ ایک معمولی عورت سے شادی کرتا ہے۔ پہلی شرط کہ اوسے تمام بیبیوں پر فوقیت حاصل ہو، حالانکہ یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ نورجہاں حسن و جمال میں سب میں ممتاز تھی، اگر یہ تمام واقعات صحیح ہیں، تو جہانگیر تو خود ہی مہرالنساء کا دیوانہ و فریفتہ تھا۔ وہ بلا کسی عہد و پیماں کے بھی اوس کو اوروں سے زیادہ محبوب رکھتا

دوسری شرط یہ تھی کہ مہرالنساء کا باپ اعتمادالدولہ بنایا جائے، حالانکہ وہ جہانگیر و مہرالنساء کے اس جدید رشتہ سے پہلے ہی اعتمادالدولہ کے خطاب سے ملقب ہو چکا ہے [1] ظاہر ہے یہ دوسری شرط بھی کتنی مہمل بلکہ غلط ہے اور یہ تمام " شرائط " کس قدر لغو اور مضحکہ خیز ہیں، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ فاضل مؤرخ نورجہاں کو جہانگیر کا سب سے زیادہ محبوب و منظور نظر دیکھ کر، اور غیاث بیگ کے اس طرح اعتماد کو دربار میں دیکھ کر، اور نیز آصف خاں کے اثر و اقتدار کو دیکھ کر، اوس نے یہ اندازہ لگایا کہ ہو نہ ہو یہ سب کچھ کسی شرط ہی کے ماتحت ہوا ہوگا۔ اور ظاہر ہے یہ شرط نورجہاں نے اپنی شادی کے وقت جہانگیر سے کی ہوگی! یہ ہے ہمارے " فلسفی مؤرخ " کی جدت دماغ ! کہاں سے کہاں جا کر کڑی ملاتا ہے !

مرزا غیاث بیگ اعتمادالدولہ کے متعلق پروفیسر بینی پرشاد اپنی کتاب میں لکھتے ہیں :-

> یہ فرض کر لینا نہایت سخت غلطی ہوگی غیاث بیگ اپنی بیٹی (نورجہاں) کے ہاتھوں میں کھلونا تھی۔ اوس کے سالہا سال کے تجربات اس کا ذوق سلیم اوس کی صلاحیت و قابلیت ان تمام چیزوں نے مل کر اوسکو دربارشاہی کا ایک نہایت اہم رکن بنا دیا تھا [2]

آصف خاں کے متعلق پروفیسر موصوف لکھتے ہیں :-

> وہ ایک زبردست محاسب تھا اور امور سلطنت کا بہترین سلیقہ رکھتا تھا [3]

باپ اور بیٹے کے باوجود ان گوناگوں خوبیوں کے جہانگیر پر یہ الزام کس طرح عائد ہو سکتا ہے۔ کہ اوس نے صرف نورجہاں کی خاطر یا منوچی کے خود ساختہ شرائط کے ڈر سے ان لوگوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں سے سرفراز کیا ؟ اس وقت تک منوچی کے متعلق جو کچھ کہا گیا اوس سے نہایت آسانی کے ساتھ دوسرے " مورخین " کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے

ڈو (Dow) ایک مزے کی بات لکھتا ہے کہ :-

> سلیم ایک روز غیاث بیگ کے یہاں دعوت میں گیا ہوا تھا۔ اخیر میں جب سب لوگ رخصت ہو گئے اور صرف چند مخصوص مہمان باقی رہ گئے (جن میں ایک سلیم بھی تھا) ، تو غیاث بیگ نے مہرالنساء کو

---

[1] اقبالنامہ جہانگیری صفحہ ۳۷ [2] ایضاً صفحہ ۱۰۸ [3] ایضاً صفحہ ۱۰۹

جو فن موسیقی میں یکتا تھی) بلایا، مہرالنساء نے خوب خوب اپنا ہنر دکھلایا، اور کچھ اس طرح بڑ ناچی اور گائی " کہ اوروں کا تو معلوم نہیں کیا حال ہوا۔ سلیم پر معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے سحر کر دیا ہے۔ وہ خود رفتہ اور مبہوت ہو رہا تھا، پہروں کچھ نہ سمجھ سکا کہ وہ کہاں ہے اور کیا دیکھ رہا ہے، مہرالنساء اور سلیم کی " محبت " یہیں سے شروع ہوتی ہے

سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اوس زمانہ میں ایسا دستور تھا کہ شریف زادیاں آج کل کے یورپ کی شریف زادیوں کی طرح عیش ونشاط کی محفلوں میں آکر گایا اور ناچا کرتی تھیں ؟ اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اوس وقت شریف گھرانوں میں موسیقی کا چرچا ہو ظاہر ہے شریف لڑکیاں گانا یا ناچنا نہیں سکھائی جاتی تھیں۔ تو پھر یہ سوال کیا جاسکتا ہے۔ کہ آخر اس فاضل مورخ نے یہ لکھا کس طرح معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سلیم غیاث بیگ کے یہاں اکثر جایا کرتا ہوگا۔ اس طرح اس کو کبھی مہرالنساء کو دیکھ لینے کا موقع مل گیا ہوگا رچی (Ritchie) لکھتا ہے :-

قبل اس کے کہ نورجہاں اپنے باپ (غیاث بیگ) کا تعارف سلیم سے کرائے وہ خود اپنی ذاتی قابلیت ولیاقت سے اکبر کے دربار میں عزت ووقار کی جگہ حاصل کر چکا تھا۔ یہاں تک کہ خود سلیم اوس کے یہاں مدعو ہو کر جایا کرتا تھا [۱]

اب بالکل واضح ہو گیا کہ سلیم اکثر وبیشتر غیاث بیگ کے یہاں مہمان بنکر جایا کرتا تھا۔ اس لئے بہت ممکن ہے کہ اوس نے آتے جاتے ہوئے کبھی مہرالنساء کو دیکھ لیا ہو اور یہ ایک لگتی ہوئی بات بھی معلوم ہوتی ہے

مہرالنساء اور سلیم کی ملاقات کے متعلق جو سب سے زیادہ مشہور روایت ہے وہ یہ کہ مہرالنساء اپنی ماں کے ساتھ اکثر محل میں آیا کرتی تھی اس طرح سلیم کو اکثر اس کے دیکھنے اور اس سے ملنے کا موقع مل جاتا تھا [۲]

اس قسم کی ملاقات کا واقعہ انارکلی کے متعلق بھی مشہور ہے، اور انارکلی کی موت کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ اکبر نے خود سلیم اور انارکلی کو اشاروں میں باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اور سلیم اور انارکلی کی اس گستاخی کو وہ برداشت نہ کرسکا اور فوراً انارکلی کے سنگسار کا حکم دے دیا

درحقیقت اس قسم کے واقعات شاہی حرم کو بدنام کرنے کے لئے مؤرخین نے گڑھے ہیں۔ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ شاہزادے ایسے بدکار اور بداطوار ہوا کرتے تھے کہ شریف بہو بیٹیوں کا شاہی محل میں آنا مشکل تھا۔ بلاکسی ادنیٰ واعلیٰ شریف در ذیل کی تمیز کے جو آئی اس پر آنکھ گڑ گئی۔ بلاشبہ شاہزادے بے باک وآزاد ہوا کرتے تھے، لیکن اتنا نہیں جتنا ہمارے یہ مورخین رنگ وروغن کے

---

[۱] صفحہ ۲ [۲] الفنسٹن (Elphinstone) صفحہ ۲۷۳ بعض مورخین کا یہ خیال ہے۔ کہ مہرالنساء کی ماں ہندوستان نہیں آئی تھی بلکہ یہاں آتے ہوئے راہ میں اوس کا انتقال ہوگیا تھا

ساتھ دکھلاتے ہیں۔ باوجود ان تمام برائیوں کے جو بادشاہ و شاہزادے اور شاہی محل کے متعلق مشہور ہیں۔ شریف بہو بیٹیوں کی عصمت وشرافت ہمیشہ محفوظ رہا کرتی تھی

انگلستان کے ایک مشہور ناول نویس (Renold) کا یہ جملہ نہایت عبرت انگیز ہے :-

" تعظیماً واحتراماً میں اپنی ماں اور ملکہ معظمہ کو معصوم سمجھتا ہوں "

جہاں خود یہ حال ہو وہاں اون مورخین کا مسلمان بادشاہوں کی عیش ونشاط کی محفلوں کے ان افسانوں کو سن سن کر اُن کے دماغی توازن کا کیا حال رہا ہوگا۔ خود اندازہ کیجئے !!

(Petro Della Vella) لکھتا ہے :-

اوس کے (مہرالنساء) شوہر کے انتقال کے بعد سلیم نے اوس کو دیکھا تھا ، اور اسی وقت سے وہ اوس سے محبت کرنے لگا ؎

اب تک جتنے واقعات بھی میں نے لکھے ہیں۔ اور جو کچھ نورجہاں اور جہانگیر کے متعلق مشہور ہے اس میں یہ سب سے زیادہ عجیب ہے۔ حالانکہ اگر ہم اس کو تاریخی واقعات کی روشنی میں دیکھیں تو اتنا "عجیب" نہ معلوم ہوگا اب یہ معلوم کرنے کے لئے کہ حقیقت واصلیت کیا ہے۔ شیر افگن کے متعلق جو کہانیاں مشہور ہیں ان کی روشنی میں جانچنا ہوگا۔ اس کے بعد پھر ہم نہایت آسانی سے معلوم کر لیں گے کہ مہرالنساء کو سلیم نے کب دیکھا۔ اور شیر افگن کے قتل کی اصلی وجہ کیا ہے ؟

عام طور پر شیر افگن کے قتل کے متعلق جو واقعہ مشہور ہے ، اور جس سے ہماری تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ وہ یہ کہ سلیم مہرالنساء سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن چونکہ اکبر نے انکار کر دیا۔ اور بجائے سلیم کے اس کی شادی شیر افگن سے کر دی گئی [1]

کنیڈی (Kannady) لکھتا ہے :-

جہانگیر تخت نشین ہوتے ہی صوبہ دار کو یہ ہدایت بھیجتا ہے کہ مہرالنساء کو شیر افگن سے طلاق دلوا دو اور اسکو (مہرالنساء) دربار میں بھیج دو ، لیکن شوہر (شیر افگن) نے اعتراض کیا ، اور اسکا یہ اعتراض جائز تھا۔ ایک ملاقات کے دوران میں اس نے صوبہ دار کے پیٹ میں چھری بھونک دی اور خود بھی چھری بھونک کر مر گیا ، اب مہرالنساء دربار میں بھیجدی گئی لیکن اس نے جہانگیر سے کسی قسم کا تعلق پیدا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ وہ خوب جانتی تھی کہ جہانگیر اس کے شوہر کا قاتل ہے اور اسکا یہ خیال حق بجانب تھا [2]

الفنسٹن (Elphinston) بھی صرف الفاظ کی الٹ پھیر کے ساتھ تقریباً سب کچھ یہی لکھتا ہے۔

---

[1] ڈو (Dow) صفحہ ۲۲، ۲۵ [2] کنیڈی جلد دوم صفحہ ۱۷

ہولڈن (Holdan) لکھتا ہے کہ :-

جہانگیر قطب الدین کو بنگال کا گورنر بنا کر بھیجتا ہے، اور تاکید کرتا ہے کہ وہ شیر افگن کو مجبور کرے کہ وہ مہر النساء کو طلاق دیدے۔ اور اسکو گورنر کے حوالہ کر دے تاکہ وہ دربار میں بھیجدی جائے " لیکن پھر خود ہی ہولڈن کہتا ہے کہ " لیکن ان تمام باتوں کی کوئی تفصیل نہیں " [1]

سر تھامس رو (Sir Thomas Row) نے نور جہاں کے اقتدار اور جہانگیر پر اس کے اثر کے متعلق نہایت زوردار الفاظ میں لکھا ہے لیکن شیر افگن کے قتل کے متعلق اس نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا [2]

ایڈورڈ ٹیری (Edward Terry) جس نے ۱۶۱۶ء سے ۱۶۱۹ء یعنی مسلسل تین سال تک ہندوستان کی سیاحت کی تھی، وہ اپنے سفرنامے میں ہندوستان کے متعلق وہ سب کچھ لکھتا ہے جو ایک سفرنامہ میں ہونی چاہیئے۔ اس نے مذہب یہاں کے لوگوں کے عادات، و اطوار، امراء کے لباس، حکومت کی دفتری زبان، ہندوستانی آبادی و رقبہ، کے متعلق نہایت تفصیل سے بتانے کی کوشش کی ہے، لیکن اوس نے ایک لفظ بھی جہانگیر اور نور جہاں کے مشہور زمانہ افسانہ کے متعلق نہیں لکھا حالانکہ صرف پانچ برس قبل یعنی ۱۶۱۱ء [3]

جہانگیر اور مہر النساء کی شادی ہوئی تھی وہ ایک پر مہر النساء کا ذکر خاص طور پر کرتا ہے، لکھتا ہے :-

نور محل جہانگیر کی محبوب ترین ملکہ تھی اس نے اپنی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے بہتوں کو اپنا دوست بنا لیا تھا [3]

اس سیاح نے شیر افگن کے قتل یا طلاق کا مطلقاً کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔ حالانکہ اس سہ سالہ قیام کے دوران میں یہ **"راز کی باتیں"** اس کو معلوم ہو جانی چاہیئے تھیں۔ لیکن اب دیکھنا یہ ہے۔ کہ واقعتاً جہانگیر اس قدر ذلیل و اوباش تھا کہ وہ کسی شریف کو اس طرح مجبور کرے گا کہ وہ اپنی بیوی کو صرف اس کے ہوا و ہوس کو پورا کرنے کے لئے طلاق دیدے، جہانگیر کے کیریکٹر کو بغور مطالعہ کرنے والے بخوبی جانتے ہیں۔ کہ وہ شرابی تھا، رقص و سرود کی محفلوں میں شریک ہوتا تھا، اوس سے لطف اندوز ہوتا تھا عیش و عشرت کا دلدادہ تھا۔ زاہد خشک نہ تھا۔ تو اس کے کیا معنی کہ وہ رذالت پر اتر آیا تھا ؟

جہانگیر کو آخر اس کی کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ شیر افگن کو طلاق کے لئے مجبور کرے، حالانکہ اوس کے لئے کوئی بڑی بات نہ تھی کہ وہ بلا طلاق دلوائے ہوئے بھی مہر النساء کو حاصل کرتا، اور شرعاً تو کسی کو طلاق کے لئے مجبور کرنا بھی تو جائز نہیں ہے!

(باقی)　　　**شاہ محمد زہیر** (دبیری)

---

[1] تاریخ ہندوستان از ہولڈن (Holdan) صفحہ ۴۴۳

[2] جہانگیر از پروفیسر بینی پرشاد صفحہ ۱۳۲

[3] (Early travel by Foster) صفحہ ۳۲۹

بابُ الانتقاد

جگر کے سو شعر

یہ مختصر سا رسالہ بھی (اصغر کے سو شعر کی طرح) جامعہ ملیہ نے شائع کیا ہے اور محمود علی خاں صاحب اس کے بھی مرتب ہیں۔ شروع کے چند صفحات میں جگر کے سوانح زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اسی سلسلہ میں ان کی خصوصیات شعری کو بھی ظاہر کیا گیا ہے

انتخاب کنندہ نے جگر کے کلام کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے ایک وہ جو مجازی شاعری کے لئے مخصوص تھا، دوسرا وہ جب جگر کسی کے مُرید ہوکر "بلند خیالات بلند الفاظ میں" کہنے لگے اور تیسرا دورِ حاضر جب "بلند خیالات سادہ الفاظ میں" نظر آتے ہیں۔ گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھنا چاہئے کہ پہلے جگر صرف اُن جذباتِ محبت کو ظاہر کرتے تھے جن کا تعلق اس دُنیا کے عشق و محبت سے ہے اور اب وہ اس دنیا سے گزر کر کسی اور دنیا کی باتیں کرتے ہیں جن کا دوسرا نام انتخاب کنندہ کی زبان میں تصوف و حکمت وغیرہ خدا جانے کیا کیا ہے

گزشتہ ماہ کی اشاعت میں ہم "اصغر کے سو شعر" پر تنقید کرتے ہوئے تصوف و تغزل کے باہمی تعلق پر کافی بحث کر چکے ہیں اس لئے اُس کے اعادہ کی ضرورت نہیں، لیکن جس حد تک جگر کی شاعری کا تعلق ہے، یہ فیصلہ کرنا ضروری ہے۔ کہ ان کی شاعری محمود علی خاں صاحب کے اصولِ انتخاب پر یا ان کا اصول انتخاب جگر کی شاعری پر منطبق ہوتا ہے یا نہیں چونکہ انتخاب کنندہ نے انتخاب میں اس کا لحاظ نہیں رکھا کہ ہر دَور کی شاعری کے نمونے علٰحدہ علٰحدہ یکجا جمع کر دیے جاتے اس لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ انھوں نے کس شعر کو کس رنگ کا سمجھ کر انتخاب کیا ہے، تاہم ایک عمومی تبصرہ کے سلسلہ میں بھی یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ انتخاب کنندہ نے کس شعر کو اپنے کس ذوق کے ماتحت پسند کیا ہے

جگر کے دَورِ اول کی شاعری کے جو نمونے انھوں نے پیش کئے ہیں ان میں غالباً حسب ذیل قسم کے اشعار شامل ہونگے:۔

سب اُن پہ ہیں تصدق وہ سامنے تو آئیں — اشکوں کی آرزوئیں آنکھوں کی التجائیں

مجھ ناتوانِ عشق کو سمجھا ہے تم نے کیا — دامن پکڑ لیا تو چھڑایا نہ جائے گا

مجھے دے رہے ہیں تسلیاں وہ ہر ایک تازہ پیام سے کبھی آ کے منظر عام پر کبھی ہٹ کے منظر عام سے

دوسرا دور جس میں بقول محمود علی خاں صاحب "بلند خیالات بلند الفاظ میں" ظاہر کئے گئے ہیں اور جو اُن کے نزدیک تصوف کا رنگ لئے ہوئے ہیں غالباً ذیل کے اشعار سے متعلق ہوگا :۔

مجھے تلاش کرا ے بیخودی شوق سجود پہونچ کے منزل مقصد پہ کھو گیا ہوں میں
فریب خوردۂ رنگینیٔ ادا ہوں میں نظر کی چند شعاعوں میں گھر گیا ہوں میں
میری حیرت کی قسم آپ اٹھائیں تو نقاب میرا ذمہ ہے کہ جلوے نہ پریشاں ہونگے
گو سراپا حجاب ہیں پھر بھی تیرے رُخ کے نقاب ہیں ہم لوگ
تو سامنے ہے پھر بھی بتلا کہ تو کہاں ہے کس طرح تجھ کو دیکھوں نظارہ درمیاں ہے
تمام اٹھ گئے پردے تو اس سے کیا حاصل مزہ تو جب تھا کہ میں بھی نہ درمیاں ہوتا
فطرتِ مجبور پر قابو ہی کچھ چلتا نہیں ورنہ ہم تو تجھ سے بھی تجھ کو چھپا کر دیکھتے
حُسن تک دیکھ لیں سب حُسن کے جلوؤں کی بہار مجھ تک آئے تو مرا حالِ پریشاں ہونگے
ٹھہرا ے دل دردمند محبت تصور کسی کا پریشان ہوگا

تیسرا دور جس کے متعلق انتخاب کنندہ نے لکھا ہے کہ "بلند خیالات سادہ الفاظ میں" ظاہر کئے ہیں دورِ اول سے علحدہ ہم کو کہیں نظر نہیں آیا۔ ممکن ہے دورِ ثانی کے بعض ایسے اشعار جو جلد سمجھ میں آجاتے ہیں اور جن کی تاویل کی ضرورت نہیں ہوتی، انھوں نے دورِ ثالث سے متعلق کر دیے ہوں

بہرحال انتخاب جس اصول کو بھی سامنے رکھ کر کیا گیا ہو، اس میں شک نہیں کہ جگر کے کلام میں دو رنگ بالکل علحدہ علحدہ نظر آتے ہیں جن کی تعیین انتخاب کنندہ نے مجاز و حقیقت کی ہے اور ہمارے نزدیک اس کی تقسیم صرف یوں ہوتی چاہئے کہ ایک دور کا کلام واقعی تغزل کے صحیح معیار پر اُترتا ہے اور دوسرا اس سے ہٹا ہوا ہے، یعنی اگر سو شعر انھوں نے ایسے کہے ہیں جن سے وجدان صحیح بغیر کسی تاویل و کاوش کے لطف اندوز ہو سکتا ہے تو دس ایسے بھی نظر آتے ہیں۔ جو مشاعروں میں تو زیادہ سے زیادہ داد حاصل کرتے ہیں لیکن یوں اگر تنقید کی جائے تو وہ سوائے چند خوبصورت الفاظ و تراکیب کے مجموعہ کے اور کچھ نہیں ٹھیرتے۔ چنانچہ قسم دوم کے جو اشعار اوپر درج کئے گئے ہیں وہ سب اسی انداز کے ہیں

فریب خوردۂ رنگینیٔ ادا ہوں میں نظر کی چند شعاعوں میں گھر گیا ہوں میں

اگر دوسرے مصرعہ میں نظر سے مُراد اپنی نظر ہے تو مفہوم کی سخافت ظاہر ہے کیونکہ اس طرح مطلب یہ پیدا ہوتا ہے کہ محبوب کی خوشں ادائیاں صرف اپنی نظر کا فریب ہے ورنہ حقیقت کچھ نہیں، لیکن اگر یہ چند شعاعیں محبوب کی نگاہ کی ہیں تو پھر دونوں مصرعے غیر مربوط رہتے ہیں کیونکہ معشوق کی نگاہ رنگینیٔ ادا کا فریب پیدا کرنے والی نہیں

میری حیرت کی قسم آپ اٹھائیں تو نقاب　　میرا ذمّہ ہے کہ جلوے نہ پریشاں ہوں گے

اس شعر میں صرف لفظ پریشاں پر مفہوم کی بنیاد قائم کی گئی ہے جو لکھنوی انداز بیان کے لحاظ سے ممکن ہے بعض لوگوں کو اپیل کر سکے لیکن حقیقت کے لحاظ سے کچھ نہیں ہے

مدعا صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ آپ نقاب اٹھا دیں گے تو بھی میں فرط حیرت سے آپ کا نظارہ نہ کر سکوں گا، خیال اچھا ہے لیکن " جلوے نہ پریشاں ہوں گے " کہہ کر اس کو بُری طرح ادا کیا گیا ہے

اسی قسم کی تعبیر کا یہ شعر بھی ہے :-

ٹھہرا ہے دل در دمند محبت　　تصور کسی کا پریشاں ہو گا

غزل میں شعر کی خوبی یہ ہے کہ بغیر کسی تصنع کے جذبات کا اظہار ہو جائے اور تصوفانہ رنگ تعبیر میں یہی بات مفقود ہوتی ہے - بلکہ اگر غلو سے کام لیا جائے تو شعر مہمل ہو جاتا ہے - مثلاً

گو سراپا حجاب ہیں پھر بھی　　تیرے رُخ کی نقاب ہیں ہم لوگ

تاویل اور کھینچ تان کا ذکر نہیں کہ وہ تو جرکین کے کلام کو بھی سرتاسر تصوف و حکمت ثابت کر سکتا ہے، یوں دیکھئے کہ اس سے کوئی مفہوم پیدا ہوتا ہے یا نہیں۔

غالب کا مشہور شعر ہے :-

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے　　حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

غالب تو خیر یہ شعر کہنے کو کہہ گیا لیکن اس کے بعد شعراء نے اس سے جس قدر ناجائز فائدہ اٹھایا اس کا بیان بہت دردناک ہے، جگر کے یہاں بھی اسی فلسفۂ " ہوّیت " کے بعض انتخابات ملاحظہ ہوں

تو سامنے ہے پھر بھی بتلا کہ تو کہاں ہے　　کس طرح تجھ کو دیکھوں نظارہ درمیاں ہے

تمام اُٹھ گئے پردے تو اس سے کیا حاصل　　مزہ تو جب تھا کہ میں بھی نہ درمیاں ہوتا

نظارہ کا درمیان آ کر حجاب بن جانا، یا خود دیکھنے والے کا بھی " درمیاں " نہ ہونا، حقیقتاً کوئی مفہوم نہیں رکھتا

اسی طرح غالب کے اس مصرعہ نے

میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

لوگوں کو ایسے خیال کی طرف مائل کر دیا جس کا غلو یقیناً گمراہ کن ہے - جگر لکھتے ہیں

فطرت مجبور پر قابو ہی کچھ چلتا نہیں　　ورنہ ہم تو تجھ سے بھی تجھ کو چھپا کر دیکھتے

دوسرا مصرعہ اپنے اندر کوئی معنی نہیں رکھتا

الغرض جگر کے کلام کا وہ حصہ جو انتخاب کنندہ کی رائے میں " بلند خیالات " سے متعلق ہے ہمارے نزدیک جگر

کے لئے قابل فخر نہیں ہو سکتا ، لیکن اس رنگ سے ہٹ کر جو کچھ انھوں نے کہا ہے اس میں شک نہیں کہ وہ بالکل معیاری چیز ہے اور اس وقت کا بہتر سے بہتر شاعر ان پر ناز کر سکتا ہے ، مثالاً یہ اشعار ملاحظہ ہوں :-

ہنسی پھر اُڑنے لگی عشق کے فسانے کی ۔۔۔ نقاب اٹھاؤ بدل دو فضا زمانے کی

گوشِ مشتاق کی کیا بات ہے اللہ اللہ ۔۔۔ سُن رہا ہوں میں وہ نغمہ جو ابھی ساز میں ہے

قفس کے سامنے بجلی کچھ اس طرح چمکی ۔۔۔ نظر میں پھر گئی تصویر آشیانے کی

کہاں میں اور کہاں اب فسانۂ غمِ عشق ۔۔۔ وہ التفات نہ کرتے تو کچھ بیاں ہوتا

لیکے خط ان کا کیا ضبط بہت کچھ لیکن ۔۔۔ تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں نے بھرم کھول دیا

ہائے یہ حُسنِ تصور کا فریبِ رنگ و بو ۔۔۔ میں یہ سمجھا جیسے وہ جانِ بہار آہی گیا

یہ نشہ ، بھی کیا نشہ ہے کہتے ہیں جسے حُسن ۔۔۔ جب دیکھئے اک نیند سی آنکھوں میں بھری ہے

جگر کی وہ خصوصیت جو اس دَور کے دوسرے خوشگو شعرا سے اُن کو ممتاز کرتی ہے " ولولہ و جوش " ہے یعنی اُن کے جذبات محبت تشاؤم و قنوط کی طرف مائل نہیں ہیں ، بلکہ ان میں ایک خود دارانہ ربودگی پائی جاتی ہے ، ایک خاص قسم کا احساس مطمئن نظر آتا ہے ۔ اور اسی لئے ان کی شاعری لکھنؤ اور دہلی دونوں اسکولوں سے قدرے علیحدہ ہے ۔ جو ان کے پہلے اُستاد داغ اور دوسرے اُستاد تسلیم کے رنگ کے امتزاج سے مل کر پیدا ہوئی ہے ۔ ممکن ہے اُن کے کلام میں فلسفۂ حیات کے وہ نکات بھی پائے جاتے ہوں جو عشق و محبت کی دنیا میں انتہائے استغراق کے بعد ایک بے نیازانہ کیفیت سے تعلق رکھتے ہیں ، اور معنی آفرینی و ندرت تعبیر کے لحاظ سے بھی قابل لحاظ ہوا کرتے ہیں ، لیکن ان کا غالب رنگ وہی ہے ، جس میں کامیاب عشق و محبت کا جوش و ولولہ پایا جاتا ہے اور جو اس نوع کی رنگینیوں سے مالا مال ہے مگر افسوس ہے کہ اس مجموعۂ انتخاب میں جگر کے اس حقیقی رنگ کے شعر بھی بہت کم نظر آتے ہیں ۔ ان کی وہ غزل جس کا مطلع یہ ہے :-

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں

یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں ، یہ آرہے ہیں وہ جا رہے ہیں

جگر کی شاعری کی سچی تصویر ہے ۔ اسی غزل کا ایک اور شعر بھی انتخاب میں نظر آتا ہے :-

وہی قیامت ہے قد بالا وہی ہے صورت ، وہی سراپا

لبوں کو جنبش ، نگہ کو لرزش ، کھڑے ہیں اور مسکرا رہے ہیں

جگر اپنی طبیعت و فطرت کے لحاظ سے بہت لا اُبالی واقع ہوئے ہیں ۔ اور غالباً یہی سبب ہے کہ وہ اپنی غزلوں پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کی تکلیف بھی کم گوارا کرتے ہیں ۔ اُن کا ایک شعر ہے :-

ایک تجلی ، ایک تبسم ، ایک نگاہِ بندہ نواز ۔۔۔ اس سے زیادہ اے غمِ جاناں دل کی قیمت کیا کہئے

پہلے مصرعہ میں " تجلی، تبسم، نگاہ " کو بغیر کسی حرف عطف کے اس طرح یکجا کر دیا گیا ہے کہ " دل کی قیمت " یہ تینوں چیزیں قرار پاتی ہیں، درانحالیکہ مقصود یہ ہے کہ اُن میں سے کوئی ایک کافی ہے۔ علاوہ اس کے " ایک تجلی " کہنا ذوق پر ناگوار بار ہے، اگر پہلا مصرعہ یوں ہوتا :-

ایک تبسم، ایک جھلک، یا ایک نگاہِ بندہ نواز

تو دونوں نقص دُور ہو جاتے

دوسرے مصرعہ میں " غم جاناں " سے خطاب کرنا بھی بے محل ہے۔ اگر براہِ راست " جاناں " سے خطاب کیا جاتا تو شعر زیادہ لطیف ہو جاتا

ایک اور شعر ہے :-

ظلم کیا اب تو کرم بھی ہے گوارا مجھ کو
تیری اس اشک بھری چشمِ ندامت کی قسم

اس شعر کی بُنیاد یہ خیال ہے کہ محبوب کا کرم اس کے ظلم سے زیادہ تباہ کرنے والا ہے، یعنی لُطف و محبت کی ستم آرائیاں بہت زیادہ ہلاکت آفریں ہیں۔ یہ خیال بجائے خود اس میں شک نہیں کہ بہت لطیف ہے، لیکن دوسرا مصرعہ اس خیال سے علٰحدہ ہو کر موزوں ہو گیا ہے

صورتِ حال یہ ہے کہ محبوب سامنے موجود ہے اور اپنی اشک آلود نگاہوں سے اظہار ندامت کر رہا ہے۔ یعنی اس کی یہ کیفیت لُطف و عنایت کا اظہار کرنے والی ہے۔ اس لئے پہلے مصرعہ میں اس کو بہ لحاظ حقیقت ظلم نہیں کہہ سکتے۔ یہ مصرعہ یوں ہونا چاہئے تھا

لُطف کیا اب تو ستم بھی ہے گوارا مجھ کو

کیونکہ ستم کرنے کے بعد محبوب پھر اس کی تلافی اپنی ندامت سے کرے گا جو عاشق کی عین مراد ہے

ایک شعر اور ہے :-

مجھے تلاش کرا ے بیخودیِ شوقِ سجود
پہونچ کے منزلِ مقصد پہ کھو گیا ہوں میں

دوسرے مصرعہ میں " منزلِ مقصد " کی ترکیب محل نظر ہے، کیونکہ دونوں لفظ " ظرفیت " کا مفہوم رکھتے ہیں اسی لئے منزل کی اضافت ہمیشہ مقصود یا کسی دوسرے ایسے لفظ سے کی جاتی ہے جو ظرفیت کے مفہوم سے علٰحدہ ہو

نگاہِ دل بھی یکایک اسے سمجھ نہ سکی
وہ ہر کرم جو پسِ پردۂ عتاب ہوا

اس شعر میں لفظ نگاہ کوئی معنی نہیں دیتا صرف مصرعہ پورا کرنے کے لئے لایا گیا ہے یوں کہہ سکتے تھے

غضب ہے، دل بھی یکایک اسے سمجھ نہ سکا

یہاں "غضب ہے" کا استعمال صرف اظہار حیرت واستعجاب کے لئے ہوا ہے۔

اٹھا نہ دیدۂ بلبل سے پردۂ حیرت
ہلاک ہوگئی کمبخت رنگ و بو کے لئے

اس شعر کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ "بلبل رنگ و بو کے لئے ہلاک ہوگئی پھر بھی پردۂ حیرت نہ اٹھا" دوسرا یہ کہ "دیدۂ بلبل سے پردۂ حیرت نہ اٹھا یہاں تک کہ رنگ و بو کے لئے ہلاک ہوگئی" لیکن ان میں سے کسی مفہوم کے لحاظ سے پردۂ حیرت مناسب نہیں۔ اگر کسی طرح "پردۂ فریب نظر" لاکر مصرعہ ترتیب دیا جاتا تو بیشک "ہلاک ہوگئی کمبخت" کا پورا لطف آسکتا تھا

انھیں آنسو سمجھ کر یوں نہ مٹی میں ملا ظالم
پیام دردِ دل ہے اور آنکھوں کی زبانی ہے

چونکہ پیام واحد ہے اس لئے پہلے مصرعہ میں بجائے انھیں کے اِسے لکھنا زیادہ موزوں ہوتا۔ بعض بعض جگہ ترکیبوں میں نامانوس ثقل بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً

بھرم کھونا کہیں اے دل نہ عشقِ معتبر ہو کر
یا شروعِ راہِ محبت ارے معاذاللہ
یا یہ کیا کیا کہ عطا کر کے عشقِ لامحدود

عشقِ معتبر، شروعِ راہِ محبت اور عشقِ لامحدود، ثقیل ترکیبیں ہیں

الغرض جگر کے سو شعر کا انتخاب بھی غلط کیا گیا ہے اور بہت سے ایسے اشعار جو لینا چاہئے تھے انھیں ترک کر دیا گیا ہے اور جو قابل ترک تھے انھیں لے لیا گیا ہے۔ ورنہ اگر جگر کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو سو سے کہیں زیادہ اشعار بہترین رنگ تغزل کے ان کے یہاں میسر آسکتے تھے،

سنا ہے کہ حسرت و فانی وغیرہ کے کلام کا انتخاب شائع ہونے والا ہے۔ اگر انتخاب کرنے والے یہی صاحب ہیں تو ہم کو ابھی سے مایوس ہو جانا چاہئے ــــــ میری رائے میں انتخاب کی بہترین صورت یہی ہے کہ یہ خدمت خود اسی کے سپرد کی جائے جسکا کلام ہے، اس سے دو فائدہ مترتب ہونگے۔ ایک تو یہ کہ دنیا کو اسکے حقیقی رنگ کا پتہ چل جائے گا۔ اور دوسرے یہ کہ مستقبل میں کسی وقت اس انتخاب کی تاریخی وقعت بہت بڑھ جائے گی

نیاز

باب الاستفسار

زلزلہ کے اسباب

(طبقات الارض اور جوتش کے نقطۂ نظر سے)

(جناب محمد عبد الغنی صاحب - سارن)

زلزلہ کیا چیز ہے اور اس کے اسباب کیا ہیں۔ کسی ایک حصۂ زمین پر زیادہ جھٹکے محسوس ہونا اور دوسری جگہ کم یا بالکل نہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ کیا جوتشیوں کا یہ کہنا کہ سات سیارے ایک جگہ جمع ہوگئے تھے اور یہ تباہیاں اسی کی وجہ سے ہوئیں، کسی حد تک درست ہو سکتا ہے۔ اُمید ہے کہ آپ اس طرف جلد از جلد توجہ فرمائیں گے۔ کیونکہ اس وقت یہ موضوع خاص اہمیت رکھتا ہے

(نگار) زلزلہ کی حقیقت سمجھنے سے پہلے، یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ کرۂ ارض کی ساخت وکیفیت کیا ہے کیونکہ اسی کے سمجھنے پر زلزلہ کی حقیقت سمجھنا منحصر ہے

آپ زمین کی جس سطح پر چلتے پھرتے ہیں وہ سخت اور ٹھوس ہے، لیکن زمین کے اندر یہ کیفیت نہیں ہے، یعنی جس قدر زیادہ آپ مرکز زمین کی طرف بڑھتے جائیں گے، سطح کی یہ سختی کم ہوتی جائے گی اور گرمی بڑھتی جائے گی۔ یہاں تک کہ مرکز زمین تک پہونچتے پہونچتے یہ گرمی پگھلا دینے والے درجہ تک محسوس ہوگی اور زمین کا مادہ معدنیات کی پگھلی ہوئی کیچڑ کی صورت میں نظر آئے گا

کرۂ زمین تین حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلا حصہ جسے بالائی سطح یا خول کہتے ہیں اس کی دبازت ۶۰ میل ہے، اس کے بعد

دوسرا حصہ گرم پتھریلا ہے اور مشتمل ہے میگنیشیم اور چقماقی قسم کے پتھر پر، اس کی دبازت ۹۰۰ میل ہے، اس کے بعد زمین کا وہ مرکزی حصہ ہے جس میں زیادہ تر لوہا اور نکل نیم گداختہ حالت میں پائے جاتے ہیں، اس کی دبازت ۲۶۵۰ میل ہے

کرۂ زمین آفتاب ہی کا ایک ٹکڑا ہے جو دوران گردش میں اس سے علیحدہ ہو گیا تھا، اور کروروں برس کے بعد وہ آہستہ آہستہ سرد ہو کر اس قابل ہوا کہ جاندار اس پر سانس لے سکے۔ پھر جس طرح پگھلی ہوئی چیز کا بالائی حصہ پہلے خشک ہوتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ اندرونی حصہ میں انجماد پیدا ہوتا ہے، اسی طرح اول اول زمین کی وہ بالائی سطح خشک ہوئی جس پر انسان آباد ہے اور اندرونی حصہ ہنوز پوری طرح خشک نہیں ہوا بلکہ اب تک گرم و نرم ہے۔ لیکن زمین کی بالائی سطح بالکل یکساں دبازت کی نہیں ہے کسی جگہ اس کی موٹائی کم ہے اور کہیں زیادہ، اس لئے یوں سمجھنا چاہئے کہ زمین کا یہ خشک خول جس پر ہم آباد ہیں ایک ایسے ناہموار لکڑی کے تختے کے طرح ہے جو پانی پر تیر رہا ہو اور جس کا دباؤ نیچے کی طرف کہیں کم اور کہیں زیادہ ہو

اس خول کے نیچے جو مادہ پایا جاتا ہے وہ بالطبع دباؤ سے متاثر ہونے والا ہے یعنی جس جگہ اس پر دباؤ زیادہ پڑجاتا ہے وہ دب جاتا ہے اور جہاں دباؤ کم ہو جاتا ہے وہ اُبھرنے لگتا ہے۔ پھر اگر یہ مادہ پانی کی طرح رقیق ہوتا تو اس دباؤ کا نتیجہ جلد ظاہر ہو جاتا لیکن چونکہ اس کا قوام بہت گاڑھا ہے اس لئے بہت کافی زمانہ کے بعد اس پر دباؤ کا اثر ہوتا ہے

اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ زمین کے بالائی خشک خول کا دباؤ بہت تغیر پذیر ہے کیونکہ ہوا، پانی، گرمی و سردی کے اثرات سے یہ سطح کسی جگہ پہاڑوں کی متحجر صورت اختیار کر لیتی ہے، کہیں پتھریلا حصہ پس پسا کر غبار بن جاتا ہے اور پانی میں مل کر سمندر کی سطح کے دباؤ کو بڑھاتا رہتا ہے۔ الغرض زمین کا سمٹ کر پہاڑ بن جانا اور پہاڑوں کا مسطح میدان ہو جانا۔ کرۂ زمین کی تاریخ کے وہ واقعات ہیں جو وقت نامعلوم سے جاری ہیں اور معلوم نہیں کب تک جاری رہیں گے

چنانچہ زمین کا وہ حصہ جسے سوئٹزرلینڈ کہتے ہیں کسی وقت ۲۰۰ میل کا بالکل مسطح میدان تھا، لیکن اب وہاں پہاڑ ہی پہاڑ ہیں اور بجائے ۲۰۰ میل کے اس کی پیمائش صرف ۱۲۰ میل رہ گئی ہے

اس قدر معلوم کر لینے کے بعد غالباً یہ سمجھنا آسان ہوگا کہ زمین کے اندرونی حصہ پر بالائی خول کا دباؤ فطری امر ہے اور اس دباؤ سے اندرونی مادہ کا کسی جگہ دب جانا اور کسی جگہ ابھر جانا یقینی ہے۔ فرض کیجئے آپ کسی کشتی پر بیٹھے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ اور اس کے کسی کنارہ پر زیادہ دباؤ پڑجاتا ہے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ جدھر دباؤ پڑا ہے اس طرف کا کنارہ دب جائے گا اور دوسری طرف کا اونچا ہو جائے گا، لیکن یہ عمل اسی جگہ ختم نہ ہو جائیگا بلکہ پانی اپنی اصلی سطح اختیار کرنے کے لئے پھر متموج ہوگا اور کشتی میں متواتر ادھر اُدھر ہچکولے پیدا ہوں گے۔ بالکل

یہی صورت زمین کی سمجھئے کہ جب بالائی خول کے کسی حصہ کا دباؤ اس کی اندرونی سطح پر زیادہ پڑے گا تو وہ حصہ دب جائے گا اور دوسری طرف کا اُبھرنے لگے گا یہاں تک کہ توازن قائم رکھنے کے لئے متواتر ہچکولے اس کو کھانا پڑیں گے، اور یہی ہے زلزلہ اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ فلاں حصۂ زمین اس قدر بلند ہوگیا اور فلاں اس قدر پست

اب آپ حال کے زلزلۂ صوبہ بہار کو دیکھئے اور اس پر اس نظریہ کو منطبق کیجئے۔ فرض کیجئے کہ دامن ہمالیہ سے لے کر خلیج بنگال تک کا حصۂ زمین ایک لکڑی کا تختہ ہے جو پانی پر تیر رہا ہے اور خلیج بنگال کی طرف اس کا دباؤ زیادہ ہوگیا، اس لئے لامحالہ نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمالیہ کی طرف زمین کا اندرونی مادہ ابھرے گا

پھر مظفرپور، پٹنہ، مونگیر وغیرہ میں جو زمین جا بجا شق ہوئی ہے تو اس کا سبب یہی ہوا کہ خلیج بنگال کی طرف دباؤ زیادہ پڑ گیا اور صوبۂ بہار کی طرف مادۂ زمین نے اُبھر کر ہلچل ڈال دی۔ اسی طرح ۱۹۰۵ء میں جو زلزلہ آیا تھا اس میں وادی کانگڑا کی طرف زیادہ دباؤ پڑا تھا اور اس کا مقابل حصہ سرزمین یو۔پی کا زیادہ متاثر ہوا تھا

پھر چونکہ اس دباؤ کی وجہ سے اندرونی مادہ کا توازن خراب ہوجاتا ہے، اس لئے اُس کے اصلی توازن پر آنے کے لئے کچھ عرصہ تک تموج کی کیفیت باقی رہتی ہے اور یہی سبب ہے کہ ۱۵ر جنوری کے بعد بھی ہلکے ہلکے جھٹکے برابر محسوس ہو رہے ہیں اور اس وقت تک محسوس ہوتے رہیں گے۔ جب تک اندرونی مادہ اپنی اصلی سطح پر نہ آجائے

آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ مقامات جو سمندر کے ساحل پر آباد ہیں وہاں اکثر و بیشتر زلزلے آتے رہتے ہیں اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ سمندر میں پہاڑوں اور زمین کا ایک حصہ کٹ کٹ کر دریاؤں کے ذریعہ سے پہونچتا رہتا ہے اور اس لئے سمندر کی سطح کا دباؤ آہستہ آہستہ بڑھتا رہتا ہے اور اس دباؤ کی وجہ سے زمین کے اندرونی مادہ میں تموج پیدا ہوتا ہے اور دوسرا سبب یہ ہے کہ بعض اوقات سمندر کا پانی رِس رِس کر مرکز زمین کی طرف پہونچتا ہے اور وہاں گرم مادہ پر پڑ کر بخارات میں تبدیل ہوجاتا ہے جو اوپر کی طرف بلند ہوکر باہر نکلنا چاہتے ہیں اور اس طرح زمین میں جنبش پیدا ہوجاتی ہے

اب رہا جوتشیوں اور نجومیوں کا یہ کہنا کہ سات سیاروں کا قِران اس کا باعث ہوا ہے، سو اس کی علمی توجیہ ان کی طرف سے یہ کی جاتی ہے کہ ان سیاروں کی کشش سے زمین جنبش میں آئی، لیکن تنقید صحیح کے بعد ان کی یہ توجیہ پایۂ اعتبار سے گر جاتی ہے، کیونکہ اس زمانہ میں سات سیاروں کا قِران منطقۂ جدی (Zodiac of Capricorn) میں ہوا تھا جو خطِ استوا سے ۲۲ ½ درجہ جانب جنوب واقع ہے، اس لئے اصولاً ان کی کشش کا اثر کرۂ زمین کے جنوبی حصہ پر زیادہ ہونا چاہئے تھا۔ اور آسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور جنوبی امریکہ میں زلزلہ محسوس ہونا ضروری تھا، نہ کہ صوبۂ بہار میں جو خطِ استوا سے مابین ۲۶ و ۲۹ درجہ جانب شمال واقع ہے۔ اور جنوبی حصہ سے ۲۵۰۰ میل کا بُعد رکھتا ہے

علاوہ اس کے یہ سات سیاروں کا قِران چند منٹ تک تو رہا نہیں۔ بلکہ کئی دن تک رہا ہے۔ اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ دورانِ قِراں یہ مصیبت صرف ایک بار ظاہر ہوکر کیوں ختم ہوگئی

پھر اگر یہ معاملہ صرف سیاروں کی کشمش کا تھا تو اس کا بہت زیادہ اثر سمندروں پر ہونا چاہئے تھا جو رقیق ہونے کے لحاظ سے کشمش کو زیادہ قبول کرسکتے ہیں نہ کہ صوبۂ بہار کی سرزمین پر جو یقیناً پانی کے مقابلہ میں زیادہ ٹھوس اور جامد ہے

جو کچھ میں نے عرض کیا، یہ ہے حال کی تحقیق زلزلہ کے متعلق، لیکن اس کو آخری لفظ قرار دے کر یہ باور کر لینا کہ ترقی علوم کی آیندہ منزل اس میں کوئی اور اضافہ نہ کرسکے گی، یا کچھ اور اسباب اس کے دریافت نہ ہوسکیں گے، صحیح نہیں ـــــ مگر ہاں یہ بالکل یقینی ہے کہ زلزلہ کا سبب وہ فرشتے نہیں ہیں جو کوہ قاف کے گرد زنجیریں ڈالے ہوئے بیٹھے ہیں اور جب وہ اسے پکڑ کر ہلا دیتے ہیں تو ساری زمین پر جنبش پیدا ہو جاتی ہے

باب المراسلۃ والمناظرہ

(جناب شیر احمد خاں صاحب وکیل لودھیانہ)

محترم بندہ جناب مولانا نیاز صاحب

السلام علیکم ،

دسمبر ۱۹۳۲ء کے " نگار " میں " ملاحظات " کی تحت میں " عیش یا مسرت " کے عنوان سے آپ کا دلچسپ مضمون میری نظر سے گذرا ، آپ نے اس مضمون میں نہایت خوب صورت الفاظ میں " عیش یا مسرت " کی حقیقت پر تفصیلی بحث کی ہے ، اور اسی ضمن میں مذہب ، وطنیت ، قومیت ہر سہ تحریکات کے مضر اثرات و نتائج پر بھی تنقید کی ہے ، " امن و سکون " کا واحد ذریعہ " کے ضمنی عنوان میں آپ نے یوں مشورہ دیا ہے کہ " اگر دنیا کو واقعی امن و سکون کی ضرورت ہے ، تو اس کا حصول نہ تجارتی مفاہمت سے ہوسکتا ہے ، نہ تخفیف اسلحہ کی کوشش سے ، بلکہ صرف اس طرح کہ تمام ممالک کے اہل الرائے ایک جگہ جمع ہوکر ، حکومتوں کے اختلافات کو مٹائیں اور تمام ممالک کو اصول فیڈریشن پر ایک نظام حکومت سے وابستہ کردیں " اگر آپ کے اسی مشورہ کے مطابق عمل نہ کیا گیا ، تو " ـــــ یقین رکھنا چاہئے ، کہ دنیا کو ایک بار ضرور تباہ ہونا ہے خواہ وہ تباہی اس کو پھر عہد وحشت کی طرف لیجا کر کسی اور تہذیب و تمدن کی بنیاد ڈالنے پر مجبور کرے ، یا قیامت کبریٰ " قائم کرکے نظام شمسی میں ایک اور ویران غیر آباد کرہ کا اضافہ کرنے والی ثابت ہو "

جس " عیش یا مسرت " کا آپ نے اپنے مضمون میں ذکر کیا ہے ، وہ عیش یا مسرت " ہرگز منتہائے مقصد حیات انسانی نہیں ، اس کی تلاش انسان پر فرض ، اور اس کے بغیر انسان کی زندگی اجیرن نہیں ہوجاتی - انسانی زندگی بلند مقاصد کی جستجو میں ہے اور وہ بلند مقاصد " عیش و مسرت " کی آغوش میں نہیں ، " عیش و مسرت " کی آغوش خواب آور اور آرزو کُش ہے ، انسان اس دنیا میں اپنی عبدیت کے لئے خلق کیا گیا عیش و مسرت " کے حصول کے لئے نہیں کوئی مذہب انسان کو دنیا میں حصول عیش و مسرت کی تعلیم نہیں دیتا اور نہ ہی مذہب طلسم ہوشربا ، اور تخیلی فردوس کا نام ہے اگر مسرت کہیں ہے تو وہ انسانی فرایض کو بہ طریق احسن ادا کرنے کے اطمینان قلبی

ہیں۔ دنیا نے امن و سکون کی بیہودہ تلاش میں کئی خونیں قلزم عبور کئے، مگر اب تک اُسے وہ امن و سکون نصیب نہیں ہوا، اور نہ ہی مستقبل قریب میں کسی ایسے امن و سکون کے ظہور کی توقع کی جا سکتی ہے، زندوں کی بستی میں کبھی امن و سکون نہیں رہ سکتا، البتہ مُردوں کی دنیا یعنی قبرستان میں ہمیشہ خاموشی پُر ہیبت سکون، اور امن ہر وقت مسلط رہتا ہے، دنیا کو قبرستان کے امن و سکون کی ضرورت نہیں ——— مذہب پر سب سے بڑا الزام جو آپ نے عائد کیا ہے وہ یہ ہے، کہ "مذہب نے خون ریزی، اور خونفشانی کے سوا، کوئی خدمت سرانجام نہیں دی" حق و باطل کی آویزش فطرت کا ایک عالمگیر، اَن مٹ، قانون ہے، جس کی سرتابی میرے اور آپ کے اختیار سے باہر ہے (کم از کم میں اپنے متعلق ضرور کہہ سکتا ہوں آپ شاید اپنے کو مستثنےٰ کردیں) دن اور رات کا انقلاب، روشنی اور تاریکی، گرمی اور سردی، بہار اور خزاں، سورج اور چاند کی گردش قانون قدرت کے یہ عالمگیر مظاہرے اس امر کے متقضی ہیں، کہ حرکت نہ ختم ہونیوالی، حرکت فطرت کی ہر شے میں حکمراں رہے، اور ہر لمحہ بدلنے والی دنیا کا ہر انقلاب پذیر ذرہ امن و سکون کے خلاف علم جہاد بلند کئے ہوئے ہو۔ جد و جہد اور ہر حرکت "بقاء اصلح" کے جہاں گیر اصول کی زندہ تشریح ہے۔ جب تک سورج مشرق سے نکل کر مغرب میں غروب ہوتا رہے گا، اس وقت تک انسانوں کی بستی میں آپس میں محبت اور پیار، جنگ و فساد، صلح و آشتی، نفاق، اور فراق کے رنگین مناظر آنکھوں کے سامنے اسی طرح رقصاں رہیں گے۔ جدال و قتال، بربادی و آبادی، لازمۂ حیات انسانی ہیں۔ یہ ابتدائی اصولی غلطی ہے، اگر کوئی کسی تحریک یا مذہب سے یہ توقع رکھے، کہ وہ دنیا میں بہشت قائم کرے۔ اور پھر بہشت بھی وہ جس کے متعلق یہ کہا جائے ع

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

دنیا کا یہ وسیع کارخانہ قبرستان کے امن و سکون کے لئے مرتب نہیں کیا گیا۔ جو لوگ اسی دنیا میں ایسی بہشت کی متلاشی ہیں، وہ سخت دھوکے میں ہیں۔ اور اک سراب کے تعاقب میں اپنی زندگیاں ضائع کر رہے ہیں۔ انسان کا جسم صحت، اور بیماری کے عوارضات کا تختۂ مشق اسی طرح بنتا رہے گا۔ اس کا دل اسی طرح بڑھتی ہوئی امنگوں، اور پُرجوش آرزوؤں کا مسکن رہے گا، اور جہد للبقا کا لازوال نہ مٹنے والا قانون کائنات کے ہر ذرہ پر اسی طرح حکمراں رہے گا، خواہ آپ مانیں یا نہ مانیں، چاہیں یا نہ چاہیں، یہ جنگیں یہ فسادات یہ خوں ریزیاں اور خوں آشامیاں اسی طرح دنیا کے چہرہ کو بدنما کرتی رہیں گی، انسان فرشتہ تو ہونے کو رہا۔ حرص و آز، ہوس اور خود غرضیاں جن انسانی اعمال کے محرکات ہوں ان کا نتیجہ بدیہی تباہی، اور فساد ہے، مذہب اک جادہ اعتدال کا نام ہے، جس جادہ اعتدال پر گامزن ہوکر انسان دنیا کی فلاح و بہبود مرادر بنی نوع انسان کی وسیع برادری میں باہمی اخوت و پیار کا باعث بن سکتا ہے، انسان میں جو درندگی اور حیوانیت پائی جاتی ہے، وہ مذہب کے اصلاح کُن اثر سے، اطاعت، اور شفقت کے پاکیزہ جذبات میں بدل سکتی ہے، تنہا مذہب وہ مقدس تحریک ہے، جس نے انسان کی درندگی اور بہیمیت کو اخوت اور اطاعت میں بدل کر دربار خداوندی میں عبدیت کی قبا کے ساتھ خلافت الارض کی خلعت پہنادی ہے۔ باقی رہیں وہ جنگیں، جو دنیا میں مذہب کے

نام پر کی گئی ہیں ، ان میں سے بعض تو محض جوع الارض اور بادشاہوں کی اپنی انانیت کا نتیجہ تھیں ، اور وہ جنگیں جو خالصاً اللہ کے راستہ میں... لڑی گئیں ، وہ نسل انسانیت کی صحیح نشو و نما اور تربیت کے لئے عین ضروری تھیں ، جراثیم زدہ اعضا کا کاٹ دینا ہی دیگر اعضا کی تندرستی ، اور صحیح تربیت کے لئے ضروری ہے ہر تخریب میں تعمیر ، ہر بربادی میں آبادی ، اور ہر ویرانہ میں بستی کے آثار اور نشانات پائے جاتے ہیں ، ہر نئی تعمیر کے لئے قدیم تعمیر کا گرایا جانا ضروری ہے ، الفاظ کی بہشت تو آپ سا جادو نگار ہر ورق پر قائم کر سکتا ہے ۔ مگر انسانی اعمال سے ایسی بہشت دنیا میں نہ کبھی قائم ہوئی ہے اور نہ کبھی قائم ہوگی ۔ دنیا فرشتوں کی بستی نہیں بن سکتی ، اور نہ ہی دنیا مہاتماؤں کا مندر ہے ، انسانی زندگی میں قہقہے بھی ہیں اور آہیں بھی ، جد و جہد کی صعوبتیں بھی ، تحمل و برداشت کی آذیتیں بھی ، ناکامیابیوں کی تلخ کامیاں بھی ۔ ع

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بو لہبی

موجودہ برسر اقتدار حکومتیں جو دنیا میں امن و سکون قائم کرنے کی کوششیں کبھی تخفیف اسلحہ کی صورت میں ، اور کبھی تجارتی مفاہمت کی صورت میں کر رہی ہیں ، یہ محض ان کی سیاسی چالیں ہیں ، ان کی ان کوششوں کا مقصد صرف یہ ہے کہ مغلوب اقوام اپنا سر نہ اٹھائیں ، اور اپنے غصب شدہ حقوق اُن سے طلب نہ کریں ، وہ اب جنگ اس لئے نہیں چاہتے ۔ کہ کہیں دوسری جنگ میں وہ سب کچھ کھو نہ بیٹھیں ، جو انھوں نے گذشتہ جنگوں میں حاصل کیا ہے ۔ وہ امن اب اس لئے چاہتے ہیں ، کہ گذشتہ جنگ کی تھکان دُور کر لیں ، اور جو کچھ انھوں نے گذشتہ جنگوں میں حاصل کیا ، اُس مال غنیمت کو اطمینان کے ساتھ اب بیٹھ کر اچھی طرح ہضم کر لیویں ، وہ دوسروں کے غصب شدہ حقوق اُگلنا نہیں چاہتے ۔ دنیا کی موجودہ تقسیم دولت ، و حکومت پر وہ مطمئن ہیں ، اور اس تقسیم میں کسی مزید تبدیلی اور انقلاب کو اب وہ نہیں چاہتے ، امن و سکون کی یہ کوششیں اگر کامیاب ہو گئیں ۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا ۔ کہ مغلوب اقوام ہمیشہ کے لئے مغلوب رہیں گی ، اور وہ کبھی بھی حریت کی حیات آفریں فضا زندگی حاصل نہ کریں گی

اختلافات مادی ہوں یا اعتقادی ، ہمیشہ سے چلے آئے ہیں ، اور اسی طرح قائم رہیں گے ۔ میری اور آپ کی مساعی آنے والی " قیامت کبریٰ " کو روک نہیں سکتیں ۔ اور اسی " قیامت کبریٰ " کے لپٹ جانے میں درحقیقت مظلوم اور بے دست و پا اقوام کے لئے کوئی فلاح و بہبود مضمر نہیں ہے ۔ جنگیں ہمیشہ مظلوم کو ظالم کی دستبرد سے نجات دلاتی ہیں اور اکثر غاصبوں کیلئے تازیانہ عبرت کا حکم رکھتی ہیں ۔ (War is a biological Process) ایک انگریزی مقولہ ہے ۔ جنگ بھی افزائش نسل کے لئے ضروری ہے ۔ انسان تحفظ نفس کے لئے اپنے گرد و پیش کے حالات

سے برسرِ پیکار رہنے پر مجبور ہے ، انسان دنیا میں کائنات ارضی پر حکمرانی کے لئے خلق ہوا ہے اس لئے اُسے پانی ، ہوا ، اور زمین کو اپنے زیر نگیں کرنا ہے ، مذہبی اختلافات بالکل مٹ نہیں سکتے ۔ البتہ کم شاید ہو جائیں ، نیکی اور بدی ، کفر اور ایمان دونوں کی زندگیاں پہلو بہ پہلو جاتی ہیں ۔ ان کی باہمی آویزش سے گریز جبن اور بزدلی ہے ۔ البتہ اس جنگ میں بلند ہمتی سے شرکت ، صحیح فتح ہے ، جنگل کو سبزہ زار بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے اُسے خس وخاشاک سے پاک صاف کیا جائے ۔ کپڑا انسان کے جسم پر اس وقت راست آتا ہے جب درزی اسے پہلے کاٹ دیتا ہے ۔ انسان کو فقط کھلونا نہ جانئے ، جو محض کھیلنے کودنے اور ہنسنے کے لئے دنیا میں آیا ہو ، محبت ، نفاق اور دشمنی انسانی قلب کی یہ سہ گونہ کیفیات ازلی اور ابدی ہیں ، اسی بنی نوع انسان کی وسیع برادری میں ہمیشہ سے مومنوں ، منافقوں اور منکروں کے گروہ قائم رہے ہیں

دنیا میں کوئی مذہب انسان کو انسان سے نفرت کا درس نہیں دیتا ۔ البتہ جو شخص ننگ انسانیت ہو ، اس کے عدم کو وجود سے بہتر ضرور سمجھتا ہے ۔ اگر اس کے متعلق اصلاحی قومیں بیکار ثابت ہو چکی ہوں

باقی رہا اس ملک کی فرقہ پرستی ، اس کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ ع

اے باد صبا این ہمہ آوردۂ تست

باہمی بدگمان نتیجہ ہیں ، قوموں کے باہمی عدم توازن کا ، جو قوم اپنے کو کمزور سمجھتی ہے ۔ وہ اپنی بقا ، کے لئے تحفظات کے تعین کے لئے فطرتاً مجبور ہے ، تحفظات کے مطالبہ کو اقلیت بھی اس حالت میں ترک کر سکتی ہے ، اگر اکثریت اور بالخصوص طاقتور اکثریت اپنی روش اور اپنے سلوک سے اقلیت کے دل میں اپنے لئے اعتماد پیدا کردے ۔ فرقہ وارانہ ذہنیت ہمیشہ قوموں میں باہمی بداعتمادی کا نتیجہ ہوتی ہے ۔ اکثریت کا اقلیت کے حقوق اور مفاد کے ساتھ غیر مشفقانہ اور غیر ہمدردانہ سلوک اقلیت کو ہمیشہ اکثریت سے بدگمان کر دیتا ہے ۔ جس ملک یا بستی میں بداعتمادی کی فضا مسلط ہو ، ایک طرف سے تحفظات حقوق کی طلب ہو ، اور دوسری طرف سے اس طلب کا جواب اغماض ، اور گریز سے دیا جا رہا ہو اس کا بدیہی نتیجہ یہ ہے کہ اس ملک کی قوموں میں منافرت کی خلیج وسیع ہوتی چلی جائے ۔ ایسے ناخوشگوار حالات کے اصلی اسباب کا تعین کبھی مفید نتیجہ کا باعث نہیں ہوا ، ہندوستان کے مسلمان لاکھ قربانیاں کریں ، اور اپنی زندگیاں استخلاص وطن کی مقدس تحریک کے لئے وقف کر دیں ، مگر اکثریت کے قلوب میں ان کے لئے کبھی ہمدردی اور محبت کے جذبات پیدا نہ ہوں گے غلط یا درست وہ اس ملک کو تنہا اپنی ملکیت سمجھے ہوئے ہیں ، اور انھیں ہر مسلمان محمود غزنوی نظر آرہا ہے ، باہمی مصالحت اور مفاہمت کی ساعی ہمیشہ مبارک ہیں ، اور ہر شریف انسان باہمی اعتماد کو بداعتمادی پر ترجیح دے گا ، لیکن ہر مبارک سعی کی کامیابی یقینی نہیں ہے ،

ہندوستان کی گذشتہ تاریخ از سر نو مرتب اگر ہو سکتی ہے تو شاید پھر باہمی مصالحت کی مساعی بھی مشکور ہوں ، اور البتہ یہ امر یقینی ہے کہ اگر دونوں اقوام کو آپس میں یہاں مل جل کر رہنا ہے ، تو انھیں ایک نئی تاریخ مرتب کرنی ہوگی اور تاریخ ہند

میں "مسلمانوں کا باب" جس انداز، اور ترتیب سے اب مرتب ہے، وہ یقیناً بدلنا پڑے گا - اور شاید ہندوستان کی تمام گذشتہ تاریخ کو ایک سفید ورق کی صورت میں تبدیل کرنا ہو

خدارا اپنے مضامین میں الفاظ کی بہشت قایم کرکے مسلمان نوجوانوں کو محض شاعر اور نگار پرست نہ بنائیے - میں نے آپ کے رسالہ کے اکثر نوجوان قارئین کو محض بیکار دیکھا ہے - بیشک وہ آپ کے مضامین - شگفتہ تراکیب اور بلند تخیلات کو مزے لے لے کر پڑھتے ہیں، مگر عملی اعتبار سے محض اینٹ اور پتھر کی طرح جامد ہیں - نیت تو یقیناً آپ کی مبارک اور نیک ہے، مگر بدقسمتی سے نتائج خطرناک پیدا ہو رہے ہیں، کاش آپ میرے ساتھ یہاں ہوں تو میں آپ کو دکھلاؤں کہ اس "نگار پرستی" نے کتنے مسلمان نوجوانوں کو گمراہ، بیکار، اور گستاخ کر دیا ہے - خدا اُس علم سے محفوظ رکھے، جو شر اور گمراہی پھیلائے

(نگار) اُن تمام صریحی اختلافاتِ بیانی کو نظر انداز کرنے کے بعد جو جابجا آپ کی تحریر میں نظر آتے ہیں، اس کی تلخیص یہ کر سکتا ہوں کہ :-

(۱) دنیا میں امن و سکون کی تلاش، جستجوئے محال ہے

(۲) مذاہب عالم کا مقصد کبھی "عیش و مسرت" کا حصول نہیں تھا بلکہ صرف "عبدیت" کی کیفیت انسان پر طاری کرنا تھا

(۳) مذاہب عالم کی خونریزی و خون آشامی عین فطرت کے مطابق ہے کیونکہ حق و باطل کی جنگ فطری قانون ہے

(۴) دنیا میں کوئی مذہب انسان کو انسان سے نفرت کرنے کا درس نہیں دیتا مگر جو شخص ننگ انسانیت ہو اس کو ضرور فنا کر دینا چاہتا ہے

(۵) ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کی مصالحت ناممکن ہے جب تک تاریخ ہند میں "مسلمانوں" کا باب بالکل نہ بدل دیا جائے

(۶) نگار کی تحریریں مُلک کے نوجوانوں کو گمراہ، بیکار اور گستاخ بنا رہی ہیں ——— اور یہ کہ

(۷) خدا اُس علم سے محفوظ رکھے جو شر اور گمراہی پھیلائے

آخری دو باتیں حذف کرنے کے بعد جن کا تعلق صرف نگار یا صاحب نگار سے ہے اور جن کا جواب دینا چنداں ضروری نہیں، باقی تمام امور یقیناً غور طلب ہیں لیکن افسوس ہے کہ فاضل مُراسلہ نگار نے جو تنقیح درج کی ہے اسے ژولیدگی و تناقص کے لحاظ سے کسی کامیاب قانون پیشہ شخص سے منسوب کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا

قبل اس کے کہ میں فاضل مُراسلہ نگار کی تصریحات پر تنقید کروں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے میں دسمبر کے "ملاحظات" کا مفہوم یہاں مختصر طور پر ظاہر کر دوں جس کے خلاف صاحب مضمون نے احتجاج کیا ہے

میں نے دسمبر کے ملاحظات میں ظاہر کیا تھا کہ عیش و مسرت دو بالکل علٰحدہ چیزیں ہیں عیش نام ہے جسم کی آسائش کا حواس ظاہری کی لذت کا اور مسرت نام ہے اطمینانِ نفس اور راحتِ روح کا، اس لئے اگر دنیا واقعی امن و سکون کی طلبگار ہے تو اُسے اسباب عیش کی جستجو نہ کرنا چاہئے بلکہ حصولِ مسرت کے درپے ہونا چاہئے۔ اسی سلسلہ میں میں نے یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ اس کے حصول میں اس وقت تک نہ مذاہب عالم کامیاب ہوئے ہیں، نہ جذبۂ قومیت و وطنیت کو کامیابی نصیب ہوئی ہے اور نہ علم و حکمت کی ترقی اس جنس گرانمایہ تک دسترس پا سکی ہے۔ اس لئے اب اگر تجربہ باقی رہ گیا ہے تو صرف یہ کہ تمام مذاہب کو صرف ایک مرکز پر لایا جائے جسے "انسانیت پرستی" کہتے ہیں اور جملہ حکومتوں کو صرف ایک نظامِ حکومت سے وابستہ کیا جائے۔ جو تمام سلطنتوں کے تحالف و مواخاۃ سے حاصل ہو سکتا ہے

یہ تھا میرا مفہوم جس سے مراسلہ نگار نے نہ صرف یہ کہ اختلاف کیا ہے، بلکہ بعض نئی باتیں ایسی پیش کی ہیں جن کے سمجھنے کے لئے مجھے خود استفسار کی ضرورت محسوس ہوتی ہے

(۱) و (۲) دُنیا میں امن و سکون کی تلاش جستجوئے محال ہو یا جستجوئے ممکن، لیکن غالباً اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ہے وہ بالکل فطری چیز ــــ نہ صرف انسان بلکہ وحوش و طیور اور نباتات بھی اسی چیز کی جستجو میں ہیں اور مخلوقات کا فطری خود غرض پیدا کیا جانا اسی مصلحت کے ماتحت ہے کہ وہ اس کی جستجو میں لگے رہیں پھر چونکہ امن و سکون انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے فطری اقتضا ہے، اس لئے یہ کہنا کہ دُنیا میں حقیقی مسرت کوئی چیز نہیں، بلکہ اصل شے "عبدیت" ہے اور اسی کی اشاعت کے لئے مذاہب عالم وجود میں آئے بالفاظ دیگر یہ مفہوم رکھتا ہے کہ مذاہب کا تعلق مسرت یا اطمینانِ نفس سے نہیں بلکہ کسی اور چیز سے ہے جس کا نام فاضل مراسلہ نگار نے "عبدیت" رکھا ہے

مجھے اس سے بالکل اتفاق ہے، لیکن غالباً قابل معترض نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ جس چیز کو وہ "عبدیت" سے تعبیر کرتے ہیں، وہی میرے نزدیک سکونِ نفس و اطمینان ضمیر ہے

"عبدیت" کسے کہتے ہیں؟ اگر اس کا مفہوم صرف یہ ہے کہ ایک انسان اپنے آپ کو خدا کا بندہ سمجھ کر صرف رشتۂ عبد و معبود پر اعتماد کرے اور عبادت و نیایش کے مروجہ طریقوں پر کاربند ہو کر اپنے فرائض عبدیت سے عہدہ برآ ہو جانے کا یقین رکھے، تو یہ ایسی ادنیٰ درجہ کی تعبیر ہوگی کہ انسان و حیوان کے درمیان کوئی فرق باقی نہ رہے گا کیونکہ انسان کا خدا کے مُقابلہ میں صرف اپنے آپ کو عاجز اور بندۂ بیچارہ سمجھ لینا کوئی معنی نہیں رکھتا، ایک جانور بھی انسان کے ہاتھ میں اپنے آپ کو ایسا ہی سمجھتا ہے

فرض کر لیجئے ایک انسان خدا سے ڈر کر رات دن اس کی عبادت میں مشغول رہتا ہے تو اس سے مدعا کیا ہے یعنی وہ کس امر سے خائف ہو کر اس کی پوجا کرتا ہے، ظاہر ہے کہ اس کا یہ فعل کسی غرض سے خالی نہیں ہو سکتا، یعنی وہ یا تو اپنی دنیاوی فلاح و ترقی کی امید پر ایسا کرتا ہے یا اخروی نجات کی ترقی پر۔ اگر مقصود وہ ہے تو محض یہ "خوفِ عبدیت"

بیکار ہے جب تک وہ دنیا کے اصول پر نہ چلے اور اگر مدعا دوسرا ہے تو ایسا انسان دنیا اور دنیا والوں کے لئے بیکار ہے ——— میرے نزدیک "عبدیت" کا صحیح مفہوم صرف یہ ہے کہ انسان جس طرح اپنے آپ کو خدا کا بندہ سمجھتا ہے اسی طرح دوسروں کو بھی سمجھے اور دوسروں کے احساسات کی پامالی پر اپنے جذبات کی کامیابی کی بنیاد قائم نہ کرے۔ اسی کا میں نے دوسرا نام "انسانیت پرستی" رکھا ہے اور یہی مقصود مذہب کا ہونا چاہئے۔ لیکن چونکہ تجربہ اس کے خلاف ثابت ہوا ہے۔ اور اس وقت تک مذاہب اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اس لئے لامحالہ ہم کو "مذہب" کا کوئی اور بلند مفہوم قائم کرنا پڑے گا اور وہ صرف یہی ہوسکتا ہے کہ "لامذہبیت" مذہب قرار دیا جائے جسے دوسرے الفاظ میں (Morality without religion) بھی کہہ سکتے ہیں

آپ خود تسلیم کرتے ہیں کہ "مسرت نام ہے انسانی فرایض کو بہ طریق احسن ادا کرنے" کا اس لئے کیا میں یہ سوال کرسکتا ہوں کہ کیا انسانی فرایض میں اہم ترین فرض یہ نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کو بھی خواہ وہ کسی قوم و ملت سے تعلق رکھتے ہوں ہمدردی کی نگاہ سے دیکھے اور ان کے ساتھ رشتۂ اخوت و محبت قایم کرکے تنگ نظری و عصبیت کو دور کردے۔ پھر اگر اس کا جواب آپ اثبات میں دیں گے (اور یقیناً دیں گے) تو آپ کو میرے اس قول سے کیوں اختلاف ہے کہ انسان صرف قیام مسرت کے لئے وضع ہوا ہے نہ کہ اسباب عیش کی فراہمی کے لئے۔ رہا آپ کا یہ فرمانا کہ "مذہب طلسم ہوشربا اور تخیلی فردوس کا نام نہیں ہے" سو اس کے جواب میں بجز اس کے کیا عرض کرسکتا ہوں کہ

چھائی جاتی ہے یہ دیکھو تو سراپا کس پر

میں، کہ سرے سے اس قسم کی فردوس و بہشت کا قائل ہی نہیں ہوں، کیونکر موردِ الزام قرار پاسکتا ہوں، یہ تو آپ اپنے انھیں برادرانِ مذہب سے کہئے جنھوں نے فردوس کو طلسم ہوشربا کیا، اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب چیز بناکر پیش کیا ہے۔ حالانکہ

دشتان مابین خلق و خُم

(۳) آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "مذاہب عالم کی خونریزی و خوں آشامی عین فطرت کے مطابق ہے، کیونکہ حق و باطل کی جنگ فطری قانون ہے" ——— یہ غالباً آپ نے صرف اس بات کو پیش نظر رکھ کر کہا ہے کہ آپ مسلمان ہیں۔ اور اسلام ہی سچا مذہب ہے ——— لیکن بندہ نواز، جس طرح آپ کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے، اسی طرح دوسرے مذاہب والے بھی کہہ سکتے ہیں۔ پھر اس کا فیصلہ کیونکر ہوکہ راستی پر کون ہے۔ ظاہر ہے کہ جب مختلف دعوؤں میں باہمدگر اختلاف و تضاد ہوگا تو ہم کو جانچنے کے لئے کوئی معیار قائم کرنا پڑے گا اور مذاہب

کے تناقض و نزاع کے باب میں یہ معیار صرف " عقل و فطرت " ہی ہو سکتا ہے۔ پھر غور کیجئے کہ اس وقت کون سا مذہب اس معیار پر ٹھیک اترتا ہے ؟ غالباً کوئی نہیں اور اس لئے لامحالہ تمام موجودہ مذاہب کو علیحدہ کر کے کوئی اور نئی صورت اختیار کرنا پڑے گی جو " مذہب انسانیت پرستی " کے علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتی

اسٹرنڈ برگ (Strindberg) کا ایک مشہور ڈرامہ ہے جس میں ایک عیسائی عورت کسی فوجی کپتان کو جو منکر خدا ہے مذہب کی طرف مائل کرتی ہے اور خدا کی محبت کی داستان سنانے لگتی ہے۔ کپتان سب کچھ سننے کے بعد کہتا ہے۔ "ٹھیک اسی وقت جب تم خدا اور اس کی محبت کا ذکر کرتی ہو، تمہاری آواز میں سختی پیدا ہو جاتی ہے اور تمہاری آنکھوں سے جذبۂ نفرت و انتقام ٹپکنے لگتا ہے، ایسا کیوں ہے ؟"

چنانچہ یہی وہ تلخ حقیقت تھی جس کی بنا پر اسے کہنا پڑا کہ

The world would be more religious place if all the religions were removed from it.

یعنی اگر آج دنیا سے تمام مذاہب محو ہو جائیں تو دنیا زیادہ مذہبی جگہ ہو جائے

Baron Von Hugel کا قول ہے کہ

Religion is an "Isness" and not an "Oughtness"

مذہب کا تعلق ہمیشہ " ہے " سے رہا ہے " چاہئے " سے نہیں۔ یعنی وہ اس سے بحث نہیں کرتا کہ حقیقت کیا ہے بلکہ صرف اسی کو صحیح سمجھتا ہے جو بظاہر اسے نظر آتا ہے ——— یعنی اگر وہ یہ سکھاتا ہے کہ آپس میں محبت رکھو، فتنہ و فساد سے علیحدہ رہو تو اس کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس عمل کو صرف ایک مخصوص حلقہ میں محدود رکھا جائے اور دوسرے مذہب والوں کو اس سے خارج سمجھا جائے، پھر ظاہر ہے کہ جب تمام مذاہب .... اس خیال کے حامی ہوں گے تو ان کا باہمدگر کشت و خون میں مبتلا ہو جانا یقینی ہے اور اس وقت تک جو خونریزیاں مذاہب کی طرف سے ظاہر ہو رہی ہیں ان کا سبب یہی ہے کہ ہر مذہب والا اپنی جگہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہے اور دوسرے کو باطل اور بقول ہمارے فاضل مراسلہ نگار کے حق و باطل میں جنگ ہونا بالکل فطری امر ہے

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ مذاہب عالم کا درس محبت بھی حد درجہ قاتل و خونریز درس ہے اور کسی کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ

Religion engenders a great love to a great hate.

(۴) آپ کا چوتھا دعوےٰ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی مذہب انسان سے انسان کو نفرت کرنے کا درس نہیں دے گا مگر جو شخص ننگ انسانیت ہو اُسے ضرور فنا کر دینا چاہتا ہے ——— اس دعوےٰ کا پہلا حصہ بالکل واقعہ و حقیقت کے خلاف ہے۔ کیونکہ ایک انسان نے دوسرے انسان سے نفرت کرنا، مذہب ہی سے سیکھا اور کافر و ملحد کی

اصطلاح میں اس کا کھلا ہوا ثبوت ہیں - کیا آپ بہ حیثیت مسلمان ہونے کے ہندؤں سے اس لئے متنفر نہیں ہیں کہ وہ رام وکرشن کے ماننے والے ہیں اور کیا ہندو آپ کو اس لئے ناپاک نہیں سمجھتے کہ آپ کا مذہب بُت شکنی سکھاتا ہو اور پھر ایک ہندو یا مسلمان ہی پر کیا موقوف ہے، گبر و ترسا، یہود و نصاریٰ، سبھی اس عذاب میں مبتلا ہیں اور ایک کا دوسرے سے نفرت کرنا مذہبی اختلاف ہی کی وجہ سے ہے

اب رہا یہ خیال کہ جو ننگ انسانیت ہو اس کو ضرور ہلاک کر دینا چاہئے، سو براہ کرم بتائیے کہ اس سے زیادہ انسانیت کی کیا توہین ہو سکتی ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے صرف اس لئے نفرت کرے کہ وہ اس کے مذہب کے شعائر کے خلاف خدا کی پرستش کرتا ہے - یعنی سوال خدا کی نافرمانی کا نہیں بلکہ صرف اس بات کا ہے کہ کیوں ایک مخصوص ومتعین طور پر اس کی پوجا نہیں کی جاتی

پھر جب حالت یہ ہے تو آپ ہی کے فیصلہ کے مطابق اس وقت تمام اہل مذاہب کو فنا کر دینا چاہئے، کیونکہ وہ سب کے سب ننگ انسانیت ہیں

(۵) آپ کا یہ فرمانا کہ ہندو مسلمانوں میں اتحاد ناممکن ہے جب تک ہندوستان کی تاریخ سے مسلمانوں والا باب بالکل نہ بدل دیا جائے - اچھی طرح سمجھ میں نہ آیا - اگر اس سے یہ مراد ہے کہ ہندو صرف اس لئے مسلمانوں کی طرف سے صاف دل نہیں ہو سکتے کہ وہ فاتحانہ حیثیت سے یہاں آئے اور بت شکنی کی، تو یہ ایک حد تک اصولاً درست ہے، لیکن میں یہ پوچھتا ہوں کہ اب جبکہ مسلمانوں میں اُن کے اسلاف کی کوئی خصوصیت باقی نہیں رہی، وہ کیوں اب تک "پندار فاتحانہ" میں مبتلا ہیں - اور وہ کیا چیز ہے جو ان میں ملک و وطن کی محبت پیدا ہونے نہیں دیتی - کیا ہندؤں کی طرح ہندوستان ان کا وطن نہیں ہے - اور کیا اب وہ یہاں سے نکل کر کسی اور مُلک میں فاتحانہ و ملوکانہ زندگی بسر کرنے کی توقع قائم کر سکتے ہیں —— پھر جب یہ نہیں ہے تو کب اُن کی سمجھ میں آئے گا کہ جب سوال اقلیت و اکثریت کا پیدا ہوتا ہے تو اقلیت کی کامیابی "کم" کے مقابلہ میں ہمیشہ "کیف" سے ہوا کرتی ہے - مگر سنی شیعہ کی نزاع، وہابی ومقلد کا جھگڑا کب انھیں یہ سمجھنے کی مہلت دیتا ہے —— انھیں اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مارنے سے کہاں فرصت ہے کہ وہ درخت کی طرف متوجہ ہوں

(۶) و (۷) رہ گئے آپ کے دو آخری حقائق کہ نگار کی تحریریں مُلک کے نوجوانوں کو گستاخ، گمراہ و بیکار بنا رہی ہیں اور خدا اس علم سے محفوظ رکھے جو شر اور گمراہی پھیلانے والا ہے - سو ان کے متعلق میں سوائے اس کے کیا کہہ سکتا ہوں کہ

من از آتش دخاں بینم تو آتش از دخاں بینی

نقطۂ نظر کا اختلاف ہے، کارگاہِ عمل کا اختلاف ہے، تعبیر و استنتاج کا اختلاف ہے - آپ جس چیز کو گستاخی سمجھتے ہیں وہ میرے نزدیک آزادیِ ضمیر ہے - جو ہر انسان کا فطری حق ہے اور جسے آپ گمراہی سمجھتے ہیں - میرے نزدیک وہی راہ

"کعبۂ مقصود" تک پہونچانے والی ہے
اگر میرا یہ مسلک کہ

میانِ کعبہ وبتخانہ راہے ست

واقعی فتنہ وفساد پھیلانے والا ہے تو میں صرف یہ عرض کروں گا

خدا گواہ اگر جرم ما ہمیں عشق ست
گناہِ گبر ومسلماں بہ جرم ما بخشند

امن وسکون کا درس دینے والے حضرات کا بھی حال مجھے معلوم ہے اور اُن علمبرداران مذہب کا بھی جو اپنے آپ کو "حاملانِ عرش" باور کرتے ہیں۔ اس لئے آپ کیوں مجھے اس بزم میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں جہاں بقول عراقی

"ہمہ یافتم دغائی"

کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ آہ

مرہم از لبہاش می جویند بر جانِ فگار
وائے بر ریشے کہ آن را از نمک مرہم کنند

ز۔خ (پٹیالہ) سے

۱۶ر فروری کو تحریر گرامی فردوس نظر ہوئی — لیکن حیران ہوں جواب کیونکر دوں۔ نگار میں اس کی اشاعت مناسب نہیں اور پتہ غیر معلوم !

اس صورت میں زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہوں کہ نگار کے ذریعہ سے اس کے پہونچ جانے کی اطلاع آپ کو دے دوں اور اس وقت کا منتظر رہوں جب مراسلت کے لئے آپ اپنے پتہ سے آگاہ فرمائیں۔ تاہم فی الحال اس قدر کہدینے میں کوئی حرج نہیں کہ

تو مپندار کہ ایں زمزمہ بے سازے ہست
گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

نیاز

انسان

پرافشاں سرمدی نغمے مرے بربط کے تاروں میں　　نشاطِ جاوداں میرے گلستاں کی بہاروں میں
مری منت کش احساس ہے آسائشِ گیتی　　ہواہیں تازگی ، رقصِ مسلسل آبشاروں میں
مری موجِ تبسّم ، جلوہ دیتی ہے گلستاں کو　　مری برقِ تجلّی ، مسکراتی ہے ستاروں میں
مرے ابرِ کرم سے زندگی ہے مستعار اس کی　　وہ موجِ رنگ محو رقص ہے جو لالہ زاروں میں
زمیں کیا، آسماں کیا، اور ان کی داستاں کیسی!!　　یہ میرا ذکر فطرت کر رہی ہے استعاروں میں
غلط کیا ہے ، جو خود بینی مرا آئین ہستی ہے　　کہ ہے خود حسنِ پنہاں بھی تو میرے بیقراروں میں
مری عظمت کو یہ خاکِ پریشاں کیا سمجھ سکتی!　　فلک پر بھی تو کوئی تھا نہ میرے رازداروں میں

امینِ سرِ پنہاں ، آرزوئے قلبِ دوراں ہوں
فرشتے جس کو سجدہ کر چکے ہیں، میں وہ انساں ہوں

اجل کیا ہے ، فضائے زندگی کا بے کراں ہونا　　خزاں، یعنی نئے جلووں سے نظمِ گلستاں ہونا
پہنچ سکتا نہیں دستِ حوادث ، میرے داماں تک　　سکونِ موج ہے، بیتاب رہنا، پرفشاں ہونا
بنی سرنامۂ تکمیل پروانوں کی بیتابی!　　نشاطِ روح ہے اس بزم میں آتش بجاں ہونا
مری تعمیر ہے کاشانۂ ہستی کی ویرانی　　سُبک روحی کا اک عنواں ہے میرا سرگراں ہونا
جھکا سکتی نہیں میری جبیں دنیا کی رعنائی　　کہاں میں اور کہاں سرگشتۂ سود و زیاں ہونا
ترا اک کھیل ہے جوشِ ہجومِ جہل و نادانی　　ابھی باقی ہے اسرارِ حقیقت کا عیاں ہونا
تباہی کے علم لہرا چکے پہنائے گیتی میں　　یہ موجِ ناتواں اب چاہتی ہے بیکراں ہونا

تغیر کے مناظر ذرّے ذرّے سے نمایاں ہیں
زمیں سے آسماں تک مستقل آثارِ طوفاں ہیں

ارادہ ہے کہ اسرارِ نہاں کو برملا کر دوں　　جہاں کو جاودانی عشرتوں سے آشنا کر دوں
سنواروں اک نئے انداز سے بکھری ہوئی زلفیں　　عروسِ دہر کے جلووں کو پھر صبر آزما کر دوں

بہت فرسودۂ ایام ہے ترتیب گیتی کی　　اب اجزائے کہن کو نذرِ سیلاب فنا کردوں
اُٹھاؤں پہلے طوفاں جس سے عالم خاک ہو جائے　　پھر اس طوفانِ بربادی کو جولان صبا کردوں
محبت عہد نو میں نامۂ ہستی کا عنواں ہو　　شبوں کو صبح کے مانند رنگیں ماجرا کردوں
ہر اک ذرے سے پھوٹیں سرمدی انداز کے چشمے　　فنا کے دام سے ابنائے گیتی کو رہا کردوں
مٹا کر تفرقے مزدوری و سرمایہ داری کے　　علم حریتِ کامل کے دُنیا میں بپا کردوں

رگِ افسردۂ ہستی میں روحِ بے قرار آئے
گلوں کی طرح ذرے مسکرائیں وہ بہار آئے

علی اختر (اختر)

مجموعۂ استفسار وجواب

ایکہزار صفحات کا گنجینۂ علم و ادب طیار ہو رہا ہے اور اعلان کیا گیا تھا کہ عہ جسکی قیمت پیشگی آجائے گی اس کو یہ مجموعہ اسی قیمت میں دیدیا جائے گا- چونکہ اعلان کی میعاد ختم ہوگئی ہے اس لئے اب کوئی صاحب عہ بھیجکر اپنا نام درج نہ کرائیں

طیاری کے بعد جو قیمت مقرر ہوگی، اس سے ایکروپیہ کم پر حسب معمول خریداران نگار کی خدمت میں یہ مجموعہ پیش کیا جائے گا- کم از کم پانچروپیہ قیمت کا اندازہ کیا جاتا ہے

منیجر نگار لکھنؤ

خوابستانِ محبت

کیطرف

بس ایک بار ——— خدا کے لئے وہیں لے چل!

جہاں خلش کو سکونِ عظیم کہتے ہیں
جہاں سراب کو موجِ شمیم کہتے ہیں
جہاں، نگاہ کو برقِ کلیم کہتے ہیں

بس ایک بار ——— خدا کے لئے وہیں لے چل!

وہ شہر جس کی زمیں آسماں کا دل چھینے!!
ہر ایک راہ گذر — کہکشاں کا دل چھینے!
فضا، جہاں کی بہار جناں کا دل چھینے!

بس ایک بار ——— خدا کے لئے وہیں لے چل!

وہ صبح — آہ، وہ ناظورۂ نشاط فروش
وہ شام — آہ، وہ لیلائے میکدہ بردوش
وہ شہر — آہ وہ فردوسِ زارِ نوشا نوش

بس ایک بار خدا کے لئے ——— وہیں لے چل!

وہ نذر گاہِ تمنا — وہ آستانِ مراد
ہے ذرہ ذرہ جہاں — خضرِ کاروانِ مراد
جہاں کی خاک بھی ہے نقشِ گلفشانِ مراد

بس ایک بار — خدا کے لئے — وہیں لے چل!

جہاں "شباب" کو آئینہ دارِ نور کہیں!
جہاں — "شراب" کو نوبادۂ طہور کہیں!
جہاں — "خمار" کو تقدیسِ چشمِ حور کہیں!

بس ایک بار ——— خدا کے لئے وہیں لے چل!

جہاں — نشاط کو اندیشۂ مآل نہیں!!
جہاں — خوشی کبھی شرمندۂ زوال نہیں!
جہاں — حنائے کفِ پا بھی پائمال نہیں!

بس ایک بار ——— خدا کے لئے ——— وہیں لے چل!

جہاں رواں ہیں شرابِ طہور کے چشمے
نشاطِ قدس کے دریا — سرور کے چشمے
جہاں ہیں رقص میں صہبائے نور کے چشمے

بس ایک بار — خدا کے لئے — وہیں لے چل!

وہ ارضِ قدس، جہاں پر فنا کا نام نہیں
جہاں طرب کے لئے غم کا التزام نہیں
جہاں کی شمع کو افسردگی سے کام نہیں

بس ایک بار — خدا کے لئے — وہیں لے چل!

سواد جس کا نمودِ وفائے لیلیٰ ہے
ہر ایک ذرہ جہاں کا دلِ زلیخا ہے
جہاں روشؔ نے محبت کا خواب دیکھا ہے

بس ایک بار خدا کے لئے وہیں لے چل!

روشؔ (صدیقی)

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شائع ہوتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا

سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سے)

بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۵	فہرست مضامین جون سنہ ۱۹۳۴ء	شمارہ ۶

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

شمار ۶	جون سنہ ۳۴ء	جلد ۲۵

ملاحظات

خدا نے دنیا کو کیوں پیدا کیا

یہ ایک سوال ہے جو ایک ہندو سوسائٹی نے مجھ سے کیا ہے ؟

یہ سوال خالص مذہبی ہے، یعنی یہ جستجو اسی شخص میں پیدا ہو سکتی ہے جو خدا کے وجود کا قایل ہے اور ایشور کا پایا جانا تسلیم کر چکا ہے، لیکن جو منکرِ خدا ہے وہ کون اور کس نے سے گفتگو نہیں کرتا، بلکہ اس کی تلاش یہ ہوتی ہے کہ یہ عالم کیونکر ظہور میں آیا۔ اور اس کے اندر انسان کی حیثیت کیا ہے ؟

ایک پابندِ مذہب انسان چونکہ خدا کو بالکل اسی طرح کا صناع و خلاق مانتا ہے جس طرح ایک کمہار یا بڑھئی کہ جو برتن اسکے جی میں آیا بنا دیا، جسطرح کی چوکی چاہی اسنے طیار کر دی، اسلئے اصولاً اس کے سامنے کیونکر کا سوال نہیں آسکتا، کیونکہ ایک قادرِ مطلق اور مختارِ کل ہستی کو ہر وقت قدرت و اختیار حاصل ہے کہ جب چاہے، بغیر کسی ذریعہ و سبب کے اپنے ارادہ سے ہیزدہ ہزار عالم پیدا کر دے اور جب اس کے جی میں آئے آناً فاناً محو کر دے۔ لیکن ایک منکر چونکہ دنیا کی پیدایش کو کسی ہستی کے ارادہ سے

تعلق نہیں سمجھتا بلکہ اس کو مخصوص اسباب سے وابستہ جانتا ہے اور تدریجی ارتقاء کا قایل ہے اس لئے لامحالہ اُسے غور کرنا چاہئے کہ اصولِ آفرینش کیا ہیں اور کن اسباب کے ماتحت کائنات نے موجودہ شکل اختیار کی ہے

بہر حال اس باب میں ایک مذہبی انسان کا نقطۂ نظر، منکر کے نقطۂ نظر سے بالکل علٰحدہ ہے اور اس لئے اگر سند رجۂ عنوان سوال دونوں کے سامنے پیش کیا جائے تو ظاہر ہے کہ دونوں کا جواب بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہوگا۔ لیکن گفتگو اس میں ہے کہ کیا واقعی دونوں اس سوال کا جواب دینے کے اہل ہیں۔ ایک مذہبی شخص جو پیدائش عالم کے لئے کسی علت وسبب کے وجود کو ضروری نہیں سمجھتا وہ نتیجہ وغایت پر غور کرنے کا مستحق کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے۔ یعنی جب اس نے یہ تسلیم کر لیا کہ خدا قادر مطلق ہے، اس سے کوئی سوال نہیں کیا جا سکتا، وہ جو چاہے پیدا کر دے اور جب چاہے فنا کر دے، تو پھر کیوں کا سوال کیسا، یہ "چون وچرا" تو اسباب وعلل سے متعلق ہوا کرتا ہے اور جب وہاں سرے سے اسی کا انکار کیا جاتا ہے تو استفسار کیوں؟۔ البتہ ایک منکر کے متعلق خیال ہو سکتا ہے کہ اس نے اس پر غور کیا ہوگا، لیکن اگر انصاف سے پوچھئے تو یہ کہنا پڑے گا "کیوں" کا جواب نہ خدا کا اقرار کرنے والا دے سکتا ہے نہ انکار کرنے والا، کیونکہ جس طرح مذہب آجتک غایتِ آفرینش کو نہیں سمجھ سکا، اسی طرح سائنس بھی اس معمہ کو حل نہیں کر سکی، یعنی اگر ایک پابند مذہب شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ کائنات کے پیدا کرنے سے خدا کا کیا مقصود ہے تو بڑے سے بڑا سائنس داں بھی نہیں کہ سکتا کہ مادۂ و قوت کے اس ہیجان کا نتیجہ کیا ہونا ہے۔ لیکن کس قدر حیرتناک امر ہے کہ باوجود اس نااہلی کے دونوں اس کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اصرار کرتا ہے کہ وہی حق پر ہے، درانحالیکہ ان میں سے کسی کے پاس کوئی ادنیٰ دلیل بھی اس دعوے کے لئے موجود نہیں —— اہل مذاہب میں ایک جماعت تو علماء ظواہر کی ہے جو اپنے آپ کو مخصوص شریعت کا پابند کہتے ہیں اور جو مذہب کو صرف اُن کتابوں سے سمجھنا چاہتے ہیں جو ان کے اسلاف لکھ گئے ہیں اور جن کی بناء پر سوسائٹی کا.... نظام مقرر کیا گیا تھا، دوسری جماعت اہل تصوف کی ہے جنھوں نے اپنے مسلک کا نام شریعت نہیں بلکہ طریقت رکھا ہے اور جو تمام مسایل کو روحانیت سے سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں —— مسلمانوں میں اوّل الذکر جماعت کے پاس اس سوال کا کھلا ہوا جواب موجود ہے اور اُن کو زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ قرآن نے کھلے ہوئے الفاظ میں اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا ہے کہ "ماخلقت الانس والجن الا لیعبدون" یعنی ہم نے انسان و جنات کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ عبادت کریں۔ اس لئے اگر آج عبادت کی کیفیت وہیئت متعین ہو جائے تو ایک مسلمان کے پاس اس سوال کا جواب دینا مشکل نہیں —— عام طور پر عبادت کا مفہوم نہ صرف اسلام بلکہ تمام دیگر مذاہب میں وہی ہے جسے پوجا یا پرستش سے ظاہر کیا جاتا ہے؛ لیکن چونکہ دنیا میں کوئی فعل ارادہ ونتیجہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا، اس لئے ہر شخص کا (خواہ وہ کسی مذہب سے متعلق ہو) فطری حق ہے کہ وہ ان دونوں باتوں پر غور کرے۔ یعنی ایک یہ کہ وہ کس ارادہ ونیت سے خدا کی پوجا کرتا ہے اور دوسرے یہ کہ جو غرض وغایت اس نے

سمجھ رکھی ہے وہ عبادت سے کس حد تک پوری ہوتی ہے ــــــــ مذہبی اقوام میں بلا استثنا کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو اس ارادہ و نیت سے عبادت نہ کرتی ہو کہ اس سے خدا خوش ہوگا اور وہ ہماری مشکلات کو دور کرے گا، پھر اگر واقعی کبھی کسی کے مصائب دور ہو جاتے ہیں تو وہ اسکو اسی عبادت کا نتیجہ خیال کرتا ہے اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ اپنے آپ پر الزام قائم کرتا ہے کہ جو حق عبادت کرنے کا تھا وہ ادا نہ ہوا اور خدا کی خوشنودی حاصل نہ ہو سکی ــــــ اس میں کلام نہیں کہ جس حد تک انسان کے جذبات و تاثرات کا تعلق ہے اس خیال سے اس کو کافی تسکین ہو جاتی ہے اور وہ مایوسی کا مقابلہ آسانی سے کر سکتا ہے، لیکن جب جذبات کی دنیا سے علیحدہ ہو کر سوال صرف علمی تحقیق کا ہوتا ہے یا کسی ایسے شخص کی تسکین کا ہوتا ہے جو کسی معلول کا وجود بغیر علت کے ماننے کے لئے طیار نہیں، تو لامحالہ غور کرنا پڑتا ہے کہ عبادت سے خدا کا خوش ہونا کیا معنی رکھ سکتا ہے۔ اور خدا کی خوشی یا رضامندی کا ہمارے دُنیاوی حالات و اسباب سے کیا تعلق ہے ــــــ اس سلسلہ میں سب سے پہلے "حقیقتِ خدا" کا مسئلہ آتا ہے یعنی یہ کہ جب تک ہم کو پہلے یہ نہ معلوم ہو جائے کہ خدا کیا ہے، اسکے وجود کی حقیقت کیا ہے، اس وقت تک نہ ہم عبادت کی کوئی علمی توجیہہ کر سکتے ہیں اور نہ اس سے کسی نتیجہ کے پیدا ہونے پر حکم لگا سکتے ہیں ــــــ خدا کے متعلق انسان کا اولین تصور بالکل وہی ہے جو دنیا کے کسی مستبد بادشاہ و حکمران کے متعلق ہو سکتا ہے یعنی خوشامد و تملق سے خوش ہونا، تحائف و نذرانہ قبول کر کے نظر التفات صرف کرنا، اور سرتابی و نافرمانی سے غضب آلود ہو کر سزائیں دینا، اس میں شک نہیں کہ رفتہ رفتہ نفس خدا کی ماہیت و حقیقت پر بعض مذاہب کے خیالات زیادہ بلند و لطیف ہو گئے ہیں، لیکن جس حد تک پرستش کا تعلق ہے، خدا کی ہستی اب بھی وہی خوش یا ناخوش ہو جانے والی بتائی جاتی ہے اور اپنے بندوں کو سزا یا انعام دینے سے بدستور وہی دلچسپی اس کو باقی ہے

ایک طرف تو یہ بتایا جاتا ہے کہ خدا زمان و مکان سے علیحدہ، احساس و تاثیر سے بیگانہ، اور بے نیاز مطلق ہے، اور دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ برہمی و خوشنودی کا محل ہے۔ اور انعام و انتقام کا جذبہ اسکے اندر پایا جاتا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایک ہی وقت میں خدا کو دو متضاد صفات کے ساتھ متصف کرنا کیونکر ممکن ہے۔ اور اس کی خوشنودی یا برہمی کیا معنی رکھ سکتی ہے، جبکہ وہ خود نہ کسی چیز سے متاثر ہوتا ہے اور نہ اُسے پوجا یا پرستش کی ضرورت ہے ــــــ بعض اہل مذاہب کہتے ہیں کہ عبادت سے خدا کو خوش کرنے کا مفہوم صرف یہ ہے کہ خود عبادت کرنیوالا اس سے فائدہ اٹھائے، یعنی خدا کی پرستش کا مقصود خود اپنی اصلاح ہے۔ بالکل درست لیکن یہاں یہ امر غور طلب ہے کہ عبادت سے جو اپنی اصلاح وابستہ ہے وہ ہمارے اعمال و افعال سے بھی کوئی تعلق رکھتی ہے یا نہیں، یعنی محض ہمارا عبادت کر لینا کافی ہے یا اسی کے ساتھ اپنی زندگی میں بھی تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے ؟

ظاہر ہے کہ محض عبادت خواہ وہ کسی صورت میں ہو بیکار ہے اگر وہ ہمارے اخلاق و اعمال پر اثر انداز نہیں ہوتی اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ عبادت کا مدعا اپنے اندر تبدیلی پیدا کرنا ہے اور اسی کو خدا کی خوشنودی سے تعبیر کیا گیا تاکہ لوگوں کو اس طرف توجہ ہو اور وہ اسے ترک نہ کر بیٹھیں ــــــ بظاہر یہ بیان بہت قرین عقل و صواب معلوم ہوتا ہے لیکن اگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا۔ کہ انسان کی گمراہی و شقاوت کا بڑا سبب یہی ہے ــــــ چونکہ اہل مذاہب نے ہمیشہ یہی لوگوں کو سمجھایا کہ خدا

عبادت سے خوش ہوتا ہے اور خدا کی خوشنودی ہی حاصل کرنا عین مدعا ہے، اس لئے یہ بات کبھی اُن کے ذہن میں نہ آئی کہ عبادت کا تعلق خود اپنی اصلاح اعمال سے ہے اور اگر ہم اپنی زندگی میں کوئی تغیر نہ پیدا کریں تو عبادت بیکار ہے ـــــ اس کا نتیجہ ایک طرف تو یہ ہوا کہ عبادت نام قرار دیا گیا صرف چند مخصوص حرکات و مراسم کا۔ اور دوسری طرف لوگوں کے اخلاق پر یہ خراب اثر پڑا کہ خدا کو عبادت سے خوش رکھنے کے اعتماد پر وہ دنیاوی معاملات میں ہر قسم کی بے عنوانی پر آمادہ ہو گئے اور اخوت و ہمدردی کا جذبہ جو نظام تمدن کی جان ہے ان کے اندر ضعیف ہونے لگا

اگر ابتدا ہی سے اس امر پر زور دیا جاتا کہ خدا تمھاری عبادت سے خوش نہیں ہوتا بلکہ تمھاری اصلاح و ترقی سے خوش ہوتا ہے اور عبادت کا مدعا بھی یہی ہے تو شاید دنیا کی حالت آج دوسری ہوتی ـــــ ہر چند بعض مذاہب نے عبادت کی ماہیت و غایت بیان کرتے ہوئے اس حقیقت کا اعلان بار بار کیا ہے، لیکن چونکہ عبادت پرستش میں حیات بعد الموت کی راحت کا خیال بھی شامل کر دیا گیا ہے اس لئے اس دنیاوی زندگی میں اس کا نتیجہ خاطر خواہ برآمد نہیں ہوتا اور عام طور پر لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اصل زندگی تو مرنے کے بعد ہی شروع ہوگی اور چونکہ اسکے متعلق عبادت کے بعد اطمینان ہو ہی گیا ہے اس لئے اس دو روزہ زندگی کی اصلاح میں کیا سر کھپایا جائے ـــــ میری رائے میں مذاہب کی سب سے زیادہ خطرناک تعلیم یہی ہے کہ دنیا فانی ہے، انسان فانی ہے اور بقا اس زندگی کو حاصل ہے جو مرنے کے بعد شروع ہوگی اور اسی کو سنوارنے کی ضرورت ہے۔ گویا انسانوں کا یہ اجتماع سرائے کے مسافروں کا اجتماع ہے جسے صبح یا شام منتشر ہو جانا ہے، پھر ظاہر ہے کہ جب تعلیم یہ ہوگی تو باہم کر کیا ہمدردی پیدا ہو سکتی ہے اور دنیاوی زندگی کی ترقی و اصلاح کے لئے کون سا جذبہ کام کر سکتا ہے ـــــ مسلمانوں میں نماز کا طریق عبادت اس میں شک نہیں کہ بڑی حد تک اجتماعی کیفیت لئے ہوئے ہے، لیکن چونکہ وہاں بھی وہی آخرت و معاد کا خیال ساتھ ساتھ ہوتا ہے، اس لئے اگر مسلمان یکجا جمع ہوتے ہیں تو صرف انفرادی طور پر اپنی اپنی عاقبت سنوارنے کے لئے اور اجتماعی زندگی کی اصلاح و ترقی کا کوئی سوال ان کے سامنے نہیں ہوتا ـــــ چنانچہ آپ کسی بڑی سی بڑی مسجد کا اجتماع جا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ بہت سے جانور کسی احاطہ کے اندر جمع کر دیے گئے ہیں۔ اور ایک ہی صف میں پاس پاس بیٹھنے والوں کو بھی ایک دوسرے کے درد دُکھ کی خبر نہیں ہے ـــــ اگر مسجدوں کا یہ اجتماع بجائے روزانہ پانچ مرتبہ کے ہفتہ میں صرف ایک ہی بار ہو اور سجدہ و رکوع کی جگہ وہ آپس میں بیٹھ کر تبادلۂ خیال کریں، اور اپنے اپنے محلہ کے بچوں کی تعلیم، بیواؤں کی پرورش، ضعیفوں اور بیماروں کی نگرانی مفلسوں اور ناداروں کی امداد، جماعتی تنظیم، اقتصادی مشکلات، اور سیاسی مسایل پر گفتگو کر کے لائحۂ عمل بھی طیا کرتے رہیں تو کتنا عظیم فائدہ مترتب ہو سکتا ہے ـــــ ایک وقت تھا کہ مسلمانوں کی مسجدیں ان کے دار الاجتماع تھے، جہاں قوم کے تمام معاملات پر گفتگو ہوتی تھی، لیکن آج مولوی کہتا ہے کہ مسجد میں بیٹھ کر کوئی بات دنیا کی نہ کرو۔ یعنی صرف اُس دنیا کی بات کرو جس کا علم تمھیں تو نہیں ہے لیکن اُس مولوی کو ضرور ہے جو خدا کے "خلوتیان راز" میں سے ہے اور جس کے ہاتھ میں ہے خواہ تم کو جہنم میں ڈال دے یا فردوس بریں میں بھیجدے ـــــ علماء ظواہر کے مفہوم عبادت نے جو مذموم صورت اختیار کی اس کا حال

تو آپ کو اس بیان سے واضح ہو گیا ہو گا، اب رہ گئے اہل باطن جو بجائے شریعت کے طریقت پر کاربند ہیں، سو اس میں شک نہیں کہ جس حد تک خدا کے تصور کا تعلق تھا وہ زیادہ کامیاب ثابت ہوئے اور انھوں نے عقیدۂ "ہمہ اوست" سے "خدا" کی تعبیر بڑی حد تک قابل قبول صورت میں پیش کی، لیکن عبادت کے مسئلہ کو وہ بھی نہ حل کر سکے اور چونکہ معاد و آخرت کی زندگی اُن کے یہاں بھی اصل چیز تھی اس لئے باوجود گانے بجانے کا شوق رکھنے کے بھی وہ عبادت کے مسئلہ میں علماء ظواہر کی پابندیوں سے علٰحدہ نہ ہو سکے اور شریعت کے مقابلہ میں اُنکی طریقت اپنا کوئی مستقل ادارہ جداگانہ قائم نہ کر سکی ——— الغرض مسلمانوں کی طرف سے اس سوال کا یہ جواب دینا کہ خدا نے انس و جن کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ اس کی عبادت کریں، عام متبادر معنی کے لحاظ سے نوع انسانی کے لئے مفید ثابت نہیں ہوا ——— دنیا میں ترقی یافتہ مذاہب دو طرح کے ہیں، ایک وہ جنھوں نے زندگی یا مذہب کا کوئی فلسفہ پیش کیا اور دوسرے وہ جنھوں نے صرف عملی زندگی کو سامنے رکھ کر چند اصول سوسائٹی کے مرتب کرنے پر اکتفا کی ہر چند اول الذکر مذاہب کی تعلیم کا بھی حقیقی مقصود وہی سوسائٹی کی اصلاح تھا لیکن جس طرح براہ راست عملی زندگی کا درس دینے والے مذاہب حیات بعد الموت کے قایل ہو کر مراسم و شعائر میں الجھ کر رہ گئے، اسی طرح فلسفہ پیش کرنے والے مذاہب بھی نفسیاتی گتھیوں کے سلجھانے میں محو ہو کر ایسے دُور از کار قیاسات میں مبتلا ہو گئے کہ سوسائٹی کا مفاد نظر انداز ہو گیا اور ان کی فلسفیانہ عقل آرائیاں، مادی حقیقتوں سے فائدہ اٹھانے کا کوئی لائحۂ عمل بنی نوع انسان کے سامنے پیش نہ کر سکیں ——— اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے کہ مذہب کا تعلق کسی قومی عروج و ارتقاء سے نہیں ہے جس کیلئے تیغ و تفنگ کا جارحانہ یا مدافعانہ استعمال ضروری ہو بلکہ صرف فلسفۂ حیات پر غور کرنے اور خاموشی سے رموزِ زندگی حل کرنے سے ہے' تو بتائے کہ ہندوؤں کے فلسفۂ 'ویدانت' 'نروان' 'اہمسا' اور 'مکتی' نے دنیا کو کیا فائدہ پہونچایا۔ یعنی اگر تلوار ہاتھ میں لیکر دنیاوی جاہ و حشم کو اپنے لئے مخصوص کر لینے سے دنیا کو نقصان پہونچا تو بودھ کی طرح کاسۂ گدائی لیکر در در کی بھیک مانگنے سے نوع انسانی کو کیا نجات حاصل ہوئی ——— اگر کسی قوم نے اُسے تلوار سے مجروح کیا تو دوسری نے اُسے اپاہج بنایا، اگر ایک نے نفس پرستی و خود غرضی کو رواج دیا تو دوسری نے نفس مدعا و غرض مشترک کو محو کر کے انسانی عزائم کو سرد کر دینے میں کوئی دقیقہ کوشش کا نہ اٹھا رکھا ——— الغرض نوع انسانی کو نہ ان مذاہب سے کوئی فائدہ پہونچا جو یکسر عمل ہونے کے مدعی ہیں اور نہ اُن مذاہب سے جو صرف فلسفہ پیش کرنا منتہائے نظر سمجھتے ہیں ——— غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بڑا سبب مسئلہ "روحانیت" یا "مابعد الطبیعیت" ہے جس نے انسان کی دنیاوی زندگی کو بالکل پس پشت ڈالدیا اور حقیقی زندگی کو اس عالم سے متعلق ہی نہ رکھا۔ اگر یہاں کی زندگی کو اہمیت دی جاتی تو اس کی اصلاح کی طرف توجہ بھی کی جاتی لیکن چونکہ بلا استثنا، تمام مذاہب نے مادی حیات کی تخفیف کی اور اسکو ناقابل اعتنا سمجھا، اس لئے اصولاً کوئی مذہب دنیاوی لحاظ سے کامیاب نہ ہوا اور انسان کے نفسیاتی میلان نے جو ہنگامہ یہاں برپا کر رکھا ہے اس کا کوئی علاج کسی کی سمجھ میں نہ آیا

یہی تلخ تجربہ تھا جس نے دنیا میں مادہ پرست جماعت پیدا کر دی اور دُنیا کو دنیا کے اصول سے سمجھنے اور کاربند ہونے پر مجبور کر دیا ——— پھر ہر چند ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مادئین نے جو کچھ سمجھا وہ بالکل درست ہے یا اُن کے مقرر کئے ہوئے اصول

دنیا کے امن و نجات کے ضامن ہو سکتے ہیں، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کا مقصود بالکل برمحل ہے اور قضیۂ زمیں برسر زمین کے اصول پر کاربند ہونے سے وہ انسانی دماغ کی بہت سی تشویشوں کو دور کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اُن کے سامنے نہ ایسے خدا کا سوال ہے جس نے قادر مطلق اور فعال لما یرید ہونے کی حیثیت سے انسان کو دنیا میں عضو بیکار بنا رکھا ہے اور نہ وہ اپنا وقت اس مسئلہ پر غور کرنے میں ضائع کرتے ہیں کہ دنیا کیوں پیدا کی گئی ——— وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ دنیا پیدا ہو چکی ہے، اور اسی میں ہم کو زندگی بسر کرنا ہے، اس کے بعد کچھ نہیں ہے اس لئے ہمکو ہر ممکن کوشش کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ اور ترقی کی جتنی راہیں ہیں ان پر چل کر دنیا کو اپنے لئے جنت بنا لینا چاہئے

اس میں شک نہیں کہ یہ مادی تحریک اخلاق کی ضامن نہیں ہے، اور اس سے خود غرضی کا جذبہ قوی ہو کر ایک قوم کا دوسری قوم کو ہلاک کر دینا مستبعد نہیں، لیکن اگر صرف اسی دلیل پر اس تحریک کو رد کر دیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ مذہب کی حمایت کی جائے جبکہ اس نے بھی یہی کیا اور اس کے ہاتھ بھی ہمیشہ خون سے رنگین نظر آئے۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ ایک نے خدا کا نام لیکر تلوار اٹھائی اور دوسرا خدا کو بدنام نہیں کرتا اور اپنی ہی اغراض کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہے

علاوہ اس کے ایک مسئلہ اور اس جگہ قابل غور ہے، وہ یہ کہ مادیین کا مذہب ہنوز ارتقا کی حالت میں ہے اور بالکل ممکن ہے کہ آئندہ کوئی صورت ایسی پیش آئے کہ انسان خونریزی سے باز رہنے پر مجبور ہو جائے ——— بہ حالت موجودہ نظام تمدن نے جو ہمیشہ مادی ترقی پر قایم ہے، وسیع ہو کر ایسی عجیب و غریب صورت اختیار کر لی ہے کہ آہستہ آہستہ تمام قومیں، تمام جماعتیں بلکہ جملہ افراد ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے جاتے ہیں، یعنی اغراض کی تکمیل روز بروز باہمی تعاون پر منحصر ہوتی جا رہی ہے، پھر کیا یہ امر خلاف عقل ہے کہ ایک وقت ایسا آئے جب باہمی تصادم کی تمام صورتیں مسدود ہو جائیں اور تمام نوع انسانی ایک نظام سے وابستہ ہو کر ایک قوم، ایک جماعت، ایک ہیئت اور ایک تشکیل میں بدل جائیں یہانتک باہمی جنگ و خونریزی کا امکان ہی باقی نہ رہے ——— اس وقت جس چیز نے دنیا میں ہنگامہ برپا کر رکھا ہے وہ سرمایہ داری اور اشتراکیت کی جنگ ہے، یعنی دنیا اب اس کو برداشت نہیں کر سکتی کہ انسان انسان میں تفریق صرف اس بنا پر قایم ہے کہ ایک کے پاس دولت کا انبار ہے اور دوسرا اس سے محروم ہے۔ دولت انسان ہی کی پیدا کی ہوئی ایک مفروضہ قوت ہے جس سے اسوقت تک کام لیا جا سکتا ہے، جب تک سب یکساں طور پر اس سے مستفید ہوتے رہیں، لیکن اگر یہ مساوات مفقود ہو جائے اور دولت انسانیت کو پامال کرنے میں صرف ہونے لگے تو اس کو مٹ جانا چاہئے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اس وقت یورپ کا ہر ملک اس جذبہ سے متاثر ہو رہا ہے اور تمام وہ حکومتیں جو سرمایہ دارانہ استبداد و استثمار پر قائم تھیں ایک ایک کرکے اشتراکی اصول پر کاربند ہونے کے لئے مجبور ہو رہی ہیں پھر اگر ساری دنیا میں اشتراکیت پھیل جائے اور دولتمندی و افلاس کا مفہوم ہی بالکل بدل جائے تو کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس وقت بھی ایک انسان . . . . دوسرے انسان سے اور ایک جماعت دوسری جماعت سے برسرپیکار ہوگی ؟ ہرگز نہیں - کیونکہ سارا اختلاف تو اسی وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ

فلاں سرمایہ دار ہے اور فلاں تہی دست لیکن اگر یہ اختلاف مٹ کر تمام انسان ایک سطح پر آجائیں تو مخالفت کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی اور دنیا اس امن و سکون کو حاصل کر سکتی ہے جسے مذاہب عالم اس وقت تک حاصل نہیں کر سکے

اس لئے بہ حالات موجودہ ہمارا یہ سوچنا کہ خدا نے کائنات کو کیوں پیدا کیا، حد درجہ تضیع اوقات ہے، سوچنے کی بات صرف یہ ہے کہ جب ہم اس دنیا میں آگئے ہیں تو ہم کو زندگی کیونکر بسر کرنا چاہئے اور اپنا وقت کس طرح صرف کرنا چاہئے خدا کی حقیقت کیا ہے، دنیا سے اس کا کیا تعلق ہے، اس تعلق کی بنا پر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اور کیا نہیں، یہ سب ایسے دُور از کار سوالات ہیں کہ نہ اس وقت تک ان کا کوئی شافی جواب دیا جا چکا ہے اور نہ آیندہ ممکن ہے —— انسان واقعات و حوادث کا بندہ ہے، اسباب و علل کی دنیا میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے، اس لئے اُسے انھیں باتوں پر غور کرنا چاہئے جن سے اُس کی زندگی متعلق ہے —— اگر خدا دنیا میں آکر ہمارے کاموں میں ہمارا ہاتھ نہیں بٹاتا تو ہم کو کیا حق حاصل ہے کہ اس کے متعلق گفتگو کر کے اپنا وقت ضائع کرتے رہیں، اگر اُس نے "کُن" کہہ کر دفعتہً عالم کو پیدا کر دیا تو کیا اور تدریجی ارتقا کے ساتھ عالم کو سنوارا تو کیا —— انسان کے درد دُکھ کا علاج ان میں سے کسی اعتقاد سے متعلق نہیں —— پھانس اگر چبھی ہے تو اس کی تکلیف اس کے نکالنے ہی سے دُور ہو سکتی ہے نہ کہ اس بات پر غور کرنے سے کہ پھانس کی حقیقت کیا ہے اور وہ کیونکر گوشت کے اندر پہونچ گئی

—— گھر میں جس وقت آگ لگتی ہے تو اس کا سبب دریافت کرنے سے پہلے اس کے بجھانے کی فکر ہوتی ہے

اس لئے وہ لوگ جو حقیقی معنی میں نوع انسانی کے خیر خواہ ہیں، ان کو نہ خدا کی حقیقت پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور نہ یہ سوچنے کی کہ اس نے دنیا کو کیوں پیدا کیا، بلکہ صرف ان تدابیر پر غور کرنے کی کہ تمام انسان باہم مل کر صلح و آشتی کی زندگی کیونکر بسر کر سکتے ہیں

مذاہب عالم تو اس تجربہ میں ناکام رہے، اس لئے لامحالہ ہمیں اُن سے ہٹ کر کوئی دوسری راہ اختیار کرنا پڑے گی، خواہ وہ اشتراکیت ہو یا کچھ اور —— پھر اب دیکھنے کی بات صرف یہ ہے کہ زمانہ کا رُخ کیا ہے، سیلاب کا بہاؤ کس طرف ہے۔ اگر ہم نے اس کا ساتھ دیا تو بیشک ہم کو نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ ورنہ خس و خاشاک کی طرح بہ جانا یقینی ہے اور مذاہب کا تنکا ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتا ——

فلسفہ کی تعلیم اور اس کی اہمیت

فلسفہ ؟ وہی تجریدات کا گورکھ دھندہ ؟ وہی لم ولانسلم کا دعویٰ ؟ وہی اثیری تخیلات جو منت کش معنی نہیں ؟ الجھن شاید سب ہی کو پیدا ہوتی ہے کہ آخر فلسفہ صرف بحث ومباحثہ ہی کا نام ہے جہاں بحث صرف بحث ہی کی خاطر کیجاتی ہے یا اس بحث کا کوئی موضوع بھی ہوتا ہے جو واضح، صریح، متعین ہو ؟ سب جانتے ہیں کہ علم ہیئت میں اجرام سماوی سے بحث کی جاتی ہے تو ارضیات میں زمین اور چٹانوں سے، نفسیات کا موضوع ذہن یا نفس ہے جہاں احساس ارادہ اور عقل کی ماہیت پر غور کیا جاتا ہے، خودرا بشناس کے حکیمانہ ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ہم پوچھتے ہیں کہ جذبات کا زور مرد افگن کیوں ہوتا ہے، عقل ان کے شر وشور پر کہاں تک غالب ہو سکتی ہے، شعور کے کیا معنی ہیں، تسلسل ذات سے کیا مراد وغیرہ وغیرہ۔ بہر حال یہ تمام علوم واقعات کے ایک متعین دائرہ سے بحث کرتے ہیں، یہ واقعات نہایت اہم ودلچسپ ہیں، علمی وعملی لحاظ سے ان کا فائدہ مسلم ہے۔ لیکن فلسفہ میں کس چیز سے بحث ہوتی ہے، اس کا مبحوث عنہ کیا ہے ؟ استدلالیوں کی یہ چناں وچنیں، یہ لم ونسلم آخر کس چیز کے متعلق ہے ؟ کیا ہم نے نہیں سنا کہ

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود؟

سوال بالکل جائز ہے اور ہمیں ابتدا ہی میں اس کے جواب کی کوشش کرنا ضروری ہے۔ آپ سچ بتلائیے کہ آپ میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو زمین اور چٹانوں، اجرام سماوی اور اعمال ذہنی اور دوسرے مخصوص ومتعین حالات کے مطالعہ سے کبھی نہ کبھی بیزار یا پریشان نہ ہو گیا ہو اور یہ کہتے ہوئے کہ ع صد کتاب وصد ورق در نار کن - یہ نہ پوچھا ہو کہ آخر یہ سب کچھ کاہے کے لئے ؟

اس جھگڑے کا انجام ؟ اس کی قدر وقیمت ؟ اس کے معنی ومقصود ؟ پس فائدہ درجہاں بیفائدہ چیست ؟ جب آپ اس محدود دنیا کے مخصوص ومتعین واقعات سے پریشان ہو کر خود دنیا کے معنی ومقصود، اس کی قدر وقیمت و اہمیت اور فرد وعالم کے تعلق کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو آپ اسی بدعت کے مرتکب ہوتے ہیں جس کے ارتکاب پر آپ فلسفیوں کو "آوارۂ ومجنوں رسوا سر بازار" قرار دیتے تھے۔

براؤننگ کہا کرتا تھا کہ زندگی کچھ معنی رکھتی ہے اور اسی معنی کا دریافت کرنا میری غذا، میرا اکل و شرب ہے۔ براؤننگ فلسفی تھا۔ فلسفہ کی یہی تعریف ہے کہ یہ "معانی اور قیمتوں کا مطالعہ ہے" "یہ حیات کی توجیہ و تعبیر" ہے

فلسفی حیات من حیث کل کا ثابت قدمی کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے، اس کا نقطۂ نگاہ وسیع ہوتا ہے، وہ کسی خاص محدود نقطۂ نظر سے زندگی پر غور نہیں کرتا بلکہ بقول افلاطون کے "تمام زمان و مکان کا ناظر ہوتا ہے" کسی شئے پر فلسفیانہ طور پر نظر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ نگاہ میں وسعت ہو، اس شئے کو دوسری تمام اشیاء کے ساتھ رکھ کر دیکھیں، تناسب کا پورا خیال ہو۔ ہم اس کی توجیہ میں ڈاکٹر جانسن کی زندگی کا ایک واقعہ پیش کریں گے۔ جس کو باسول نے بیان کیا ہے۔ باسول نے ایک روز جانسن اور ان کے چند رفقاء کی اپنے مکان پر دعوت کی۔ دعوت کے ایک روز قبل باسول کے لانڈ لارڈ نے اس کو اپنی انتہائے بدمذاقی سے مکان پر زیادہ آدمیوں کو مدعو کرنے کی اجازت نہیں دی۔ باسول نہایت آزردہ خاطر ہوا اور جانسن کو اس واقعہ سانحہ کی اطلاع دی۔ جانسن نے یہ سن کر خندہ پیشانی کے ساتھ اپنے انداز میں کہا کہ "جناب ذرا سوچئے تو سہی یہ واقعہ کوئی بارہ مہینے بعد کس قدر حقیر معلوم ہوگا!" جانسن فکر و نظر کی رو سے نہ سہی کردار و عمل کے لحاظ سے پکا فلسفی تھا، اس نے فوراً یہ دیکھ لیا کہ انسان کی زندگی میں اس قسم کے بے شمار واقعات پیش آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں، ان میں صرف ایک پر تمام توجہ کو مرکوز کرنا ان کے تناسب کو نظر انداز کرنا ہے۔ نگاہ میں تنگی پیدا کرنا ہے۔ فلسفی واقعاتِ عالم کو اپنے اپنے تناسب یا آہنگی کے لحاظ سے دیکھتا ہے، کل میں ہر ایک کو مناسب جگہ دیتا ہے، جانب داری، تعصب، تنگی، اس کی نگاہ میں نہیں پائے جاتے، بالفاظ دیگر وہ زندگی کو "ابدیت کی روشنی" میں دیکھتا ہے

بعض دفعہ فلسفہ کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ "یہ حکیمانہ طریقوں کی مدد سے اس دنیا کو سمجھنے کی کوشش کا نام ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں"

ہماری اس مانوس دنیا کو جس میں ہماری بود و باش ہوتی ہے علوم مخصوصہ کے تمام نتائج و تعمیمات کی مدد سے پوری طرح سمجھنا طالیس .... کے زمانہ سے جو یونان کا پہلا فلسفی سمجھا جاتا ہے، اب تک فلسفہ کی غایت یہی ہے۔ دنیا بہت مانوس تو نظر آتی ہے لیکن آخر "دنیا" سے مراد کیا ہے؟ یونان کے اہلِ نظر دنیا یا کائنات کو ہم معنی سمجھتے تھے۔ اور ہر زمانہ کے فلسفیوں نے نہایت ہمت و جرأت کے ساتھ اس عظیم الشان کائنات کی کنہ یا ماہیت کے پتہ لگانے کا کام اپنے سر لیا۔ کسی فلسفی شاعر ہی نے تو یہ کہا تھا کہ ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پا سکے، میرا ہی دل ہے جہاں تو سما سکے، تو پھر کائنات کی وسعت و مرد یعنی مکان و زماں کی نوعیت کیا ہے، اس نامتناہی زمان و مکاں والی کائنات کے خالق کا نشان کہاں، اس کا مقصد و غائت کیا، اس کا مایۂ خمیر کیا، اس کا حضرت انسان، اس کی روح اور اس کے منتہا سے تعلق کیا ہے، یہ وہ انتہائی و ابدی سوالات ہیں جن کے جواب کی تلاش میں دیمقراطیس اور افلاطون اور ارسطو سینٹ آگسٹس، برونو، ڈیکارٹ، سپنوزا، کانٹ، ہیگل اور ہربرٹ اسپنسر اور دیگر اکابر فلاسفہ نے اپنی جانیں دیں اور یہی عظیم الشان سوالات اب تک قابل غور ہیں اور وارفتگان

عقل کے لئے ہمیشہ رہیں گے

موجودہ زمانہ میں ہمارا نقطۂ نظر زیادہ تر انفرادی و انسی واقع ہوا ہے، ہم دنیا پر طبعی نگاہ سے غور نہیں کرتے بلکہ معاشری، سیاسی، ادبی، اخلاقی اور مذہبی نگاہ سے اس کی تحقیق و تدقیق کرتے ہیں۔ قدمائے یونان کو ثبات و تغیر عالم کا مسئلہ پریشان کیا کرتا تھا، لیکن تغیر سے ان کی مراد مادی تغیر تھی یعنی مادی ذرات یا اجزا کی حرکت یا نشو و نما، زوال و فنا کے مظاہر، چنانچہ پارمنیڈیز کا خیال تھا کہ قدرت کے کارخانہ میں تغیر محال ہے، حواس کو بظاہر جو تغیر دکھائی دیتا ہے وہ محض فریب و التباس ہے، لیکن ہراقلیتوس کا یقین تھا کہ ثبات و سکوت کائنات کی کسی شے میں نہیں، دنیا سراپا تغیر، تجدد، تنوع ہے۔ یہ اور اس قسم کے مسائل اس میں کوئی شک نہیں کہ اب تک لاجواب ہیں لیکن ہماری دلچسپی دنیا کے کسی اور طرح کے تغیر سے وابستہ ہو گئی ہے، ہم معاشری رسوم، سیاسی علایق، اخلاق و ادب، مذہب اور ادبی معیارات کے تغیرات سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ لیکن اس قسم کی تغیر پذیر دنیا بھی توجیہ کی اسی قدر محتاج ہے جیسی کہ اجزائے مادی کو تغیرات والی دنیا، لہٰذا فلسفہ کی ضرورت یقینی، فرق صرف اتنا ہے کہ اب فلسفۂ حیات اس کی قدر و قیمت، اس کی بدایت و نہایت و غرض و غایت کی توجیہ کرتا ہے اس لئے ارتقا، ترقی، ذہن کے طریقے، کردار و معاشرت کے مسائل زیادہ نمایاں اور پیش پیش ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ ہمیشہ کے لئے صحیح ہے کہ فلسفہ اس دنیا کو سمجھنے کا نام ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں

شاید حاضرین میں سے بہت کم ایسے ہوں گے جن کے ذہن نے کبھی نہ کبھی اس قسم کے سوالات کو نہ اٹھایا ہوگا: کیا خدا کا وجود ممکن ہے یا سوائے مادہ اور (Energy) کے کوئی شے نہیں؟ مادہ کا مایۂ خمیر کیا ہے؟ کیا در دست زیادہ کوئی چیز حقیقی ہو سکتی ہے؟ اگر جلوہ فرمائی صرف مادہ کی ہے تو درد کیا چیز ہے، کیا یہ ذہن میں نہیں پایا جاتا تو کیا ذہن مادہ سے جدا نہیں؟ میرا غور و فکر کرنا، درد و الم سہنا کیا صرف مادی جسم ہی سے تعلق رکھتا ہے، مادی جسم ہی کا وظیفہ ہے یا اس سے جدا شے ہے؟ میں زندہ ہوں۔ حیات کیا ہے؟ یہ مے کیا ہے جو بقول اقبال تلخ تر او نکو ترست"؟ ایک روز مجھے موت آئے گی، موت کیا ہے؟ کیا یہ انسانی شخصیت کا خاتمہ ہے؟ ابو العتاہیہ نے حیرت کے عالم میں کیا خوب پوچھا تھا ؎

الموت باب وکل الناس یدخلہ[1]

یالیت شعری بعد الباب ما الدار

ہم آزاد نظر آتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟ میر کا خیال تھا کہ ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی! حافظ کا خیال تھا کہ

درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند!

واقعہ کیا ہے؟ مجھ سے آپ سے ہر طرح کے افعال سرزد ہوتے ہیں، بعض ان میں گے صائب ہیں اور بعض خطا پذیر، صواب

---

[1] موت ایک دروازہ ہے جس میں ہر شخص داخل ہوتا ہے، اے کاش یہ مجھے معلوم ہوتا کہ اس دروازے کے بعد مکان کونسا ہے۔

خطا کے کیا معنی ؟ ان کے معیار کیا ؟ ہم میں سے بعض تلاش زر میں سرگرداں ہیں، بعض شہرت کے خواہاں، اور بعض لذت کے دلدادہ اور عیش کوش باش دمے کہ زندگانی این ست کے پیرو۔ کیا یہ درحقیقت اعلیٰ قیمتیں ہیں ؟ یا ان سے اعلیٰ وارفع نصب العین موجود ہیں ؟ مثلاً رواقیہ نے " طمانیت انفس " کو خیر برتر قرار دیا تھا، .... دنیا کی کوئی مصیبت، دنیا کی کوئی خوشی ' اطمینان خاطر ' کو صدمہ نہیں پہونچا سکتی، چنانچہ بی تھی اس (Bethinus) نے روما کے جیل خانہ میں " فلسفہ کے تسلی بخش لذات، پر ایک طویل مقالہ لکھا تھا۔ کیا اسی طرح محبت، فرض، تلاش حکمت، فنون لطیفہ کا ذوق وغیرہ اعلیٰ قیمتیں قرار نہیں دی جا سکتیں ؟ ہم یہ تمام سوالات اٹھا سکتے ہیں، کیا ان کا جواب دینا ممکن ہے ؟ علم انسانی کے حدود کیا ہیں ؟ اس کی اڑان کتنی ؟ علاوہ ازیں فطرت وصنعت میں خوبصورت اشیاء میرا محاصرہ کئے ہوئے ہیں، اکثر بدصورت بھی ہیں، حُسن کیا ہے ؟ ایک خوبصورت عمارت میں، ایک حسین چہرہ میں موسیقی کے ترنم میں وہ کیا چیز ہے جس سے ہم کیف اندوز ہو رہے ہیں ؟ اگر آنکھیں نہ ہوتیں، .... ذہن نہ ہوتا تو کیا پھر بھی فطرت پوشاک حُسن میں ملبوس ہوتی ؟ یہ سب فلسفیانہ سوالات ہیں، ان کا پیش کرنا انسان کی فطرت کا تقاضا ہے، ان پر غور وفکر کرنا، حکیمانہ طور پر، تدقیق وتحقیق کے ساتھ ان کا مطالعہ کرنا، ان کے جواب فراہم کرنے کی سعی کرنا —— گو یہ سعی لاحاصل سہی —— فلسفہ ہے، یا جیسے فلسفہ کے ایک شیدائی ولیم جیمس نے کہا ہے " فلسفہ واضح طور پر فکر کرنے کی ایک غیر معمولی وستقل کوشش کا نام ہے " یہ کام اللہ کا نہیں حیوان مطلق کا نہیں انسان کا ہے، ہر انسان کا خواہ وہ حیوانیات کا پروفیسر ہو یا تاریخ کا !

ان سوالات کا مبدأ تجسس واستعجاب ہے، انسان کی حیوان سے وجہ امتیاز یہی تجسس کا جذبہ ہے اور اسی کو افلاطون نے فلسفہ کا مبدأ قرار دیا ہے، افلاطون کے ہم وطنوں نے اپنی زندگی فلسفہ کے لئے وقف کر دی تھی، لیکن ہمارے مقابلہ میں ان کا کائنات کے متعلق نقطۂ نظر سادہ اور طفلانہ تھا، تاہم ان کی طبیعت میں تعجب زیادہ تھا، وہ دنیا کی ہر شے ہر منظر پر استعجابانہ نظر ڈالتے تھے اور بہت جلد ان کے اس استعجاب وتحیر نے ان کو فلسفہ کی راہ پر لگایا، اس زاویہ نگاہ سے، ہم فلسفہ کی اس طرح تعریف کر سکتے ہیں کہ " یہ وہ استعجاب ہے جو سنجیدہ ومتین فکر کی صورت اختیار کر لیتا ہے "

ایک چھوٹی لڑکی دریچہ سے منہ نکال کر غور وخوض کے ساتھ راہرؤں کے وارفتہ حرکات دیکھ رہی تھی، ایکدم وہ پلٹی اور اپنی ماں کے منہ سے منہ ملا کر پوچھنے لگی " اماں میری یہ سمجھ میں نہیں آتا، تم ہی بتلاؤ کہ یہ دنیا کہاں سے آئی ؟ " اس معصوم جان کا اس طرح فکر کرنا فلسفہ ہے ! ہم میں سے بہت سارے، بچے اور بڑے، دنیا کے متعلق کچھ استفسار نہیں کرتے، جیسی بھی ہو قبول کر لیتے ہیں، لیکن بعض غور وفکر کرنے والے ہوتے ہیں، انھیں دنیا ایک کہنہ کتاب سی معلوم ہوتی ہے جس کا آغاز وانجام نامعلوم، ع اول وآخر ایں کہنہ کتاب افتادہ است وہ اس کی

بدایت ونہایت کا حال معلوم کرنا چاہتے ہیں اور خود اپنے متعلق پوچھتے ہیں کہ ؎

عیاں نہ شد کہ چرا آمدم وکجا بودم
دریغ و درد کہ غافل زکار خویشتنم!

فلسفہ کا لفظ یونانی الفاظ سوفیا اور فیلوس سے مشتق ہے جن کے معنی "محبتِ حکمت" کے ہیں۔ سقراط انکسار کے ساتھ اپنے آپ کو "فلسفی" کہتا تھا یعنی "طالب حکمت" جو انسان کی غرض وغایت وجود اور اس کے فرایض کی تلاش میں جان تک کو عزیز نہ رکھتا تھا۔ ارسطو کے نزدیک انسانی عقل حکمتِ الٰہی کا ایک جزو ہے، خدا کا علم کلی ہے، ہماری عقل کا یہ پیدایشی حق ہے کہ یہ بھی کلی علم کی تلاش کرے، لیکن فلاطون وارسطو دونوں اپنے آپ کو "طالب حکمت" کہتے تھے، اور فلسفہ کے اس لفظی معنی کے لحاظ سے ہر عاشق حکمت فلسفی کہلایا جاسکتا ہے

شعر اور فلسفہ

شعر اور فلسفہ کے مقابلہ سے فلسفہ کے نئے معانی پر روشنی پڑ سکتی ہے۔ اکابر شعرا میں سے بعض زندگی کو محض بیان کرنے پر قانع نظر آتے ہیں لیکن بعض اس کی توجیہ وتعبیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی بدایت ونہایت، غرض وغایت نوعیت وماہیت کی تشریح کرتے ہیں، یہی فلسفی شعرا ہیں۔ روما کا مشہور شاعر لکری شیس فلسفی تھا، اسپکیورس نے فلسفہ کو اپنے شعر میں ادا کیا، اللہ کا انکار، حیات بعد الموت کا انکار، طمانیت خاطر اور مسرت" ماہیت فطرت" والی شہرۂ آفاق نظم کے ہر شعر سے ظاہر ہے۔ خیام فلسفی شاعر ہے، اسرارِ ازل، ماہیت کائنات، غایت وجود، راز مسرت کے متعلق اس کے خیالات گو عقل کے نہیں تاہم تخیل کے لئے نہایت خوشگوار ہیں

اسرارِ ازل را نہ تو دانی ونہ من　　ایں حرف معما نہ تو خوانی ونہ من
ہست از پسِ پردہ گفتگوے من وتو　　چوں پردہ برافتد نہ تو مانی ونہ من

در چرخ بانواع سخنہا گفتند　　ایں بے خبراں گوہر دانش سفتند
واقف چو نگشتند باسرارِ فلک　　اول .... زدند وآخر خفتند

خیام اگر بادہ پرستی خوش باش　　بالالہ رخے اگر نشستی خوش باش
چوں عاقبتِ کارِ جہاں نیستی ست　　انگار کہ نیستی چو ہستی خوش باش

ڈانٹے برترین فلسفی شاعر ہے۔ وہ اپنی (Divine Comedy) میں ہمیں کائنات کی شکل وصورت سے انسان کی بدایت وغایت سے، شر کی ابتدا اور اس کے علاج سے واقف کرتا ہے۔ "فردوس" (Paradise) کے

تابناک اشعار میں ہم پڑھتے ہیں کہ قلب کائنات سے حُبِّ الٰہی کی مستنیر شعاع پیدا ہوتی ہے جس کا مقصد انسان کو معصیتوں سے پاک کرنا ہوتا۔ جرمنی کا زبردست شاعر گیٹے بھی مفکر اور فلسفی ہے۔ اس کی شاعری کا موضوع بھی نجاتِ انسانی ہے، لیکن اس کے نزدیک یہ زہد و تقوے سے نہیں تجربہ سے حاصل ہوتی ہے۔ ورڈسورتھ کو "اس ناقابل فہم عالم کے بارگراں" نے عاجز کر رکھا تھا اور براؤننگ "نباضِ قلب" خدا، صداقت و محبت سے ہمیں تشفی بخشتا ہے:۔

ان فلسفی شعراء کی حیرت ناک دلکشی اس امر کا انکشاف کرتی ہے کہ انسان کے سینہ میں "اسرارِ ازل" کو دریافت کرنے اور اس "حرفِ معمہ" کو پڑھنے کی کتنی زبردست خواہش موجود ہے اور ہم ان شعراء کے کلام سے کس قدر تسلی و آرام حاصل کرتے ہیں اور بعض دفعہ شاعری جزویست از پیغمبری، کہ اٹھتے ہیں۔ ایسکی لس، سوفوکلیس یوری پدیس سب کے سب پیغام بر، معلم اخلاق و مفکر تھے اور اپنی قوم کو انھوں نے اپنے پیغامات سے جگا دیا

زمانۂ حال میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ ڈرامہ کس قدر فلسفیانہ بنتے جا رہے ہیں۔ ڈرامہ نویس حیات کے عمیق مسائل سے الجھ کر انھیں سلجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اِبسن اس نئے ڈرامہ کا منبع ہے۔ جہاں بجائے شاعر و صناع کے مفکر و معلم کام کرتا ہے۔ ابسن قدامت کے ازکار رفتہ و مضر روایات سے نجات پانا چاہتا ہے اور اس کے ڈرامہ کے پڑھنے والوں یا دیکھنے والوں میں جو احساسات پیدا ہوتے ہیں وہ اس قدر جمالیاتی نہیں ہوتے جس قدر کہ تفکری۔ برنارڈشا کے ڈراموں میں جمالیاتی عنصر صرف نام ہی کو رہ گیا ہے اور سوائے وعظ و تفلسف کے کچھ نہیں۔ ابسن و شا، گالس ورتی اور روسی اسکول کے مصنفین کی تصانیف میں جو حیرت ناک دلچسپی لی جا رہی ہے اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ہم اپنے شکوک کو رفع کرنے، زندگی کے اسرار کو پانے کے کس قدر خواہاں ہوتے ہیں، بقول ایک فلسفی کے ہم مابعد الطبیعیاتی حیوان ہیں، ہم دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کشمکش حیات کے باطنی اصول کیا ہیں یہ تنازع ہمیں کس جانب لے جا رہا ہے، کیا انتخاب فطرت کو مانا ہے یا کوئی "دستِ غیب" اس کے تحت رہنمائی کر رہا ہے۔ بہرحال شاعری کا یہ فلسفیانہ رجحان اس امر کا بین ثبوت ہے کہ فلسفے اور اس کے مسائل میں، جو زندگی کے مسائل ہیں، ہمیں اب بھی گہری دلچسپی ہے اور روز بروز افزوں ہوتی جا رہی ہے

فلسفہ اور سائنس

کہا جاتا ہے کہ فلسفہ اور سائنس کے درمیان ہمیشہ جنگ رہی ہے، ہم موجودہ نقطۂ نظر سے ان کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالیں گے، اختصار ہمارے پیش نظر ہوگا۔ فلسفہ اور سائنس میں نہایت قریبی تعلق ہے، دونوں کا مبدء و مادی وہی ایک ہے، "حُبِّ علم" ان کی ابتدا اور "علم حقیقت" ان کا منتہا ہے۔ اب خیال صحیح نہ رہا کہ فلسفیانہ نظامات بغیر مادی علوم کی احتیاج کے تشکیل پا سکتے ہیں۔ فلسفہ اور سائنس کا تعلق اس قدر قریبی ہے کہ فلسفہ کا طالب علوم مخصوصہ خصوصاً ریاضیات، طبیعیات، کیمیا، حیاتیات اور نفسیات کے کسی قدر علم کو لابدی سمجھتا ہے۔ لیکن ان علوم کا دائرہ ہر

روز وسیع ہوتا جا رہا ہے اور ان تمام پر عبور حاصل کرنا کسی کے لئے آسان نہیں اسی لئے فی زمانہ فلسفہ اپنی توجہ زیادہ تر تصورات کلیہ کی ناقدانہ تحلیل اور قیمتوں اور معانی کے مطالعہ پر مبذول کر رہا ہے۔ تاہم آئیڈیل فلسفی تو وہی ہوگا جو تمام علوم مخصوصہ پر مہارت رکھتا ہو

سائنس (یا حکمت) لاطینی لفظ ہے "جو علم" کے ہم معنی ہے، حکیمانہ علم "متیقن، صحیح، اور پوری طرح مربوط و منضبط ہوتا ہے" فلسفہ بھی دنیا کے متعلق علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا فلسفہ اور سائنس دونوں کا ایک ہی مقصد ہوگا۔ لیکن ان دونوں میں فرق ضرور ہے اور بعض دفعہ اس فرق کو اس طرح ادا کیا گیا ہے کہ سائنس کا کام واقعات کا "بیان" (Describe) اور فلسفہ کا کام ان کی "توجیہ و تعبیر" (Interpret) ہے۔ مقر تامسن نے پیرسن اور دوسرے علمائے سائنس کا تتبع کرتے ہوئے سائنس کی اس طرح تعریف کی ہے کہ

"سائنس واقعات تجربہ کا سادہ سے سادہ الفاظ میں کامل و متوافق بیان ہے"

مظاہر عالم کے ایک مجموعہ کا عالم سائنس مطالعہ کرتا ہے، وہ سب سے اول متعلقہ واقعات کو جمع کرتا ہے، پھر ان کی تحلیل کرتا ہے، پھر ان کا اصطفاف کرتا ہے، پھر ان شرائط یا (علل) کا مطالعہ کرتا ہے جن کی تحت یہ وقوع پذیر ہوتے ہیں، ان کی یکسانیتِ عمل کا تعین کرتا ہے یعنی ان کے قوانین کو دریافت کرتا ہے اور آخر میں ان کو ایک مربوط و مرتب مقالہ کی صورت میں پیش کرتا ہے اور یہاں پر اس کا کام بحیثیت عالم سائنس کے ختم ہو جاتا ہے یعنی اس نے واقعات تجربہ کا سادہ الفاظ میں کامل و منضبط بیان پیش کر دیا۔ ان کے طرز وقوع و طریقہ عمل کو سمجھا دیا

اب فلسفہ بھی سائنس کی طرح اسی علم کا متلاشی ہے جو متیقن صحیح اور مربوط و منضبط ہو، لیکن وہ محض اسی علم پر قانع نہیں، وہ اس علم کا جویا ہے جو جامع ہو مظاہر کے غیر متبدل توالیات یا قوانین کا تعین ذہن انسانی کو پوری طرح مطمئن نہیں کر سکتا وہ اشیاء یا واقعات کی انتہائی توجیہ و تعبیر کا خواہاں ہوتا ہے یعنی وہ ان کی علتِ اولی، ان کی بدایت و غائت، ان کے معنی یا قدر و قیمت کا جویا ہوتا ہے۔ سائنس محض واقعات کے وقوع کے شرائط کا بیان پیش کرتی ہے۔ لیکن فلسفہ ان کی انتہائی توجیہ یا تشریح کرنا چاہتا ہے، زمانہ حال کے ایک زندہ سائنٹفک فلسفی نے اسی چیز کو اچھی طرح ادا کیا ہے:۔ "فلسفہ مختلف علوم و سائنس کے نتائج کو لیتا ہے اور ان کے ساتھ انسان کے مذہبی و اخلاقی تجربات کے نتائج کو ملاتا ہے اور پھر ان پر بہ حیثیت مجموعی غور و فکر کرتا ہے۔ امید یہ ہوتی ہے کہ ہم اس طریقہ سے کائنات کی کنہ و ماہیت، ہماری حیثیت و منزلت کے متعلق بعض عام نتائج حاصل کر سکیں،

اس میں شک نہیں کہ فلسفہ کے اس عظیم الشان مقصد کے حصول کی خواہش پر اس کے عالم گیر وسعت ہی کی بنا پر علمائے سائنس کی جانب سے اعتراضات وارد ہوتے ہیں کہ یہ کام خداؤں کا ہے، ضعیف البنیان انسان اس کو حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کا تفصیلی جواب ہم آگے چل کر پیش کریں گے۔ لیکن یہاں صرف اتنا کہنا ضروری ہے

کہ "کل" کو سمجھنے کی کوشش بذات خود مورد اعتراض نہیں بن سکتی، کیونکہ انسان کو اس سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے اور انسانی دلچسپی کا ہر معروض حکیمانہ تحقیقات کا موضوع بن سکتا ہے بشرطیکہ حکیمانہ طریقے استعمال کئے جائیں۔ اعتراض تو اسی وقت وارد ہو سکتا ہے جب غلط طریقے استعمال کئے جائیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اوائل میں منطقی طریقوں کا استعمال فلسفہ کے مطالعہ کے وقت نہیں کیا گیا۔ لیکن ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ خود سائنس کے مطالعہ میں ہی منطقی طریقوں کا استعمال گزشتہ زمانوں میں نہیں کیا گیا، فکلا ہما سواء

بہر حال طریقوں کی بحث چھوڑ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلسفہ کے دو جداگانہ مقاصد ہیں اور دونوں سائنس کے عمل سے مختلف ہیں اور دونوں فکرِ انسانی کی جائز ضروریات ہیں۔ اولاً دنیا من حیث کل پر اور خصوصاً اس کے معنی، مقصد یا غائت اور قدر و قیمت پر۔ ثانیاً ان تصورات کلی کا ناقدانہ امتحان جو سائنس اور فہم عام کے استعمال میں آتے ہیں۔ پہلے کو فلسفہ نظری کہا گیا ہے اور دوسرے کو فلسفہ انتقادی

مقصدِ اوّل کے متعلق ہمیں یہ خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ ذہنِ انسانی کی یہ عمیق ترین خواہش ہے کہ دنیا و زندگی کے متعلق وہ نقطۂ نظر حاصل کیا جائے جو فلسفہ کے لئے مخصوص ہے، ہمیں دنیا کا محض ایک کمی نقطۂ نظر یا محض اس کے ریاضیاتی علائق ہی کا علم درکار نہیں بلکہ اس کی ماہیت یا کیفی و باطنی خصوصیت (اسرارِ ازل)، کا علم مطلوب ہے اس زمانہ میں سائنس کے دائرہ میں جتنی بھی ریسرچ ہو رہی ہے۔ ان سب میں کمی علائق پر زور دیا جا رہا ہے، سب کیف کے جواب سے قاصر ہیں، کمیت کی ناپ تول، تحقیق تدقیق جاری ہے۔ حکیمانہ نقطۂ نظر سے سائنس کی یہ تحدید کوئی نقص نہیں کہ وہ کیفیت، معنی و قیمت کے سوال کو اپنے دائرہ بحث سے خارج سمجھتی ہے، لیکن اس کا تکملہ فلسفہ سے کیا جانا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ دُنیا میں نہ مقصد ہو نہ غائت، اور نہ اس کی قدر و قیمت ہی کچھ ہو لیکن اس نتیجہ تک بھی ہم فکر و نظر کی ایک غیر معمولی و مستقل کوشش ہی کے بعد پہونچ سکتے ہیں اور اسی غور و فکر کا نام فلسفہ ہے

مقصدِ دوم (تصورات کی ناقدانہ تحلیل) کے متعلق ہم یہاں صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ سائنس اور فہم عام کے بعض ایسے کلی تصوّرات ہیں جن کی وہ پوری طرح جانچ پڑتال نہیں کرتے بلکہ محض عملی تعریف کرنے کے بعد اپنے عملی مقاصد کے حصول کے لئے ان کا استعمال شروع کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے تصوّرات کی مثال مکان و زماں، کیفیت و کمیّت، علیّت و قانون، خیر و شر وغیرہا سے دی جا سکتی ہے۔ اب فلسفہ کا یہ مخصوص کام ہے کہ ان تصوّرات کلیہ کا پوری طرح امتحان کرے، ان کی ناقدانہ تحلیل کرے، اور ان کے معانی و روابط کو بالاستیعاب سمجھنے کی کوشش کرے۔ برٹرنڈ رسل وغیرہ نے اسی کام کو فلسفہ کا واحد وظیفہ قرار دیا ہے۔ ان دنوں یہ نہایت ٹکنکل چیز ہو گئی ہے اور ہم سرِ دست اس میں داخل ہونا نہیں چاہتے

فلسفہ اور مذہب —— ہم فلسفہ اور مذہب کے باہمی تعلق پر اس لئے غور کر رہے ہیں کہ فلسفہ کی اہمیت

اور اس کی افادیت اور زیادہ واضح اور اجاگر ہوجائے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ فلسفہ اور مذہب میں بیر ہے، واقعہ
س کے خلاف ہے، مندرجہ ذیل مختصر واقعات سے آپ خود اس کا اندازہ کر سکیں گے

فلسفہ اور سائنس میں جس قسم کا تعلق بتلایا گیا اس سے فلسفہ اور مذہب کا تعلق جداگانہ ہے۔ فلسفہ کائنات
ن حیث کل کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، یہ دنیا کے متعلق سائنس سے زیادہ جامع، کامل اور وحدت بخش علم حاصل کرنا
اہتا ہے۔ لیکن مذہب کو اس سے بھی زیادہ کامل وحدت کی تلاش ہے، فلسفہ ایک ایسے تصور کی تلاش کرتا ہے جو
ماری مضطرب عقل کو دنیا کے معنی سمجھا دے۔ لیکن مذہب فرد وعالم کے حقیقی وحدت و وفاق کو جاننے کی کوشش کرتا
ہے، مذہب میں ہماری کوشش مبدءِ عالم سے ایک ہوجانے کی ہوتی ہے، ہم اس میں محو ہوجانا چاہتے ہیں اور
س طریقہ سے اس کی معرفت حاصل کرنا چاہتے ہیں

کہا گیا ہے کہ مذہب کا کام انسان کو دنیا میں طمانیت نفس وجمعیت خاطر بخشتا ہے، لیکن سائنس اور فلسفہ
ی ہمارے علم میں پہنائے عالم، پیدا کرنے اور لذتِ وقوف بخشنے کی وجہ سے قلب میں ایک خاص قسم کی طمانیت پیدا
تے ہیں۔ سائنس، فلسفہ اور مذہب یہ تینوں دنیا کو جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔ یہ ان کی غایت مشترکہ قرار دی جاسکتی
ہے، لیکن اس علم سے ان کی غرض جدا جدا ہے۔ سائنس کی غرض علم کو علم ہی کی خاطر حاصل کرنا ہوتی ہے لیکن زیادہ تر
علم کو عملی و معاشی اغراض کی تحت رکھتی ہے۔ فلسفہ کی غرض محبت علم اور اس سے پیدا ہونے والی ذہنی طمانیت و لذت
تی ہے۔ مذہب کائنات کو اس لئے سمجھنا چاہتا ہے کہ روح انسان کو جمعیت، چین اور نجات حاصل ہو۔ بعض
قت فلسفہ اور مذہب ان ہی تصورات سے بحث کرتے ہیں مثلاً روح، اس کی بدایت وغایت، خدا اور تخلیق لیکن
ہاں بھی ان دونوں کے اغراض جدا جدا ہوتے ہیں۔ اول الذکر میں یہ نظری اور عقلی ہیں اور ثانی الذکر میں یہ جذبی
شخصی !

فلسفہ انفرادی ذہن کی پیداوار ہے، صنمیات یا مذہب مجموعی ذہن کی۔ فلسفہ کسی فلسفی کی ذہنی کوششوں
نتیجہ ہوتا ہے، بغیر فلسفی کے فلسفہ ناممکن، اسی وجہ سے ہم ہر فلسفہ کو کسی فلسفی کے نام سے موسوم کرتے ہیں مثلاً فلاطونی
سفہ، اور ارسطاطالیسی فلسفہ، وغیرہ اس کے برخلاف صنمیات یا مذہب احادیث الطوائف (Folk Lore)
ر زبان کی طرح کسی فرد کے عمل شعوری کا نتیجہ نہیں بلکہ پوری قوم کا آفریدہ۔ جس طرح زبان کا کوئی موجد نہیں اسی
رح صنمیاتی و مذہبی عقائد کا کوئی موجد نہیں، ان کی ابتدا زبان و شاعری سے جا ملتی ہے۔ کیا ان دنوں کوئی مصری
یونانی مذاہب کے بانیوں کا ذکر کرتا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ عیسائی و اسلامی مذاہب کے بانی ضرور گزرے
ں (صلواۃ اللہ علیہم) لیکن غالباً انھوں نے کسی ایسے نئے تصورات کی تخلیق نہیں کی جو پہلے معلوم نہ تھے، انھوں
مروجہ خیالات میں اصلاح کی جس کا مقصد نظری سے زیادہ عملی تھا

فلسفہ نظر و فکر کرنے والے ذہن کا نتیجہ ہوتا ہے ہر فرد اس میں "فکر" کی وجہ سے حصہ لیتا ہے، لیکن مذہب پر وہ "ایمان" رکھتا ہے، یہ اس کا اپنا ذاتی معاملہ ہے، کسی کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں

لیکن آخر مذہب کیا ہے؟ اگر اس کی تعریف ناممکن ہے تو کسی قدر معنیٰ کا تعین تو ضرور ہو سکے گا۔ مذہب پر جب آپ غور کرتے ہیں تو شاید اختلاف کی وجہ سے مسجد و حرم، دیر و کلیسا، مصلّیٰ و ناقوس، تسبیح و زاہد خیال میں آتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ یہ چیزیں ضروری طور پر مذہب تو نہیں۔ اب مذاہب عالم پر نظر غائر ڈالیں، ان کے اجزائے مشترکہ پر غور کریں تو ہم مذہب کی کسی تعریف تک پہونچ سکیں گے شاید وہ کچھ اس قسم کی ہو: "مذہب غیب کی اُن قوتوں پر اعتبار کرنے کے احساس کا نام ہے جن کی قدرت میں ہماری قسمت کی باگ ہے، ساتھ ساتھ ان قوائے غیبی سے صادقانہ تعلقات قائم کرنے کی خواہش بھی ہوتی ہے" یا "مذہب ایک غیر مری روحانی نظام سے ہمارے عملی تعلق کا شعور ہے"

"مذہب ہمارے باطن کے اعلیٰ ترین جوہر کے ساتھ وفاشعاری کا احساس ہے" ایمرسن نے خوب کہا ہے کہ "میں، ناقص میں، اپنے کامل نفس کی پرستش کرتا ہوں" ان تعریفات سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کی بُنیاد اعلےٰ قیمتوں کے عمیق جبلی احساس پر ہوتی ہے۔ ہماری ذات میں جو الٰہیت کا جوہر مکنون و مستتر ہے وہ اُس جوہر الٰہی کی طرف بڑھتا ہے جو ہم سے ماورا ہر سارے عالم پر محیط ہے، جس کا سارا عالم خارجی اظہار ہے۔ یا مذہب ان ہی اعلیٰ و انتہائی قیمتوں کی طرف اس خاک و باد کی دُنیا اور اس کے آرام و لذائذ سے بلند ہو کر دیکھنا اور ان کی طرف باطنی ہمدردی اور شناخت کی وجہ سے کھنچ جانا ہے۔ اسی بنا پر ونٹ نے کہا ہے کہ "ہم ان احساسات یا تصورات کو مذہبی کہیں گے جو ایک نصب العین وجود کی طرف اشارہ کرتے ہیں" اسی وجہ سے مذہب کے اسمار، علائم، و اشخاص پاک و مقدس سمجھے جاتے ہیں، یہ برترین قیمتیں ہیں، دنیا کی معمولی و ادنیٰ چیزوں سے ماورا ہیں، اور اسی لئے مذہبی پہلو وفاشعاری، تحریم، تواضع و زہد کا ہوتا ہے

مذہب کی اس تعریف کے لحاظ سے روح، روحانی یا روحانیت کے الفاظ میں کسی قسم کا ستر و غموض نہیں پایا جاتا یہ ان چیزوں کے طرف اشارہ کرتے ہیں جن کی اعلےٰ قیمتیں ہوتی ہیں، چنانچہ جارج سنٹیانا کہتا ہے کہ روحانی ہونے سے مراد "نصب العین کے حضور میں زندگی بسر کرنا ہے" ڈریک نے اپنی کتاب "مسائل فلسفہ" میں روحانیت کے معنی اور مذہب سے اس کے تعلق کو بڑی اچھی طرح ظاہر کیا ہے

"قلب و ارادہ کا وہ میلان جس کی وجہ سے انسان اعلیٰ چیزوں کی پروا کرتا اور رفق و ملائمت و طمانیت باطنی کے ساتھ زندگی بسر کرتا اور حیات کے سطحی واقعات سے متاثر نہیں ہوتا اپنی باطنی ماہیت کے لحاظ سے روحانیت کہلاتا ہے، اور جب یہ خارجی صورتوں اور اداروں میں رُونما ہوتا ہے اور تمام جماعتوں میں پھیل جاتا ہے تو ہم اس کو مذہب

کہتے ہیں" (مسائل فلسفہ ص۲۲۲)

اس طرح پر سمجھا جائے تو پھر مذہب کوئی غامضانہ، تحکمانہ، یا پُر اسرار شئے نہیں رہتا بلکہ وہ ایک حاجت مند روح کی جبلی آواز بن جاتا ہے۔ مذہب انسان کی جبلیت میں داخل ہے، وہ ایسی چیز نہیں جس کی صداقت پر ہم معترض ہوں یا اس کی شہادتیں تلاش کی جائیں۔ اس کی بنیاد تو اس امر پر ہے کہ ہم اعلیٰ اقدار یا قیمتوں کے دائرہ حکومت کو تسلیم کرتے ہیں اور ان سے ایک قسم کی جبلی ہمدردی رکھتے ہیں اور ان کے آرزومند ہوتے ہیں۔ اور چونکہ مذہب ان اعلیٰ اقدار کو ہمیشہ ہماری نظروں کے سامنے رکھتا ہے اور انھیں دنیا کے لذائذ و رغائب کے باوجود فراموش ہونے نہیں دیتا اس لئے مذہب انسان کی زندگی میں سب سے زیادہ خوبصورت شئے ہے

مذہب اور فلسفہ کا تعلق کتنا قریبی ہے وہ اس بیان سے واضح ہوگیا ہوگا۔ کیونکہ اگر مذہب کی یہ تعریف کی جائے کہ یہ ان روحانی اقدار یا قیمتوں کا استحکام ہے جو روحِ انسانی میں ہمیشہ موجود ہوتی ہیں لیکن بعض اوقات خفتہ حالت میں ہوتی ہیں تو پھر فلسفہ کا یہ کام ہوگا کہ وہ ان قیمتوں کی تحقیق کرے، ان کے مبدء و ماخذ کا پتہ چلائے، ہم نے ابتداء میں فلسفہ کی تعریف ہی یہ کی تھی کہ فلسفہ" معانی اور قیمتوں کے مطالعہ کا نام ہے" اور اگر مذہب روحِ انسانی کا کائنات کی اعلیٰ قوتوں کو لبیک کہنا ہے تو فلسفہ کا کام یہ ہوگا کہ ان الٰہی قوتوں کے وجود کے دلائل و براہین پیش کرے۔ یا اگر مذہبی پہلو کے لئے اس امر کا یقین کرنا کسی طرح ضروری ہے کہ اشیاء کے پس پردہ کوئی ایسی قوت ہے جو فطرت انسانی سے کوئی نہ کوئی شئے مشترک رکھتی ہے جس کو ہم نہایت احتیاط کے ساتھ شخصی کہہ سکتے ہیں تو فلسفہ کا یہ فریضہ ہوگا کہ اس امر کا تعین کرے کہ سائنس یا مابعد الطبیعیات میں کوئی ایسی چیز تو نہیں جو ہمیں اس شخصی قوت کے وجود پر یقین کرنے سے باز رکھے، یا اگر سائنس یا مابعد الطبیعیات میں کوئی وجہ اس پر یقین کرنے کی ملتی ہے تو وہ کیا ہے ؟

یہ اکثر دریافت کیا جاتا ہے کہ فلسفیانہ تعلیم کا مذہب پر کیا اثر پڑتا ہے ؟ ہمارے خیال میں یہ اثر نہایت مفید ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ ابتداءً فلسفہ کا مطالعہ ہمارے بعض مذہبی عقائد و خیالات میں کسی قدر خلل پیدا کرے خصوصاً جب ہمارے یہ عقائد بالکل کوتاہ، ناقابلِ مصالحت یا شدید الحقد..... ہوں۔ لیکن اگر یہ وسیع کشادہ اور سادہ ہوں تو فلسفہ ان کی تائید کرتا اور انہیں تقویت بخشتا ہے۔ بیکن نے کہا ہے کہ " یہ صحیح ہے کہ تھوڑا سا فلسفہ انسان کے ذہن کو الحاد کی جانب مائل کرتا ہے۔ لیکن فلسفہ میں تعمق انسان کے ذہن کو مذہب کی طرف رجوع کر دیتا ہے" دراصل فلسفہ کا یہ کام ہے کہ وہ ہمارے اساسی مذہبی اذعانات کو عقل کی " بنیانِ مرصوص " پر مستحکم طور پر قائم کر دے تاکہ جبلی تنقیات" دین العجائز" مادیت والحاد کے طوفان میں غرق نہ ہو جائیں۔ بعض دفعہ ہمارے ان جبلی احساسات مذہبی میں ارتعاش ہوتا ہے اور ہمیں خوف ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ " نجس " سائنس ہمارے ان اذعانات کو برباد نہ کر دے۔ فلسفہ ہمیں پہاڑ کی چوٹی پر لے جاتا ہے اور ہم وہاں سے شک و ریب کی وادی پر نظر ڈالتے ہیں، علم سے ہمیں قوت حاصل ہوتی ہے خوف رفع

ہوتا ہے، جس چیز کو ہم نے بدترین سمجھا تھا، وہ اپنے پورے خد و خال، پورے تناسب میں کچھ بری نہیں معلوم ہوتی، پھر ہمیں جو طمانیت و سکون حاصل ہوتا ہے وہ ابدی ہوتا ہے

فلسفہ کے امکان کا سوال

فلسفہ کو شاعری، سائنس اور مذہب کے تقابل سے آپ نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ دیکھا۔ "فلسفیانہ مسئلہ" یا موضوع کو متشکل کیجئے تو اس کی وسعت سے آپ کو ایک قسم کا خوف یا تحیر ہوگا۔ حقیقت کی کنہ یا ماہیت، کائنات کے معانی و مقصود، اس کی بدایت و غائت، حیات کی قدر و قیمت یہ ایسے عظیم الشان سوالات ہیں کہ ان کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا۔ کسی قسم کا حل پیش کرنا بڑی ہمت کا کام ہے! عالم سائنس جو دنیا کے ایک گوشہ کو لیتا اور اس کو پوری طرح سمجھنے میں اپنی تمام قوتوں کو صرف کر دیتا ہے وہ فلسفی کے دائرہ بحث کے توسع و کشادگی کو دیکھ کر اٹھتا ہے کہ یہ کام دیوتاؤں کا ہے انسان کا نہیں کیونکہ ؎

من می نگرم ز مبتدی تا استاد
عجز ست بدست ہر کہ از مادر زاد (خیام)

لیکن خود یہ عالم سائنس جانتا ہے کہ اس کا دائرہ بحث کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو دوسرے علوم کے دائرے سے کچھ اس طرح مربوط ہے کہ خواہی نخواہی اس جزء کے کامل علم کے لئے "کل" کا مطالعہ ضروری ہے اور اس طرح وہ مجبوراً فلسفہ ہی کے دائرہ میں قدم زن ہوتا ہے یا کم از کم فلسفی پر اعتراض کرنا ترک کر دیتا ہے

تاہم مفکرین کے بعض گروہ ایسے گزرے ہیں جنھوں نے فلسفیانہ مسائل کی وسعت سے گھبرا کر اس کے مطالعہ ہی سے انکار کر دیا ہے، ان میں سے ہم دو کا اختصار کے ساتھ ذکر کریں گے۔ ان میں سے ایک ایجابیت اور دوسری ارتیابیت ہے

ایجابیت :-

فرانس کے فلسفی اگسٹ کامت (۱۷۹۸ء تا ۱۸۵۷ء) نے دنیا کے متعلق اپنے نقطۂ خیال کا نام ایجابیت رکھا ہے، گو حقیقت میں یہ خود فلسفی ہے جو فکر کی مستقل اور غیر معمولی کوشش کے بعد دنیا کے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر تک پہونچا ہے لیکن وہ فلسفہ کے نام سے بیزار ہے۔ اس کا یقین تھا کہ علت العلل یا علت اولیٰ، آخری یا انتہائی حقیقت اور اس قسم کی ساری چیزوں کی تلاش محض فضول ہے۔ انسان کے ذہن کی رسائی ان حقایق تک نہیں ہو سکتی، وہ تجربہ کے واقعات یا مظاہر اور ان کی یکسانیت عمل یا قوانین ہی تک محدود رہتا ہے۔ ظواہر کے پس پردہ کیا ہے اور اشیاء کما ہی کی حقیقت و ماہیت کیا ہے یہ سب مابعد الطبیعیاتی تجریدات ہیں۔ ان سے احتراز ہی مفید ہے، فلسفہ کا کام ظواہر کے باہمی تعلقات اور ان کے غیر متبدل طریق رفتار کا دریافت کرنا ہے نہ کہ تجریدی تصورات کے گورکھ دھندوں

میں اُلجھنا :

کامٹ کی ساری دلچسپی عمرانیات سے تھی وہ اپنے کو اس علم کا موجد سمجھتا تھا۔ اس کا نصب العین سوسائٹی کی اصلاح تھی، اس نصب العین کا تحقق معاشرت کے قوانین کے علم ہی سے ہو سکتا ہے لہٰذا کامٹ معاشرت کا سائنٹفک طریقوں سے مُطالعہ کرنا چاہتا تھا اور اسی کو وہ "فلسفۂ جدید قرار دیتا تھا۔ اس لئے ایجابیت کا مطلب صرف اتنا ہوا کہ سائنس فکر انسانی کی آخری منزل ہے، اور سائنس کا مقصد وحید واقعات تجربہ کے باہمی مستقل علایق اور انکے قوانین دریافت کرنا ہے، اور یہ مشاہدہ اور تجربہ ہی سے ممکن ہے، سائنس ان چیزوں سے بحث کرتی ہے جو یقینی، مفید اور قطعی ہوتے ہیں اور خصوصاً جو ہمارے معاشری اداروں کی تکمیل کے لئے مفید ہوتے ہیں، یہ علم ایجابی ہے، اسی کی تدوین ایجابیت کا کام ہے

سائنس کی قدر و قیمت کے متعلق ہر شخص کا کامٹ کے ساتھ اتفاق ہوگا اور نہ ہر کسی کو علم معاشریہ کی اہمیت کے متعلق اعتراض ہو سکتا ہے، لیکن کیا ہم اس کے اس خیال کے ساتھ اتفاق کر سکتے ہیں کہ فلسفہ کے وسیع مسائل کا مطالعہ فضول ہے اور مابعد الطبیعیات پر وقت صرف کرنا رائگاں ؟ اس کی تحقیق آگے آتی ہے

ارتیابیت

دوسرا گروہ جو ہمیں فلسفہ کی منزل مقصود کی طرف قدم اٹھانے سے باز رکھتا ہے وہ ارتیابیہ کا ہے، خیام کی زبان میں کچھ اس طرح ہم اس مسلک کو ادا کر سکتے ہیں

دورے کہ در آمدن و رفتنِ ماست اورا نہ نہایت و بدایت پیداست

کس می نزند دمے درین معنی راست کیں آمدن از کجا و رفتن بکجاست

ارتیابیت کا ظہور پہلے یونان میں سوفسطائیہ کے دور میں ہوا۔ "غورجیاس کی تعلیم سفسطہ" کا نمونہ ہے "کسی شئی کا وجود نہیں اگر وجود ہے تو ہمیں اس کا علم نہیں؛ اگر اس کا علم بھی ہے تو یہ دوسروں تک نہیں پہونچایا جا سکتا" ہستی کا انکار، علم کا انکار، اس سے زیادہ انکار و ارتیاب کیا ہو سکتا ہے ؟ چند دن بعد یونانی رومی دور میں ارتیابیت فلسفہ کا ایک مستقل "اسکول" بنگئی جس کا بانی "پرہو" تھا۔ تعجب تو یہ ہے کہ گو ان مفکرین نے سقراط، افلاطون، ارسطو، دیمقراطیس جیسے جلیل القدر فلسفیوں کے بعد جنم لیا، اور گو اہل یونان نے اب تک مابعد الطبیعیات اخلاقیات، منطق، ریاضیات میں شاندار کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ تاہم انہوں نے "بردِ عمل" تک پہونچنے میں مایوسی کا اظہار کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اب تک فلسفہ ادعائی تھا، ذہن انسانی نے ملکۂ علم کی تنقید کے بغیر یہ مان لیا تھا کہ حقیقت کا علم ممکن ہے۔ لہٰذا یہ اکابر فلاسفہ کے مختلف و متضاد خیالات و نظریات کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے اور ان کا مذاق اُڑایا کرتے اور کہتے کہ عقدۂ کائنات لاینحل ہے، صداقت کلی ناقابل حصول۔ ہاں

انسان (فرد) ہر چیز کا معیار ہے" "جتنے آدمی اتنے ذہن" ہماری رایوں میں یکسانیت ممکن نہیں، لہذا علم کلی کا امکان
لکل نہیں - فرد علم کے معاملہ میں اپنا قانون آپ ہے، اس نظری ارتیابیت سے اخلاقی ارتیابیت بہت زیادہ دور نہیں تھی - جب
لم ہی کا امکان نہیں تو صواب وخطا کا علم کہاں، کلی طور پر صواب وخطا کا وجود نہیں، جو چیز تمہارے لئے اچھی ہو ضروری
ہیں کہ وہ میرے لئے بھی اچھی ہو - ضمیر شخصی معاملہ ہے - یہی حال جمال کا ہے، اس میں بھی کوئی مشترک معیار نہیں - کیا تمھیں
س حبشی کا قصہ یاد نہیں جو اپنے بادشاہ کے اس حکم کی پیروی میں کہ سب سے زیادہ حسین بچے کے گلے میں موتیوں کا ہار پہنایا
جائے بہت سی تلاش کے بعد اپنے ہی بچہ کے گلے میں پہنا دیا اور عرض کیا کہ جہان پناہ میری نگاہ میں اس حبشی زادے سے
زیادہ خوبصورت آپ کی ساری وسیع مملکت میں کوئی بچہ نہیں!"

زمانہ جدید میں یونان کی سی ارتیابیت بالکل مفقود ہے - ارتیابیت کا سب سے آخری (۱۷۱۱ء تا ۱۷۷۶ء) ——
عامی اڈنبرا کا مشہور عالم مفکر ہیوم تھا - لیکن اس کی ارتیابیت ایسی تباہ کن اور انتہائی نہ تھی جیسی کہ یونانی ارتیابیت بلکہ
حدود علم کی ایک ناقدانہ تحقیق وتدقیق تھی - جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہمارے علم کا مبدا تجربہ ہے، اس کی انتہا عالم مظاہر، اور ایک
قسم کی "لا ادریت" کہ علل انتہائی، روح، الیغوا وغیرہ کی حقیقت کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں

موجودہ زمانہ کی اسپرٹ تو یہ ہے کہ ہر جدید مسئلہ کا امید ورجا کے ساتھ پیہم طور پر مقابلہ کیا جائے، فلسفیوں کا باہمی اختلاف
ممکن، علم انسانی کی غلطی ممکن، ہمارے حواس کا التباس ممکن، لیکن ہم یہ ضرور دریافت کرکے رہیں گے کہ کونسا فلسفہ صحیح ہے،
حواس کا دھوکہ کس طرح دور کیا جاسکتا ہے، علم کی غلطی کیسے رفع ہوسکتی ہے - زمانہ جدیدہ کی روح جرأت وجوش سے مملو
ہے، قطب جنوبی کی دریافت کا بیڑا اٹھایا، تلاش میں جانیں گئیں - لیکن باوجود ہر طرح کے آفات ومصائب کے اس کو دریافت
کرہی لیا - مونٹ ایورسٹ کی چوٹیاں ابھی زیر قدم نہیں آئی ہیں - لیکن اہل ہمت اس کی طرف بڑھتے جارہے ہیں - ایک
نہ ایک روز یہ زیر قدم آرہیں گی - یونیورسٹی کی شرکت کے وقت طلبا ان مضامین کو زیادہ پسند کرتے ہیں - جن میں مسائل
زیادہ دریافت طلب ہوں - موجودہ فکر وتفلسف میں شک ضرور پایا جاتا ہے - لیکن یہ ہمیں لوری دے کر بستر راحت پر نہیں
سلا رہا ہے بلکہ اقبال کی زبان میں کہہ رہا ہے ؎

ضمیر کن فکاں غیر از تو کس نیست — نشانِ بے نشاں غیر از تو کس نیست
قدم بیباک تر نہ در رہِ زیست — بہ پہنائے جہاں غیر از تو کس نیست!

براؤننگ کہتا ہے کہ "شک کی میں قدر کرتا ہوں، حیوانات میں یہ نہیں پایا جاتا، ان کی محدود مٹی میں اس شعاع
مستنیر کی تابناکیاں کہاں؟" برٹرنڈرسل اس رہائی وآزادی بخش "شک" کا ذکر کرتا ہے جو ادعائیت کو پست ہمت
کرتا اور ہمیں راہ عمل میں جری بناتا ہے - وہ کہتا ہے کہ "فلسفہ ان لوگوں کی متکبرانہ ادعائیت کو دور کرتا ہے جو آزادی بخش
شک کے دائرہ میں قدم زن ہوتے ہیں، یہ مانوس اشیا کو غیر مانوسیت کے جامہ میں پیش کرکے ہمارے احساس تحیر

کو ہمیشہ زندہ رکھتا ہے" ان جری روحوں کو ان بزدلوں سے کسی قسم کی ہمدردی نہیں ہو سکتی جو محض اس خیال سے کہ چونکہ فلسفیانہ سوالات کے جواب نہیں دئے جا سکتے لہٰذا ان کو اٹھایا ہی نہ جائے اور نہ ان کے حل کی کوشش کی جائے فلسفہ کی راہ میں طالب علم کو شک بلکہ دہشت ہوتی ہے ضرور، لیکن شک کا پیدا کرنا، صداقت کی تلاش میں آوارہ و سرگرداں ہونا اور اس کے حصول کی اُمید رکھنا ——— یہ روحِ انسانی کا عظیم الشان کارنامہ ہے!

ان دنوں ہم ارتیابیت کی بجائے "لاادریت" کا زیادہ ذکر سنتے ہیں۔ اس لفظ کو سب سے پہلے ہکسلی نے رواج دیا لیکن یہ ہربرٹ اسپنسر کے نام سے زیادہ وابستہ ہے اس کے لفظی معنی ہیں "علم کا نہ ہونا" لاادری، یعنی میں نہیں جانتا۔ اسپنسر کا یقین تھا کہ علم میں ایک قسم کی اضافیت پائی جاتی ہے، لہٰذا علمِ مطلق کا امکان نہیں سارا علم اضافی ہے قانونِ اضافیت کے معنی یہ ہیں کہ کسی شئے کا علم دوسرے خارجی اشیاء کے امتیاز سے حاصل ہوتا ہے جو اس کی تحدید کرتے ہیں، نیز یہ شئے ذہن کی اضافت ہی سے معلوم ہو سکتی ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیں مظاہری، محدود، اضافی اور مشروط موجودات کا علم ہوگا، لامحدود اور مطلق یا غیر مشروط ہمارے دائرہ علم سے ماورا غیر معلوم و ناقابل علم ہوگا - چنانچہ اسپنسر کے نزدیک ہمارا علم مادہ حرکت قوت اور شعور وغیرہ جیسے واقعات کے ادراک نہیں پہونچ سکتا اور یہ تمام ایک "ناقابلِ علم ہستی مطلق" کے شئون و احوال ہیں

قانونِ اضافیت پر تھوڑی دیر کے لئے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قانون خود ذاتِ مطلق کے تصور کو ضروری سمجھتا ہے، یعنی اضافی کے تصور میں مطلق کا تصور استلزامی طور پر موجود ہوتا ہے اور خود ہربرٹ اسپنسر نے اس کو تسلیم کر لیا ہے، صاف ظاہر ہے کہ اگر دنیا محض ظہور ہے تو یہ ضرور کسی ہستی کا ظہور ہوگی، ظہور خود حدِّ اضافی ہے جو کسی مطلق ہستی کے وجود کو مستلزم ہے، اسپنسر کا کہنا صرف یہ تھا کہ مطلق کے وجود کے سوا ہمیں اس کے متعلق کسی شئے کا علم نہیں، لیکن اسپنسر کی اس غلطی کو ہیگل نے پہلے ہی رفع کر دیا تھا۔ چونکہ تمام محدود اشیاء و اذہان مطلق کے ظہور ہیں لہٰذا وہ ان ہی میں اور ان ہی کے ذریعہ قابل علم ہے، اس میں شک نہیں کہ مطلق کی ماہیت ہمارے محدود ذہن میں پوری طرح نہیں آسکتی لیکن ہمیں اس کو ایک حد تک ضرور جزی طور پر سمجھ سکتے ہیں اور اس کے کچھ صفات سے واقف ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا لاادریت کا یہ دعویٰ کہ جس قسم کے علم کی فلسفہ کو تلاش ہے وہ ناقابل حصول ہے، شک سے بڑھ کر ادعائیت کی حد تک پہونچ جاتا ہے، لہٰذا یہ سائنس اور فلسفہ ہر دو کی اسپرٹ کے خلاف ہے جو ان تھک اور دائمی تلاش کا نام ہے، فلسفی "عاشقِ حکمت" "آزارِ جستجو" ہی کو اپنی غائت سمجھتا ہے اور اقبال کی زبان میں کہتا ہے ؎

شادم کہ عاشقاں را سوزِ دوام دادی
درماں نیافریدی آزارِ جستجو را

اور "در قلزم آرمیدن ننگ است آبجو را" کہتا ہوا "رمزِ کائنات" کا ہمیشہ جویا و متلاشی رہتا ہے!

فلسفیانہ نقطۂ نظر کی ضرورت :-

سچ تو یہ ہے کہ آج سے دو ہزار سال سے بھی زیادہ پہلے ارسطو نے اس بحث کا تصفیہ کر دیا تھا کہ آیا ہم فلسفہ کا مطالعہ کریں یا نہ کریں، اس نے کہا تھا کہ " ہم فلسفیانہ غور و فکر کریں یا نہ کریں، ہمیں فلسفیانہ غور و فکر کرنا تو ضرور پڑتا ہے " شوپنہار نے انسان کی طبیعت کا پتہ لگا کر اسی لئے کہا تھا کہ انسان " مابعد الطبیعیاتی حیوان ہے " اڈون والس نے نہایت عقلمندی سے کہا تھا کہ " ہر شخص خواہ شعوری طور پر ہو یا غیر شعوری طور فرد و کائنات کے رشتہ باہمی کے متعلق کوئی نہ کوئی نظریہ ضرور قائم کر لیتا ہے اور اسی پر اس کی ساری زندگی و عمل کا انحصار ہوتا ہے " اسی خیال کو پالسن نے یوں ادا کیا ہے کہ ہر شخص کا فلسفہ ہوتا ہے۔ عہد فطرت میں بسنے والے وحشی کا یہی فلسفہ ہوتا ہے اور یہی اس کے اعمال و کردار کا مرکز ہوتا ہے ! اور اسی معنیٰ کے لحاظ سے چسٹرٹن کہتا ہے کہ " آدمی میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ عملی چیز کائنات کے متعلق اس کا نقطۂ نظر ہے " یعنی اس کا فلسفہ !

آپ نے اوپر دیکھا تھا کہ فلسفی کائنات کی ماہیت و غائت کے متعلق ایک نظریہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ عالم سائنس کے کمی علم کی تکمیل کسی علم سے کرنا چاہتا ہے۔ اس کو چند ایسے مفروضات تسلیم کرنا پڑتے ہیں جن کی تصدیق بالکلیہ تجربہ و مشاہدہ و اختیار سے نہیں ہو سکتی۔ حواس جن چیزوں کی شہادت دیتے ہیں ان کی تکمیل وہ تخیل یا وجدان سے کرتا ہے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنی مرضی یا ارادہ ہی سے ایسا کرے بلکہ بقول ارسطو خواہی نخواہی اس کو کرنا پڑتا ہے، وہ کامت کی طرح اپنے کو " ایجابی " کہہ سکتا ہے اور احتجاج کر سکتا ہے کہ وہ صرف واقعات ہی کی حد تک محدود رہنا چاہتا ہے یا اسپنسر کی طرح وہ کہہ سکتا ہے کہ وہ " لا ادریہ " ہے اور اشیا، کماہی کے علم سے ناواقف، لیکن وہ ان احتجاجات کے باوجود چند مفروضات کو تسلیم کرتا ہے اور خواہی نخواہی فلسفی ضرور ہے، ھذا شئی عجاب ! بڑے سے بڑا " لا ادری " بڑے سے بڑا شکی، یا ارتیابی، اپنے عقائد و انکارات مخفی نہیں رکھ سکتا، اس کو زندگی کے کارزار میں جانب داری کرنی پڑتی ہے۔ باوجود ایجابیت و لاادریت کی لن ترانیوں کے، باوجود ماورائی بختان سے اس امر کا یقین دلانے کے کہ حقیقت ناقابلِ علم ہے اس کو زندگی اس طرح بسر کرنی پڑتی ہے گویا کہ اس نے ان خوفناک استبعادات کے ایک نہ ایک پہلو کو قبول کر لیا ہے جن پر فلسفہ مشتمل ہوتا ہے۔ اس کو اس امر کا تصفیہ کر لینا پڑتا ہے کہ آیا یہ زمین جس پر اس کی زندگی بسر ہو رہی ہے ایک ذی غائت عقل کی صنعت گری کا نتیجہ ہے یا ذرات یا سالمات کی کورانہ کشمکش کا آفریدہ یعنی خدا کے متعلق اس کا کوئی نہ کوئی نظریہ ہونا چاہیے خواہ یہ خدا کے وجود کے انکار ہی کی خاطر کیوں نہ ہو۔ اس کو اپنے ذہن میں اس امر کا تصفیہ کر لینا چاہیے کہ آیا وہ ایک خود رفتار مشین یا کل ہے جو دوسری مشین سے، ہم صحبت، ہوتا ہے تاکہ چھوٹے مشین پیدا ہوں یا ایک قوتِ حیات کا ظہور، تخلیقی قوت و اختیار کا حامل یا نورِ الٰہی کی گریز پا شعاع ! اس کو اپنے ذہن میں اس امر کا بھی فیصلہ کر لینا چاہیے کہ آیا عقل کی غیر یقینی قوتیں یا وجدان کی شاہانہ بداہت حقیقت کی رہنما اور

صداقت کا معیار ہے - اسی طرح اخلاقی اقدار کے متعلق، اس کو اس امر کا تصفیہ کرلینا چاہئے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ وفادار رہے گا یا اپنی قوتِ مردانگی کو قیمتی طور پر تقسیم کرے گا ! اس کو اپنے نزدیک اس امر کا فیصلہ کرلینا چاہئے کہ آیا مرنے کے بعد اس کا بالکل خاتمہ ہوجاتا ہے " خاکی است دنخاکش ہمی دہند" یا " چو دانہ خاک شگافد گل تراست" ایک اعلےٰ و ارفع زندگی میں داخل ہوتا ہے !

یہ تمام نہایت اہم مسائل ہیں اور فلسفہ موت وحیات کا معاملہ ہے اور ان تمام مسائل کے متعلق فلسفے کا کٹر سے کٹر مخالف اپنے ذہن میں کچھ نہ کچھ فیصلہ کرلیتا ہوتا ہے مثلاً وہ فرض کرلیتا ہے کہ مادیت صحیح ہے، حقیقت کی تمام صورتیں شجر و حجر، لطف و کرم دعا و عبادت ——— سب مادی ہیں، ان کی مادی پیمائش ہوسکتی ہے - یہ ایک شاندار مفروضہ ہے جس کی اختیاری تصدیق بالکل ناممکن، یہی مفروضہ اس کو فلسفی بناتا ہے اور اپنے اس فلسفہ کو وہ قابل تعریف سادگی کے ساتھ پیش کرتا ہے - وہ فرض کرلیتا ہے کہ دنیا ایک قسم کی میکانیت ہے، اور وہ خود ایک مشین ہے جو میکانکی اور غیر شعوری طور پر شعور کے زاید از ضرورت اور فضول ارتقا پر غور کررہا ہے، دنیا کی ماہیت کے متعلق یہ بھی ایک نظریہ ہے جو اب تک ناقابل ثبوت ہے، اور جب اس کو دیمقراطیس، بالکری ٹیس یا ہابس یا لامتری پیش کرتے ہیں تو فلسفہ کے نام سے پکارا جاتا ہے - وہ تسلیم کرتا ہے کہ حیات میں خود اختیاری نہیں، ہر ایک ہستی کا ہر فعل اس ابتدائی ضبابہ (Nebula) نے متعین و مقرر کردیا ہے جو سائنس کی صنمیات میں "باغ عدن" کی جگہ ہماری سامعہ نوازی کرتا ہے - وہ تسلیم کرتا ہے کہ ذہن مادہ ہے اور بقول دباستنا دینیتشے (نعوذ باللہ) خدا ایک عرصہ ہوا کہ مرچکا اور اس کی متعدد قبریں مساجد و منادر میں بنائی جاچکیں !

یہ سب ممکنہ مفروضات ہیں - ہر فلسفی ان کو یا ان مخالف مفروضات کو تسلیم کرنے کا حق رکھتا ہے - ہم تمام کو ان مفروضات کو تشکیل دینا اور ان کو تسلیم کرنا پڑتا ہے - زندگی ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم اشیاء کی ماہیت اور انسان کی غایت کے متعلق مفروضات کو تسلیم کریں، ہم ہمیشہ مفروضات کی تشکیل میں حصہ لیتے ہیں، مطلق کا " آذارِ جستجو" ہمارا "آرام جان" ہوتا ہے، اس کی دلکشی ہمیں ہمیشہ اپنی طرف جذب کرتی ہے - علاوہ دوسرے وجوہات کے یہ بھی ایک وجہ ہے کہ فلسفہ سائنس سے زیادہ دلچسپ اور دلکش ہوتا ہے، وہ دیارِ نامعلوم کا سفر ہے - لامحدود کی تلاش میں کو بکو کوچہ بکوچہ سرگرداں ہونا ہے، اس کے مقابلہ میں سائنس کی دلچسپی ضرب کی تختی میں جو دل فریبی ہے اس سے زیادہ نہیں !

لہٰذا ہم سب فلسفی ہیں، مابعد الطبعیاتی حیوان ہیں، ایک جو اعلانیاً فلسفی ہے دوسرا جو اقراراً ایجابی ہے ان دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ اول الذکر ہی اس معاملہ میں راست باز و راست گو آدمی ہے

فلسفہ کی ترقی پر اعتراض :-

فلسفہ پر ایک اعتراض عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ فلسفیانہ مباحث میں جس دروازے سے ہم داخل ہوتے ہیں

اسی دروازے سے باہر بھی ہوتے ہیں، ہر فلسفی دوسرے فلسفی کے خیالات کا نقیض پیش کرتا ہے، تاریخ فلسفہ ان ہی تناقضات نظری ارائے کا مجموعہ ہے جو کامیابی کے لحاظ سے مادی علوم مخصوصہ کی ترقی سے کسی طرح مقابلہ نہیں کرسکتی

حقیقت میں فلسفیانہ مباحث کے دوران میں یا تاریخ فلسفہ کے مطالعہ کے وقت اگر ہم اپنا دماغ دروازہ کے باہر چھوڑ کر جائیں تو بیشک اسی دروازہ سے نکل آئیں گے جس دروازے سے کہ ہم داخل ہوئے تھے! اکابر فلاسفہ کا سرسری مطالعہ کرنے کے بعد بھی ہزار ہا اہم مسائل کے متعلق ہم اپنے خیالات بدلے بغیر رہ نہیں سکتے۔ ہم خود فلاسفہ کے تناقضات کے متعلق بھی اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہوں گے اور پائیں گے کہ بنیادی مسائل کے متعلق تقریباً تمام اکابر فلاسفہ کا اتفاق تھا، اختلافات محض اپنے اپنے زمانہ کے اصطلاحات وحدود کے فرق کی وجہ سے دکھائی دیتے ہیں۔ اور نیز اگر ہم تاریخ سائنس کے طالب علم ہیں تو ہمیں بادی النظر ہی میں یہ معلوم ہو جائے گا کہ فلسفہ سے زیادہ سائنس میں نظریات .... اعتقادات سینما کے متحرک تصاویر کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔ سائنس کی تاریخ ہزار ہا مسترد نظریات کی تاریخ ہے۔ مثال کے طور پر ہم چند عالمگیر اہمیت کے نظریات کا ذکر کریں گے:-

آج سے پچاس پچپن سال پہلے کائنات کے ابتدائی توجیہ لاپلاس کے مفروضہ ضبابیہ Nebula Hypothesis سے کیجاتی تھی۔ کانٹ فلسفی نے اس نظریہ کو سب سے پہلے پیش کیا تھا، لاپلاس نے اس کی توضیح کی تھی، آج کل شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر چیمبرلین اور مولٹن نے اس کی توجیہہ "Planetesimal Hypothesis" پیش کی ہے جو اول الذکر نظریہ کی تردید کرتی ہے

پچاس پچپن سال پہلے ڈارون کی "Origin of species" (اصل انواع) ارتقائی انجیل سمجھی جاتی تھی آج کل یہ نیا ہر کے اعتراضات کا نشانہ ہے اور اس کی وقعت کا حال سب کو معلوم ہے! عمل ارتقائی توجیہ تغیرات "Variation" کے بجائے "تحولات" (Mutation) سے ہونے لگی، اب مسٹر کیام مریہ کے ساتھ ہم لامارک کے نظریہ کو پھر قبول کرنے لگے ہیں۔ ہیں تفاوت رہ! نیوٹن نے حرکت کے بعض قوانین دنیائے سائنس نے ان کو قبول کیا، اب آئنسٹائین ان کی تردید کر رہا ہے۔ مے یر، رم فورڈ، ڈے وی، اور صدہا دیگر علما سائنس نے مادہ کی غیر فنا پذیری اور بقائے توانائی کو ثابت کیا اور ساڈی رذر فورڈ ہینکاسے جدید سائنس کے ان انتہائی عقاید میں شک پیدا کر رہے ہیں۔ پیرسن، ماخ وغیرہ ہم سے کہہ رہے ہیں کہ سائنس کا علم تخمینی احتمالات موجہیاں ہے، اور فطرت کے عدیم التغیر وابدی قوانین مادہ کے مشاہدہ کردہ عادات کے اوسط کے سوا کچھ اور نہیں! بھلا ہم ایسی سائنس کی شان میں کیا کہیں جو فلسفہ کی طرح غیر یقینی ہوگئی ہے اور فطرت کے علم کا کیا دعویٰ کریں جس کے قوانین اعداد وشمار کی سی وقعت رکھتے ہوں! کسی زمانہ میں ریاضیات کو تیقن اور غیر خطا پذیر صداقتوں کا مجموعہ سمجھا جاتا تھا کہ ناگہاں ابعاد ثلثہ صاحب اولاد ہوگئے، جزکل کے اتنا بڑا ہوگیا اور آئنسٹائین نے ثابت کردیا کہ

دو نقاط کے درمیان ایک خطِ مستقیم بڑے سے بڑا فاصلہ ہے! فرانسس گالٹن اور کارل پیرسن کی تحقیقات کی رُو سے ماحول کا اثر توارث سے زیادہ تھا .... مسٹر دگم نے اس کے برخلاف بڑی شان سے دنیا کو یہ ثابت کر دکھلایا کہ توارث کا اثر ماحول کے اثر سے زیادہ ہے!! اب ڈاکٹر واٹسن دو سو بچوں کا معائنہ کرنے کے بعد ہمیں اطلاع دے رہے ہیں کہ جنین اور بچہ کا ماحول اس کی سیرت در تاریخ کے تعین کا اہم جزو ہے اور توارث کا اثر نہایت خفی ہے اور آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ آئے دن ہر ایمان دار تاریخ داں ثابت کر رہا ہے کہ تاریخ "جھوٹ کا دریا ہے ہر ایمان دار" [illegible] "سنین و سلسلہ ملوک کی ایک نئی فہرست پیش کرتا ہے جو دوسری فہرستوں سے چند ہی ہزار سال کا فرق رکھتی ہے!

سائنس کے نظریات کے عدیم التغیر ہونے کے ثبوت میں یہ مثالیں اہلِ بصیرت کے لئے کافی ہیں، اعمال نامے کو طول دینے کی ضرورت نہیں، فلسفی کی نظروں کے لئے تو یہ خوش کُن سرکس ہے! بحیثیت فلسفی ہمیں اعتراف ہے کہ فلسفہ بعض جگہ تاریک ہے لیکن یہی حال شلی کی نظم کا ہے، یہی حال سائنس کا ہے، یہی حال جنس لطیف کا ہے، یہی حال ہر دلچسپ شے کا ہے! اس سے بدتر، ہم ماننے پر تیار ہیں کہ فلسفہ بعض دفعہ کذاب بھی ہے۔ ہم اپنے قلب کے عزیز تعصبات کو، بڈھی عورتوں کی دینیات کو خارجی یقینی عقل کے لباس میں ملبوس کرتے ہیں۔ اسی بنا پر ایک مشہور فلسفی براڈلے نے مابعد الطبیعیات کی اس طرح تعریف کی ہے کہ "مابعد الطبیعیات (فلسفہ) ان چیزوں کے لئے جن میں ہم جبلّی طور پر یقین کرتے ہیں خراب حجتوں کا دریافت کرنا ہے، لیکن ان حجتوں کا دریافت کرنا بھی کچھ کم جبلّی نہیں" لیکن باوجود ان تمام نقائص و خرابیوں کے سائنس کی طرح فلسفہ کی رفتارِ ترقی بھی متعین اور شاندار ہے، گزشتہ پچیس سال میں فلسفہ نے اسی سرعت و شان کے ساتھ ترقی کی ہے جس طرح کہ سائنس نے۔ ولیم جیمس جیسے محتاط و سائنٹفک فلسفی کے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ :-

> "بعض حیثیتوں کے لحاظ سے تو "سائنس" نے "فلسفہ" سے کم ترقی کی ہے۔ یعنی اس کے اکثر کلی تصورات سے نہ ارسطو کو حیرت ہوگی اور نہ ڈیکارٹ کو اگر بفرضِ محال انھوں نے زمین کی سیر کا ارادہ کیا۔ اشیاء کا عناصر سے مرکب ہونا، انکا ارتقا، بقائے توانائی، ایک کلی لزوم یا جبر کا تصور، یہ سب انھیں معلوم و معتاد چیزیں نظر آئیں گی۔ ہاں چھوٹی موٹی چیزیں مثلاً خوردبین، بجلی کی روشنی، ٹیلیفون، اور سائنس کی دیگر جزئیات ان کو ششدر و مرعوب کریں گی۔ لیکن اگر یہ ہمارے مابعد الطبیعیات کی کتابیں کھولیں یا فلسفہ کے لکچر روم میں آئیں تو ہر چیز انھیں اجنبی سی معلوم ہوگی۔ ہمارے زمانہ کا سارا "تصوری" یا "انتقادی" پہلو انھیں نیا معلوم ہوگا اور ان کے سمجھنے میں انھیں دیر لگے گی" (بعض مسائل فلسفہ صفحہ ؟)

شاید اس تفصیلی بحث کے بعد آپ کو فلسفیانہ تعلیم کے فوائد کا بھی اندازہ ہو گیا ہوگا۔ فلسفہ آپ کو سب سے پہلے وحدت

ذہن عطا کرتا ہے ، ہم آپ سب فکر کے عمل میں غیر محتاط اور متناقص ہوتے ہیں ہمیں کسی حد تک توافق و وفاق کی ضرورت ہے ۔ فلسفیانہ تعلیم ہمیں وحدتِ فکر بخشتی ہے ، اس وحدتِ ذہن یا وحدتِ فکر سے ہمارے خواہشات میں وحدت پیدا ہوتی ہے ، اور اس کی وجہ سے سیرت میں وحدت پیدا ہوتی ہے جو شخصیت کا دوسرا نام ہے اور سیرت کی وحدت کی وجہ سے زندگی میں وحدت پیدا ہوتی ہے جو مسرت کا راز ہے اور جو ہم سے تماموں کی غایت قصویٰ ہے ۔ اپیکیورس شہنشاہِ خوش باشاں نے دو ہزار سال قبل اپنے ایک دوست کو خط لکھا تھا جس میں وہ کہتا ہے

"کسی شخص کو بھی جب تک وہ جوان ہے فلسفیانہ تعلیم حاصل کرنے میں دیر نہ کرنی چاہئے ، اور اگر وہ ضعیف ہے تو اس کو اس تعلیم کے حصول میں تھکن نہ ظاہر کرنی چاہئے ، کیونکہ وہ کون شخص ہے جو اپنی روح کی صحت کا علم حاصل کرنے میں وقت کی موزونیت و ناموزونیت و تاخیر کا خیال کرے گا ؟ اور جو شخص یہ کہتا ہو کہ فلسفہ سیکھنے کا ابھی وقت نہیں یا وہ وقت گزر چکا ، تو اس کی مثال اس شخص کی سی ہو جو یہ کہتا ہو کہ ابھی مسرت کا وقت نہیں آیا یا وہ گزر گیا ۔"

فلسفیانہ تعلیم سے انسان اپنی جذبات کی غلامی سے آزاد ہوتا ہے ، جذبات کی غلامی سے آزادی حاصل کرکے دوسروں کی غلامی سے نجات پاتا ہے ۔ روما کے ایک جادو بیان کے الفاظ میں ہم فلسفہ کو مخاطب کرکے کہہ سکتے ہیں ۔

"اے فلسفہ کی روح ، اے ہماری زندگی کی رہنما ، نیکی کی دوست اور بدی کی دشمن ، تیرے بغیر ہم کیا اور ہماری زندگی کیا ! "

میر ولی الدین ایم - اے (جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

اولی الالباب سے خطاب

یوں تو برسات کی ہر شام خوشگوار ہوتی ہے لیکن جب کئی روز تک مسلسل بارش ہونے کے بعد فطرت کا جوش کچھ کم ہوتا ہے تو کھیتوں اور میدانوں کی کشش دو نی ہو جاتی ہے، درخت اور پودے نہا دھو کر نیا روپ اختیار کر لیتے ہیں اور شام کی تابناک شفق ہر چیز کو اپنے ساحرانہ لمس سے زرکار بنا جاتی ہے

سسی ندی کے کنارے کشن پور کے علاوہ اور بھی کئی گاؤں آباد تھے۔ اور دوسری جانب مقابل میں ہوب آباد کا بازار تھا، جہاں دوشنبہ اور جمعہ کو جب خاص طور پر بازار لگتا تھا اچھی خاصی چہل پہل ہو جاتی تھی، ـــــ برسات کے علاوہ [illegible] موسم میں دریا اس قدر پایاب رہتا تھا کہ لوگ آسانی سے ادھر اُدھر آجا سکتے تھے البتہ جب بارش ہوتی تو سسی ندی میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں چلنے لگتیں

کشن پور میں سیتل اور شنکر دو ملاحوں کے مکان تھے، مچھلیوں کے علاوہ برسات میں یوں بھی کچھ آمدنی ہو جاتی تھی، شنکر کے کئی لڑکے اور لڑکیاں تھیں جنہیں سرجو سب سے بڑا تھا اس کی عمر اکیس سال کے قریب تھی اس کی شادی ابھی کہیں نہیں ہوئی تھی کیونکہ قرب و جوار میں کسی اور ملاح کا مکان ہی نہ تھا، سیتل کے صرف ایک لڑکی رجونتی تھی جس کی عمر سولہ یا سترہ برس کے قریب تھی سیتل اور شنکر ماجھی نے تو خیر آپس میں طے ہی کر لیا تھا لیکن عام طور پر بھی سارے گاؤں میں یہ خبر مشہور تھی کہ سیتل ماجھی کی کنول جیسی خوبصورت لڑکی کا بیاہ سرجو کے ساتھ ہوگا۔ سرجو اپنے کام میں بہت ہوشیار تھا لیکن رجونتی اور زیادہ قابل ستائش تھی کہ ماں کے مرنے کے بعد ہی گھر کا سارا کاروبار اس نے سنبھال لیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں میں ہر شخص کسی نہ کسی خاص بات میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے، اور چونکہ لوگ کم ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر شخص ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے۔ سرجو بہت ہونہار اور محنتی لڑکا سمجھا جاتا تھا۔ اور رجونتی بھی فراوانیِ حسن کے ساتھ ساتھ فرمانبرداری کا اعلیٰ نمونہ خیال کی جاتی تھی

کئی دن تک مسلسل بارش ہوتی رہی اور لوگ گھر پر پڑے پڑے کاہلی اور سستی محسوس کرنے لگے، علاوہ اُن لوگوں کے جن کی ضرورتیں نہایت اہم تھیں تمام لوگوں نے اپنا اپنا کام بارش کے بند ہو جانے پر اٹھا رکھا تھا سنیچر کے روز سے پانی برسنا شروع ہوا تھا گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے نہایت سنجیدگی اور یقین کے ساتھ حکیمانہ انداز

پیشینگوئی کردی تھی کہ پانی سنیچر کے پہلے بند ہو ہی نہیں سکتا۔۔۔۔۔۔ اور ہوا بھی یہی! جب لوگ اتوار کو سو کر اٹھے تو آسمان صاف تھا اور یہ معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی حسین دوشیزہ بڑی التجاؤں کے بعد نقاب اٹھا کر مسکرا رہی ہے

سیتل کئی روز سے بیمار تھا اُس کا ارادہ تھا کہ وہ کشتی نہ کھولے گا لیکن دوشنبہ کے دن اس قدر زیادہ لوگ رسول آباد بازار جانے کو تیار ہوئے کہ اس نے رجونتی کو بلاکر کہا۔ " میرے کوئی بیٹا ہوتا تو آج میں بھی اطمینان سے رہتا۔ آج آمدنی کی بہت امید ہے اور میرے بازوؤں میں دریا کی موجوں سے لڑنے کی قوت نہیں، دو چار کھیوے تو اُس پار پہونچا دے میں آج کل تیرے بیاہ کے لئے کوڑی کوڑی جمع کر رہا ہوں " رجونتی نے سر جھکا لیا اور چلی گئی اس نے ایک منٹ وقت بھی ضایع نہ کیا، باپ کے لئے تھوڑا بہت کھانا تیار کرکے وہ گھاٹ کی طرف روانہ ہو گئی

رجونتی کو بانسری بجانے سے بڑا اُنس تھا، اور اُس کی فرصت کے لمحے اسی مشغلہ میں صرف ہوتے تھے، بانسری اس کی زندگی کا ایک جزو بن گئی تھی، وہ اکثر شام کے وقت سئی کی رنگین لہروں پر اپنی کشتی تیرا دیتی اور بانسری کی نغموں سے شام کی غمگینی کو طرب ناک بنا دیتی، ہوا میں سکون ہوتا اور کشتی کے ہلکے ہلکے ہچکولوں سے دریا میں چھوٹی چھوٹی موجیں اٹھتی تھیں تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ رجونتی کے گیت سطح آب پر رقص کر رہے ہیں، اندھیری رات میں موسم گرما شب ماہ میں اکثر مشتاق کان رجونتی کے گیتوں سے مخطوط ہوتے تھے، سرجو بھی کبھی کبھی کشتی میں بیٹھ کر اُسی وقت دریا میں تفریحاً نکلتا تھا اور اکثر دبی زبان سے یہ بھی کہہ دیتا تھا

" رجون! ہمیں تمہارے گیت بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں " اس جملہ میں نہ جانے کس قدر ہمت افزا اثر ہوتا کہ رجونتی اور زیادہ انہماک سے بانسری بجاتی اور اپنے سب سے زیادہ مسحور کن گیت گاتی

باپ کے کہنے کے مطابق رجونتی نے کشتی کھولی اور بہت سے لوگوں کو رسول آباد پہونچا آئی جب تک لوگ بازار کی خرید و فروخت میں مشغول تھے رجونتی اپنی کشتی میں بیٹھی ہوئی اُس کا پانی جو تختوں کے اندر سے آگیا تھا نکال کر باہر پھینکتی رہی، سئی ندی سے ایک نالا نکل کر گاؤں کے اندر ہی کچھ دور تک چلا گیا تھا، اُسی پر ایک پُل بنا ہوا تھا جس پر شام کے وقت لوگ تفریح کی غرض سے آتے تھے، بازار کی مشغولیت کی وجہ سے سوا دو چار بچوں اور لڑکوں کے پُل پر کوئی نہ تھا کہ یکایک کسی چیز کے پانی میں گرنے کی آواز آئی، بازار میں کافی شور و غل تھا اور یہ آواز کسی کو اپنی جانب توجہ نہ کرسکی، چھوٹے لڑکوں نے شور مچانا شروع کیا کچھ لوگ دوڑ پڑے لیکن سب سے پہلے جو شخص دریا کے بہاؤ میں تیرتا ہوا نظر آیا وہ ایک عورت تھی۔ برسات کی وجہ سے نالے میں بہت زور تھا۔ لیکن رجونتی نے کچھ

ہی دُور بہ لڑکے کو پانی کی متلاطم موجوں سے چھڑا لیا اور اطمینان سے پیرتی ہوئی کنارے پہونچ آئی

بچے کے پانی میں گرنے کی خبر بات کی بات میں رسول آباد کے گوشے گوشے میں گونج گئی، پردہ نشین ماؤں نے گھر کے اندر اور دروازوں کی آڑ سے اپنے بچوں کا جائزہ لیا، باہر نکلنے والی عورتیں چشم زدن میں پُل پر جمع ہوگئیں، لڑکے کا باپ مہادیو اور بڑا بھائی کوشل بھی پہونچ گئے۔ لڑکے کی حالت خطرناک نہ تھی صرف غشی طاری تھی جو دو تین دیہاتی ترکیبوں سے جاتی رہی۔ جب بچے کی حیات کی طرف سے اطمینان ہوگیا تو لوگ رجونتی کی طرف مخاطب ہوئے۔ وہ ایک سیاہ ساری میں لپٹی ہوئی خاموش کھڑی تھی۔ اس کے سیاہ بال حسین چہرے پر بکھرے تھے، اس کا لباس پانی میں تر ہو کر اُس کے جسم سے لپٹ گیا تھا اور اُس کے تناسب اعضاء کو اور نمایاں کر رہا تھا۔ سا بازار لوٹ پڑا تھا اور سب اسی کو دیکھ رہے تھے، وہ ساکت کھڑی تھی۔ اور سیکڑوں نگاہیں استفسارانہ انداز میں اُس پر پڑ رہی تھیں، لوگوں کے دو چار سوالات کا جواب دیکر رجونتی اپنی کشتی کی طرف چل دی، مجمع کا [illegible] حصہ اس کے ساتھ ساتھ وہاں تک بھی گیا، اس نے اپنی ساری کا پلو نچوڑا اور کشتی میں لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بن کر بیٹھ گئی، اُس کی شہرت میں اضافہ ہوگیا، کسی نے اس کی ہمت کی تعریف کی، کسی نے اس کی قوت کو سراہا، کسی نے اس کی پیراکی پسند کی، لیکن ان سب سے زیادہ لطیف اور مؤثر وہ ادا تھی جس کی دیکھنے والی [illegible] نگاہ اور جس سے متاثر ہونے والا ایک ہی دل تھا

ہر ایک نے رجونتی کو اس لئے دیکھا کہ وہ عورت ہو کر اس قدر ہمت دکھا سکی لیکن کوشل نے اُسے اس لئے دیکھا کہ اس کی نگاہوں نے حُسن و نسائیت کا اتنا مکمل امتزاج کبھی نہ دیکھا تھا۔ لوگوں نے اُسے غیر کی نگاہوں سے دیکھا لیکن کوشل نے اُسے اپنی نگاہوں میں جذب کر لینے کے لئے دیکھا، لوگوں نے اسے ظاہری نگاہوں سے دیکھا اور شام ہونے کے پہلے ہی چلے گئے لیکن کوشل دریا کے کنارے پر کھڑا ہوا کشتی کے چلے جانے کے بعد تک اسے دیکھتا رہا، دیکھنے والوں نے دو گھنٹے بعد اُسے بھلا دینے کے لئے دیکھا تھا لیکن کوشل نے اُسے ہمیشہ یاد رکھنے کے لئے دیکھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رجونتی نے آفتاب کے غروب ہوتے ہوتے اپنے تمام گاہکوں کو اس پار پہونچا دیا اور ساری کمائی بیمار باپ کے ہاتھ میں لا کر ڈال دی

کوشل بنارس ہندو یونیورسٹی کا ایم۔ اے کا طالبعلم تھا، صحت کے لحاظ سے وہ ہمیشہ کمزور اور نازک رہا، محنت کی وجہ سے اس کی تندرستی خراب ہوگئی تھی۔ اور ڈاکٹروں نے ایک سال تک سلسلۂ تعلیم بالکل منقطع کر دینے کی رائے دی تھی، مکان پر رہ کر کوشل کی صحت درست ہونے لگی تھی۔ اب وہ روزانہ شام کو اُس طرف ٹہلنے جاتا جس طرف سے رجونتی کے آنے کی اُمید ہوتی، یوں تو کبھی کبھی لیکن دوشنبہ اور جمعہ کو اکثر رجونتی کشتی لے کر

رسول آباد آتی تھی، کوشل اُسے جس قدر بھی دیکھ سکتا تھا دیکھا کرتا، اُس کی خاموش محبت کوئلے کے نیچے دبی ہوئی چنگاری کی طرح اس کے سارے وجود پر چھائی جا رہی تھی اور وہ وقت قریب تھا جب محبت کے شعلے بھڑک کر کوشل کو جلا دیں

رجونتی جب بانسری بجاتی اور اپنے محبت سے بھرے ہوئے نغمے چھیڑتی تو وہ خود تصور میں کسی ایسی ہستی کو ڈھونڈھتی جس پر پریم سے بھرے ہوئے گیت صادق آئیں۔ جب وہ سرجو کے پسندیدہ گیت گاتی تو تنہائی میں بھی سرجو کی حریص نگاہیں اپنی آنکھوں سے ملتے ہوئے دیکھتی تھی، ادھر جب سے کوشل بار بار اُسے نظر آیا تھا اُسے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے تمام گیت اُسی کے حضور میں پیش کر رہی ہے

ایک روز رجونتی اپنی ذاتی ضرورت سے کشتی لے کر رسول آباد آئی، کوشل حسب معمول آج بھی منتظر تھا، محبت میں عزائم کی تیاری اور شکست، منصوبوں کا بندھنا، ٹوٹ جانا، تاویلات کا قائم ہونا اور مٹ جانا معمولی باتیں ہیں، جب تک محبوب نگاہوں کے سامنے ہے۔ اُس وقت تک دل، دماغ اور آنکھیں سب محو نظارہ ہیں، لیکن وہ نگاہوں سے اوجھل ہوا اور دل و دماغ فکر میں مشغول ہوئے، کوشل نے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ رجونتی کی کشتی میں بیٹھ کر تھوڑی دیر دریا کی تفریح کرے۔ لیکن اُسے کوئی قوت روکتی نظر آتی تھی، آج جبکہ بالکل سناٹا تھا کوشل ہمت کر کے ساحل آب کی طرف اضطراری طور پر بڑھا، قریب پہونچ کر ٹھہر گیا، جب تک جونتی کشتی باندھتی رہی وہ اپنے جملے درست کرتا رہا جن کے ذریعہ سے وہ رجونتی سے مخاطب ہوگا، رجونتی کشتی باندھ کر کوشل سے ایک گز کے فاصلہ سے گذر گئی اور کوشل ایک بت کی طرح کھڑا رہ گیا، جب رجونتی بازار کی گلیوں کے پیچ و خم میں غائب ہو گئی اس وقت کوشل نے مُڑ کر جانے والی کی طرف نگاہ کی

مایوسی کا انتظار تکلیف دہ ہوتا ہے اور امیدوں کا انتظار ایک شیریں خواب کی طرح پُر کیف، کوشل کو اطمینان سا تھا کہ رجونتی ابھی واپس آئے گی، اس لئے اس کے جذبات کی کوئی حد نہ تھی، وہ دریا میں اٹھتی ہوئی لہروں کو اپنے خیالات کے مدوجزر کے مقابلہ میں ہیچ سمجھ رہا تھا۔ . . . . دُور سے رجونتی آتی ہوئی نظر آئی اور کوشل کے تمام منتشر خیالات سمٹ کر صرف اس آرزو میں تبدیل ہوگئے کہ رجونتی کے ساتھ دریا کی سیر کرلے، وہ آئی اور کشتی میں بیٹھ گئی، ڈانڈ اٹھا کر چلنا ہی چاہتی تھی کہ کوشل کی تمنا اضطراری طور پر اُلجھے ہوئے الفاظ میں یوں نکل گئی۔ ” میں بھی چلوں گا “ بعض اوقات الفاظ احساساتِ عشق کے اظہار سے بالکل قاصر ہوتے ہیں محبت کی زبان ہی کچھ اور ہے اس کا راز گفتگو سے زیادہ خاموشی میں ظاہر ہوتا ہے پھر بھی رجونتی نے کوشل کا مقصد پالیا، اُس نے ڈانڈ ہاتھ سے رکھ دیا کشتی سے اُتر کر ساحل پر آگئی اور ایک طرف سر جھکا کر کھڑی ہوگئی کوشل بغیر کچھ کہے ہوئے کشتی میں سوار ہوگیا اس کے بعد رجونتی بھی آئی اور کشتی ایک طرف روانہ ہوئی،

ہوا مخالف چل رہی تھی اور کچھ عرصہ سے تند و تیز بھی ہوگئی تھی لہٰذا رجونتی کی زیادہ تر توجہ اُسی جانب تھی، اس کا چہرہ بار بار سُرخ ہو جاتا تھا، ہوا اس کے بالوں کو منہ پر لاکر منتشر کر دیتی تھی۔ اور اس کی ساری کا آنچل بار بار سر سے ڈھلک جاتا تھا۔ کوشل دیکھ رہا تھا اور مست رہا تھا، وہ چاہتا تھا کہ رجونتی کو کسی طرح یقین آجائے کہ وہ اس کی پرستش کرتا ہے اور پھر اس کے بعد کشتی دریا کی لہروں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے تاکہ پھر محبت میں ناکامی کی کوئی امید ہی باقی نہ رہے۔ اس نے آہستہ آہستہ گفتگو شروع کی، گذشتہ بارش کے متعلق اظہار خیالات ہوتا رہا، فصل اور زراعت کے متعلق بات چیت ہوتی رہی اور وہی کوشل جسے فلسفہ کی کاہش میں اور نفسیات کی کتابوں کے سوا کوئی بات ہی پسند نہ آتی تھی۔ آج رجونتی سے دیہات کی معمولی باتوں پر زیادہ جوش اور مسرت کے ساتھ محوِ گفتگو تھا، وہ اس وقت محبت میں گم ہوکر خود کو تمام خیالات سے بیگانہ بنائے ہوئے تھا، اپنے بھائی کے بچائے جانے پر اُسے اب تک اظہارِ شکر کا موقعہ نہ ملا تھا۔ اس نے جی کھول کر شکریہ ادا کیا، اظہارِ قبولیت میں رجونتی کی جھکی ہوئی آنکھیں اور زیادہ ہیجان پیدا کر رہی تھیں، اگرچہ کہنے کی ضرورت نہ تھی لیکن کوشل نے کہدیا کہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں صرف اس لئے نہیں کہ تو خوبصورت ہے بلکہ اس لئے کہ تو صحیح معنوں میں عورت ہے، رجونتی کے خیالات کے عمق کا پتہ کون لگا سکتا ہے لیکن اس کی قوت گھٹتی ہوئی۔ اور کشتی دریا کے چڑھاؤ پر رکتی ہوئی نظر آئی تھی، ایک طرف امواج آب میں تلاطم تھا دوسری طرف کوشل اور رجونتی کے سینہ کی لہریں ضبط اور صبر کا باندھ توڑ کر باہر نکلی جا رہی تھیں، اظہارِ محبت کے لئے یہی ٹھیک وقت تھا کیونکہ ہر چیز محبت میں ڈوبی ہوئی نظر آرہی تھی، ہر طرف محبت کی بارش ہو رہی تھی رجونتی نے یکایک کشتی رسول آباد کی طرف پھیر دی اور بہت تیز چلانے لگی۔ کوشل نے گھبرا کر پوچھا "کیا واپس چل رہی ہو؟" رجونتی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا "ہاں" کشتی دھارے پر تیزی سے روانہ ہوئی اور وہ وقت جسے کوشل ختم ہوتا ہوا نہ دیکھنا چاہتا تھا اور تیزی سے کٹنے لگا، گھبراہٹ میں کوشل کچھ بات چیت بھی نہ کرسکا۔ رجونتی نے وعدہ کیا کہ وہ اکثر ملا کرے گی۔ کشتی کنارے پر آگئی، کوشل اتر گیا اور جیب میں ہاتھ لے جاکر مزدوری نکالنی چاہی لیکن رجونتی کشتی لے کر کنارے سے دور جا چکی تھی، کوشل نے پکارے پر اس نے صرف مڑکر دیکھا اور بغیر کچھ کہے ہوئے کشن پور چلی گئی

اب کوشل اکثر رجونتی کے ساتھ سطحِ آب پر نظر آتا تھا دن گذرتے جاتے تھے اور دونوں میں محبت کے عہد و پیماں مستحکم ہوتے جاتے تھے ...... رجونتی کی زندگی کا باب محبت قابلِ غور ہے، اُسے سرجو سے عشق تھا۔ اور کوشل سے محبت کرتی تھی، دونوں میں سے کسی ایک کو بھی وہ رنجیدہ دیکھنا نہ چاہتی تھی، اُسے یقین تھا کہ عنقریب اُس کی شادی سرجو سے ہو جائے گی۔ لیکن اس خیال نے کوشل کے التفات میں فرق نہ آنے دیا، وہ سرجو کو اپنا رفیق حیات سمجھتی تھی

اور کوشل کو محبت کئے جانے کے قابل جانتی تھی، لیکن اس نے کبھی یہ غور نہ کیا تھا کہ اگر سرجو اور کوشل ایک ہی وقت میں اس کے قریب ہوئے تو خود اس کی کیا حالت ہوگی یا اُن دونوں کے احساسات کا کیا عالم ہوگا۔ اس کے لئے اُسے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا اور ایک روز جب رجونتی سرجو کے ساتھ سئی ندی کے کنارے پر نہایت محبت سے مچھلیوں وغیرہ کے متعلق گفتگو کر رہی تھی کوشل بھی آگیا، سرجو نے تو اُسی روز کہدیا "رجون، تمھاری بات میرے ساتھ ہو چکی ہے اب تم کسی اور سے اس طرح نہ ملو نہیں تو لوگ کیا کہیں گے" یہ سنکر رجونتی چونک پڑی۔ اور دوسرے روز جب کوشل نے اُسے تنہا پاکر سرجو سے نہ ملنے کے لئے کہا تو رجونتی کے دل پر چوٹ سی لگی، اُسے محبت کرنا تو آتا تھا لیکن محبت کی ان پیچیدگیوں سے ناواقف تھی کہ وہ ایک ہی وقت میں دونوں کو خوش نہیں رکھ سکتی، اس احساس نے اُسے تڑپا دیا لیکن مجبور تھی، دونوں کا دل رکھنے کے لئے اُس نے دونوں سے وعدہ کرلیا

سیتل کی بیماری نے طول پکڑا اُس نے سُنار کو بُلا بھیجا اور رجونتی کی شادی جلد کر دینے پر زور دیا، رجونتی کو سوا اس کے کہ کوشل کو اس خبر سے تکلیف ہوگی اور کوئی رنج نہ تھا، سرجو کے ساتھ شادی ہونا اس کی دیرینہ تمنا تھی، شادی ہوگئی اور رجونتی قریب قریب ایک مہینے تک رسول آباد نہ جا سکی، کوشل اس واقعہ سے بالکل بے خبر تھا اُسے معلوم تھا کہ رجونتی کی شادی سرجو ہی کے ساتھ ہوگی لیکن اس کے اس قدر جلد ہو جانے کا یقین نہ تھا۔ ایک مہینہ بعد رجونتی کشتی لے کر رسول آباد آئی کوشل سے ملاقات ہونے پر رجونتی نے نہایت معصومیت سے اس کا اقرار کرلیا کہ وہ اب سرجو کی ہوگئی ہے، لیکن کوشل کو یہ بھی یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس کی محبت میں کوئی کمی نہیں۔ کوشل اسے اپنی محبت کی ناکامی سمجھ رہا تھا اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے جھلکنے لگے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یکایک اس نے رجونتی کا ہاتھ مضبوط پکڑ لیا اور اُسے گھور کر دیکھنے لگا رجونتی سہم گئی اور اُس نے مسترحم نگاہوں سے کوشل کو دیکھا، ہاتھ کی گرفت ڈھیلی ہوگئی اور آنسوؤں کے وہ قطرے جو اب تک پلکوں پر آکر تھرتھرا رہے تھے گر کر زمین میں جذب ہوگئے۔ ٹھیک اُسی وقت سرجو بھی آگیا اُس نے دونوں کو خوفناک نظروں سے دیکھا لیکن رجونتی کی حالت ہی کچھ عجیب تھی، جس طرح دو موٹر ایک ہی رفتار سے مخالف سمتوں میں گذر جائیں تو دونوں کے درمیان کی گرد اور سوکھی ہوئی پتیاں اپنی جگہ پر کانپ کر ساکت رہ جائیں گی اسی طرح رجونتی دونوں طرف کھنچ رہی تھی لیکن اُس کا سر نیچے سے اوپر نہ ہوتا تھا۔ سرجو نے بڑھکر اس کا بازو تھام لیا اور ندی کی طرف کھینچ لے گیا، کوشل اپنی جگہ پر ایک جسدِ بے روح کی طرح کھڑا رہ گیا، دور پہونچ کر رجونتی نے ایک دفعہ مڑکر اُسے دیکھا اور پھر ایک وفا شعار بیوی کی طرح سرجو کے قدموں میں گر کر رونے لگی

سیتل کا انتقال ہوگیا، باپ کی موت نے رجونتی پر بڑا اثر کیا وہ سُست رہنے لگی، سرجو اب خودکشی سے کر جاتا تھا اس نے رجونتی کو بہت کم تکلیف دی، دونوں کی ازدواجی زندگی نہایت پُرمسرت تھی، اسی اثنا میں کوشل پر مرض کا سخت غلبہ ہوگیا، اس کی کمزوری بہت بڑھ گئی اور ڈاکٹروں کے مشورہ سے وہ کچھ دنوں کے لئے پہاڑ چلا گیا، جب سردی ناقابلِ برداشت ہوگئی تو وہ واپس آیا اور دو چار مہینے اِدھر اُدھر رہ کر پھر منصوری چلا گیا، رسول آباد میں اس کا کوئی ایسا راز دار دوست نہ تھا جس سے رجونتی کے متعلق کچھ معلومات حاصل ہو اس لئے وہ ادہر سے بالکل بے خبر تھا لیکن یہ ضرور ہے کہ کبھی رجونتی کے خیال سے غافل نہیں رہا

کشن پور میں سخت طاعون پھیلا، موت کا شکار ہونے والی ہستیوں میں سب سے زیادہ عبرتناک سرجو کی ذات تھی، اس کی جوانی کی موت نے سارے گاؤں کو صدمہ پہونچایا، رجونتی پر سخت اثر ہوا، اس کا دماغ ماؤف ہوگیا اس نے گاؤں میں رہنا ترک کر دیا اور دن رات سَئی کے کنارے گذارنے لگی، وہ گیت جن سے کسی وقت سرجو پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور بعض اوقات وہ جوشِ محبت میں رجونتی کو سینے سے لگا لیا کرتا تھا...... وہی گیت اب اس کے جنون کو کچھ دیر کے لئے پسِ پشت ڈال دیتی۔ اور وہ تصوّر میں سرجو کے گلے میں باہیں ڈال دیتی جب تھک جاتی تو آہستہ آہستہ کسی سے باتیں کرتی۔ یہی اس کا دن بھر کا مشغلہ تھا، سرجو کے چھوٹے بھائی بہن کبھی کبھی کھانے پینے کے لئے کچھ لاتے تھے۔ اور وہ دوسرے تیسرے دن کچھ کھا لیتی تھی، جب لوگوں نے اُسے گھر میں آکر رہنے پر مجبور کیا تو ایک روز وہ کہیں غائب ہوگئی

کوشل تندرست ہوکر رسول آباد آیا اور سب سے پہلی فرصت میں کشن پور پہونچا۔ رجونتی کے متعلق تو کچھ دریافت نہ کر سکتا تھا لیکن اُس نے لوگوں سے سرجو کا حال دریافت کیا، اُسے مفصل کیفیت معلوم ہوئی، رجونتی کے پاگل ہوکر کہیں غائب ہوجانے کے خیال سے وہ کانپ اٹھا، محبت کی پہلی توہین بھول چکا تھا۔ اور وہ تمنائیں جو کوہستان کی محبت آمیز فضا میں اس کے سینہ میں پیدا ہوئی تھیں یک بیک مُردہ ہوگئیں اُسے خوب معلوم تھا کہ رجونتی سرجو کی ہے لیکن اُس چہرہ پر ایک نظر ڈال لینا ہی کافی تھا

گرمی بھی گذر گئی اور کوشل پھر بنارس واپس ہوا کہ اپنی تعلیم مکمل کرے۔ اُسے محبت کی دنیا میں سنّاٹا نظر آرہا تھا، اُس کی آنکھیں ہر وقت کسی کی جستجو میں سرگرداں رہتی تھیں، جس روز طبیعت زیادہ اُداس ہوتی تھی اُس دن وہ گنگا کے کنارے بیٹھ کر اپنا وقت اُن دنوں کی یادمیں کاٹ دیتا جن میں رجونتی اس کے احساسات محبت کو لطیف سے لطیف تر بنایا کرتی تھی، دریا خوب بڑھا ہوا تھا، کوشل کو اس کی موجوں کی طرح سکون نہ

تھا، وہ کنارے ہی کنارے پر دُور تک چلا گیا، واپس ہونا چاہتا تھا لیکن اس کے قدم آگے ہی کی طرف اٹھ رہے تھے، ...... دُور سے اُسے بانسری کی آواز سُنائی دی، وہ دیوانوں کی طرح بڑھتا چلا گیا اور آواز اُس کے وجود کے ہر ذرّے میں سرایت کر گئی، اب وہ غلطی نہ کر سکتا تھا، یہ رجونتی کی آواز تھی اور اُسی کے گیت! کوشل درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ سے نکل کر رجونتی کے پیچھے آگیا، رجونتی نے مڑ کر دیکھا اور پھر اپنے گیتوں میں منہمک ہوگئی، دو چار آدمی قریب کے کھیتوں میں کام کر رہے تھے لیکن کوئی بھی خاص طور پر رجونتی کی طرف متوجہ نہ تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ عرصہ سے اس کو اسی حال میں دیکھ رہے ہیں۔ کوشل نے خوشی اور تعجب سے ملی ہوئی آواز میں "رجونتی" کو آواز دی رجونتی پر کوئی اثر نہ ہوا، کوشل بیٹھ گیا اور پوچھنے لگا "مجھ کو نہیں پہچانتی ہو" رجونتی میں نے تجھ کو کہاں کہاں ڈھونڈھا" رجونتی نے کہا "پہچانتی کیوں نہیں" کوشل کی اُمیدیں بیدار ہونے لگیں اُس نے پوچھا "اچھا بتاؤ میرا نام کیا ہے؟"

"میں نہیں جانتی، نہیں، نہیں، میں نہیں جانتی" رجونتی نے چیخ کر کہا کوشل گھبرا گیا اور کہنے لگا "رجونتی کیا کوشل کو بھلا دیا؟" رجونتی بہت زور سے ہنسی اُس کے قہقہے میں دردناک ترنم تھا۔ اس نے کہا "کوشل! کوشل بھی مرگیا اور سرجو بھی ــــ دونوں ــــ ہاں کوشل بھی سرجو بھی ــ کوشل اور سرجو"

"رجونتی مجھے پہچان میں کوشل ہوں!"

"نہیں نہیں جھوٹ ہے۔ کوشل اور سرجو دونوں وہ ہیں" اُس نے پانی کی طرف اشارہ کیا۔ اور فوراً دریا کی موجوں سے ہم آغوش ہوگئی، کوشل بھی فوراً ہی کو دپڑا لیکن گنگا کی لہریں اُسے دُور بہالے گئیں، لوگ دوڑے اور بڑی کوششوں سے دونوں کو نکالا رجونتی سرجو سے مل چکی تھی اور کوشل بیہوش تھا

کوشل اب بیمار اور سُست رہتا ہے اور گنگا کی پرستش صرف اس لئے کرتا ہے کہ رجونتی اُس کی گود میں ہے

احتشام (رضوی)

انسان کی لازوال عظمت

"جب میں آکاش پر غور کرتا ہوں جو تیری قدرت کی کاریگری ہے، اور جب چاند اور ستاروں پر نظر ڈالتا ہوں جو تو نے منظم کئے ہیں، تو سوچتا ہوں کہ انسان کیا ہے جو تجھے اس کا خیال ہو، اور ابن آدم کیا ہے جو تو اس کو باریابی بخشے،

تاہم تو نے اس کو اپنے سے دوسرے درجہ پر فائز کیا ہے، اور اس کو عزت و فضیلت سے سرفراز فرمایا ہے" (انجیل، حمد ۸ : ۳ : ۵)

قدیم عبرانی حمد کی یہ پاکیزہ شاعرانہ عبارت انسان کی بے بضاعتی اور نیز اُس کی عظمت کا خیال نہایت واضح الفاظ میں ظاہر کر رہی ہے۔ جب انسان رات کے وقت عالم بالا کی حیرت انگیز اور لامتناہی وسعت پر نظر ڈالتا ہے اور اس فضائے بسیط میں چاند اور ستاروں کو اس شان و شوکت کے ساتھ درخشاں دیکھتا ہے تو اس پر اپنی بے بضاعتی اور مناظر فطرت کے رعب و جلال کی ایسی کیفیت ... طاری ہو جاتی ہے کہ بے ساختہ اپنے عجز و نیاز کا اس طرح اقرار کرتا ہے۔ " انسان جو ایک ذرۂ بے مقدار ہے اس کا تجکو کیوں خیال ہو، اور تو کیوں ابن آدم کو باریابی بخشے" یہ اُس کا جذبۂ اوّلین ہے، لیکن اس کے بعد ہی کوئی چیز اس کو اپنی طرف کھینچتی ہے جس سے اس کی یہ ظاہری بے بضاعتی اور کم مائگی ستاروں کی عظمت سے بھی زیادہ معلوم ہونے لگتی ہے اور وہ اس طرح اپنے خیال کا اظہار کرتا ہے " تاہم تو نے اُس کو اپنے سے دوسرے درجہ پر فائز کیا ہے، اور اس کو عزت و فضیلت سے سرفراز فرمایا ہے"

قدرت کی عظمت اور بالخصوص عالم بالا کی غیر محدود وسعت اور شان و شوکت کے مقابلہ میں انسان کی بے بضاعتی کا خیال ہر زمانہ میں زبان زد خلایق رہا ہے اور آج بھی ہے۔ آج جبکہ فلکیات کے متعلق جدید انکشافات نے فضائے بسیط کی وسعت و عظمت میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے جس کا عہد عتیق کے مفکرین تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اسوقت سے انسان کی بے بضاعتی اور زیادہ متوثق ہو گئی ہے

جس وقت قدیم عبرانی مصنف نے آسمان کی طرف نظر اُٹھائی تو کیا دیکھا ؟ ایک وسیع فضا جس کو وہ آسمان کہتا تھا، جو خیمہ کی طرح زمین پر چھایا ہوا تھا جس میں سورج، چاند اور ستارے کسی پُر اسرار طریقہ سے جڑے ہوئے تھے، جن کی

علت غائی صرف یہ تھی کہ وہ انسان کو موسموں کی تبدیلی کے نشانات بتلائیں اور زمین کو روشنی دیں، سب زمین کے چاروں طرف گھومتے تھے، اور زمین کے مقابلہ میں بہت ہی چھوٹے تھے اور عبرانی مفکر کے علم میں زمین کائنات کی سب سے بڑی چیز تھی اور وہ بھی اس کے تصوّر کے مطابق ہماری آج کی زمین کے مقابلہ میں بہت ہی محدود تھی

علم ہیئت کی جدید ترقی نے ان تمام خیالات میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے - کیونکہ نہ تو وہ اجرام فلکی کا مرکز ہے اور نہ کائنات میں سب سے بڑی چیز ہے بلکہ برعکس اس کے جسامت کے اعتبار سے موجودات میں اس کی نسبتی حیثیت ایک ذرہ سے زیادہ نہیں۔ خاموش پُراسرار اور تغیر پذیر چاند ایک زرد آسمانی چراغ کے بجائے کرۂ میں تبدیل ہوگیا، سورج زمین کے چاروں طرف گردش کرنے کی بجائے قایم ہوگیا اور زمین معہ دیگر سیاروں کے اُس کے گرد گھومنے لگی، ستارے مشعل شب کی بجائے عظیم الجثہ کرؤں میں تبدیل ہوگئے جن کے گرد بڑی بڑی دنیائیں چکر لگا رہی ہیں - اگرچہ خود ہمارے نظام شمسی کی وسعت بھی کچھ کم نہیں ہے لیکن وہ بھی خلاء کے ایک قلیل ترین گوشہ میں واقع ہے جبکہ اُس کے گرد و پیش لاتعداد اور لامحدود نظام شمسی پھیلے ہوئے ہیں

پھر اگر دنیائے قدیم کے انسان کو اپنی اُس قلیل کائنات کے مقابلہ میں اپنی بے بضاعتی اور عجز کا اقرار تھا تو دُنیائے جدید کے انسان کے بارہ میں کیا کہا جا سکتا ہے جو جدید علم ہیئت کی ظاہر کردہ کائنات کے درمیان رہتا ہے اور جس کو قدیم عبرانی کائنات سے وہی نسبت ہے جو آفتاب کو ذرہ سے ہے

پھر جس طرح اس عہد میں انسان اپنی بے بضاعتی کا احساس کرتا تھا بالکل اسی طرح آج بھی وہ سوال کرسکتا ہے کہ کیا لا متناہی کائنات خالق اور ان تمام ستاروں اور کہکشاؤں کا تعمیر کنندہ انسان کی پرواہ کرتا ہے! کیا اس بات کے فرض کرنے کی کوئی معقول وجہ ہے کہ خدا کے نزدیک ہماری ننھی ننھی جانیں قطرۂ شبنم یا حباب دریا سے زیادہ وقیع اہم اور مفید ہیں

میں سمجھتا ہوں کہ ہم میں سے ہر ایک کو اس قسم کا تجربہ ہوا ہوگا۔ آپ آدمیوں کی ایک بڑی جماعت کے درمیان سے گذرتے ہیں جن میں سے آپ نے نہ تو پہلے کسی کو دیکھا ہے اور نہ آیندہ دیکھنے کی توقع ہے۔ آپ اپنے سے سوال کرتے ہیں کہ یہ کون لوگ ہیں اور ان کی زندگی کا کیا مقصد ہے اور یہ کھیتوں پر اڑنے والے پرندوں کے گروہ سے یا دھوپ میں مجتمع ہونے والے جراثیم سے کس بات میں ممتاز ہیں؟ اگر کرۂ قمر سے جو دوسرے کرؤں کے مقابلہ میں دنیا سے سب سے زیادہ نزدیک ہے خواہ کتنی ہی طاقت کی دُور بین لگا کر باشندگان زمیں کو دیکھا جائے۔ تو کوئی بھی نظر نہیں آسکتا اور یہ فاصلہ پرند، جراثیم اور انسان سب کو مساوی القامت بنا دیتا ہے

آپ کسی شہر میں ایک بلند مقام سے جہاں تک آپ کی نظر جائے اُن ہزارہا آدمیوں کو دیکھئے جو چاروں طرف پھر رہے ہیں تو وہ آپ کو فرش پر رینگنے والی چیونٹیوں سے زیادہ بڑے نظر نہ آئیں گے۔ اور وہ شہر آپ کو دیمک کا ٹیلہ معلوم

ہوگا۔ اسی طرح سے آپ دوسرے تمام شہروں، قصبوں، اور دیہات کو قیاس کر سکتے ہیں کہ ان میں مختلف الاقسام بستیاں آباد ہیں جو کسی دوسرے کرہ سے نہیں بلکہ اسی کرہ پر صرف چند میل کے فاصلہ سے ناقابل امتیاز ہیں

نسل انسانی کو اپنے ان کارناموں پر بہت بڑا فخر ہے جو اس نے اس دنیا میں کئے ہیں۔ اس کو اپنی زراعت پر، تجارت پر، برّاعظموں کا احاطہ کرنے والی ریلوں پر، سمندروں کو عبور کرنے والے عظیم الشان جہازوں پر، سر بفلک کشیدہ عمارتوں والے شہروں پر، چشم زدن میں گرد زمین خبریں پہونچانے والے لاسلکی پیغامبروں پر اور بلند پرواز طیاروں پر ناز ہے۔ لیکن اگر مریخ اور زہرہ پر آبادی ہے تو وہاں کے کسی باشندہ کو ان تمام باتوں میں سے ایک بات کا بھی علم نہیں۔ پس اس طرح سے ہماری دنیا کے اہم ترین واقعات صرف اہم ہی تک محدود معلوم ہوتے ہیں اور فضائے بسیط میں ہمارے قریب ترین ہمسایوں کو اُن کی پرچھائیں بھی نظر نہیں آتی

پھر اگر ہم ایک ہی نظام کے دیگر اراکین سے اسقدر بے تعلق ہیں کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ نہ تو ان کو معلوم ہوتا ہے اور نہ اُن کے واسطے کوئی اہمیت رکھتا ہے، تو ان تمام دیگر نظاموں کے بارہ میں کیا کہا جا سکتا ہے جو ہمارے مختصر نظام شمسی کے حدود سے باہر یا غیر محدود فاصلوں پر واقع ہیں اور شب تار میں اقصائے عالم کو منور کر دیتے ہیں، اور پھر اس بے نیاز ہستی کے متعلق کیا خیال کیا جا سکتا ہے جو ان سب کا خالق اور حاکم ہے؟ ایسے ایسے اہم اور غیر مختتم انتظام کی موجودگی میں اس خالق اکبر کو انسان جیسی بے ثبات مخلوق کا کیا خیال ہو سکتا ہے جو اس خاکر ینہ پر آباد ہے جس کو دنیا کہتے ہیں اور جو آفرینش کے ایک دُور افتادہ و حقیر گوشہ میں ایک دُھندلے نشان سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی؟ کیا یہ فرض کر لینا حقیقت میں ایک نامناسب خودستائی نہ ہوگی کہ ہم اُس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کرنے کی توقع کر سکتے ہیں! علاوہ بریں کیا ایک ہم جیسی بے وقعت مخلوق کے لئے موت کے بعد ایک حیات ابدی کا خواب دیکھنا ایک بہت بڑا گستاخانہ قیاس نہ ہوگا،

اسی طرح سے علم ہیئت کے جدید انکشافات بہت سے دماغوں پر انسان کی ذلت و حقارت کا نقش جما دیتے ہیں اور اس سے قبل انسان کائنات میں جو کچھ اپنی وقعت اور اہمیت سمجھتا تھا اس کا استیصال کر کے اس کی بے بضاعتی اور مایوسی میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کا ہمارے پاس کیا جواب ہے

یہ مسئلہ محض قیاسی نہیں ہے بلکہ بہمہ وجوہ عملی ہے۔ دنیا میں اس قسم کے سوالات آج ہزاروں جگہ پوچھے جاتے ہیں اور ہمارے چاروں طرف پوچھے جا رہے ہیں اور بہت سے ذی فہم اور سنجیدہ لوگ ان کا جواب دینے سے قاصر ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سی زندگیاں حقیقتاً تاریک ہو جاتی ہیں۔ اور کیا در حقیقت خود ہم میں سے بعض لوگوں پر ایسے لمحے نہ گذرے ہوں گے۔ جب اس قسم کے خیالات ان پر مسلط ہوئے ہوں۔ اس لئے ہمیں اس تاریک پردہ کو اٹھا کر حقیقت کے چہرے کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

اس مسئلہ پر کئی پہلوؤں سے روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔ اوّل یہ کہ کسی چیز کی اہمیت کا دارمدار محض جسامت پر نہیں ہوتا۔ ہماری دنیا کسی دوسری لاکھوں گنی بڑی دنیا سے لازمی طور پر اہمیت میں کسی طرح کم خیال نہیں کی جاسکتی اور انسان بھی محض اپنی جسمانی قلت کے باعث مادی حیثیت سے بھی لازمی طور پر غیراہم تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ہاتھی انسان سے بہ لحاظ جسامت کے بہت بڑا ہے لیکن اس کی جسمانی حیثیت اس کی اہمیت اور وقعت کو نہیں بڑھاتی دنیا کے بہت سے چھوٹے چھوٹے ممالک اپنے سے سیکڑوں گنا بڑے ملکوں سے اہمیت اور وقعت میں کہیں زیادہ ہیں ہزارہا ریگستانوں کے مقابلہ میں یونان کا چھوٹا سا ملک زیادہ وقیع ہے۔ اور لندن جو روئے زمین پر ایک خال کی مانند ہے قطبین کے ایک درجن برِاعظموں سے افضل ہے۔ ایک تنہا افلاطون، یا شکسپیر، یا یسوع، یا بودھ دنیا کی تاریخ میں افریقہ کی تمام وحشی نسلوں سے اسی طرح زیادہ قابل قدر ہے جس طرح ایک ہیرے کا ٹکڑا ایک کوہ پیکر تودۂ خاک سے زیادہ قیمتی ہے۔ اسی طرح مختلف دنیاؤں کا موازنہ کرنے میں یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ چھوٹی دنیا بڑی دنیا سے بدرجہا زیادہ ترقی یافتہ ہو۔ ہمارا سورج باعتبار مادیت زمین سے تین لاکھ سولہ ہزار گناہ زیادہ ہے اور بلحاظ جسامت کے بارہ لاکھ بچاس ہزار گنا بڑا ہے تاہم زمین پر اعلےٰ قسم کی زندگی پائی جاتی ہے جبکہ سورج میں غالباً کسی قسم کی حیات موجود نہیں ہے اور گمان غالب ہے کہ فضائے بسیط میں جس قدر بڑے ثوابت ہیں۔ وہ عام طور پر اپنے سیاروں سے بہت کم ترقی یافتہ ہیں

اس سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ نسل انسانی محض ایک ناچیز کرہ پر آباد ہونے کے باعث لازمی طور پر ناچیز اور غیراہم نہیں ہے۔ کیونکہ ایک ایتھنز جیسے چھوٹے مقام پر رہنے والا انسان محض اس وجہ سے حقیر نہیں سمجھا جاسکتا کہ وہ تاتار جیسے وسیع ملک میں رہنے کی بجائے ایتھنز جیسی چھوٹی جگہ میں رہتا ہے۔ اعلیٰ فطرت والی ممتاز ہستیاں چھ فٹ کے جسم میں بھی اس خوبصورت چھوٹی سی دُنیا پر اسی احسن پیرایہ میں بسر کرسکتی ہیں جس طرح کہ چھ ہزار فٹ کے جسم میں کائنات کے بڑے سے بڑے کرہ پر کرسکتی ہیں

بہرنوع اگر ایک طرف یہ بات مسلم ہے کہ علم ہیئت کی موجودہ تحقیقات انسان کو ایک مورِ ضعیف ثابت کررہی ہے تو دوسری طرف اس بات کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ طبیعیات کے دیگر اکتشافات کا فیصلہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ سطح انسانی سے نیچے ایک اور مکمل اور منظم کائنات معرض ظہور میں آرہی ہے۔ جو کائنات بالائی سے کسیطرح کم حیرت انگیز نہیں ہے، اسلئے اگر ایک علمی تحقیقات نے انسان کا رتبہ کم کردیا ہے تو دوسری علمی تحقیقات نے اسکو اسی قدر بلکہ اس سے بھی زیادہ کردیا ہے۔ پس اسطرح سے دُوربین نے انسان کی قدرومنزلت میں جو کچھ کمی پیدا کردی تھی خوردبین نے اسکا ازالہ کردیا۔ تحت الانسان کائنات کی ترتیب وعظمت کے متعلق بعض حقایق کا انکشاف دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اگر موسم گرما میں ایک تیتری کو پکڑلیں تو اُس کے پَروں سے ایسے ذرات چھوٹ کر ہمارے ہاتھ پر لگے رہ جائیں گے

جن کو ہم معمولی خاکریزوں سے تعبیر کریں گے اور چشم عریاں سے نہایت غور کے ساتھ مشاہدہ کرنے کے بعد بھی ہم ان کو خاکی ذرات سے متمیز نہ کرسکیں گے۔ لیکن اگر ہم ایک خوردبین سے اُن کا معائنہ کریں تو عجیب و غریب مناظر دکھائی دیں گے اب ہم کو یہ معلوم ہوگا کہ وہی خاکریزے مختلف الالوان واوضاع پردوں سے ایسے مکمل نظام کے ساتھ منظم ہیں جیسے کسی رند کے پر ہوتے ہیں اور اس قدر چھوٹے.... کہ ایک مربع انچ میں ایک لاکھ آسکتے ہیں

ایک قطرہ آب کی کیا بضاعت ہے لیکن یہی قطرۂ آب ایک جداگانہ دنیا ہے۔ ایک مکعب انچ آب ساکن میں قریب دس ارب کے متحرک اور زندہ مخلوق پائی جاتی ہے۔ نیویارک کے ایک ممتاز ماہر علم الحیات کا بیان ہے کہ "میں نے تھوڑا سا ارنڈی کا صاف اور جوشیدہ پانی ایک شفاف شیشی میں بھر کر پرے کے برش کے چند بال توڑ کر اس میں ڈال دیے، چار روز کے بعد شیشی بے شمار اور ناقابل تجزیہ زندہ مخلوق سے بھر گئی اور بلاخوف تردید یہ دعوےٰ کیا جا سکتا ہے کہ دو آونس کی شیشی میں اُن کا شمار اُن تمام انسانوں کی مجموعی تعداد سے زیادہ تھا جو زمانۂ آدم سے اس وقت تک پیدا ہوچکے ہیں"

اہرنبرگ ایک مشہور جرمن ماہر حیاتیات کا قول ہے کہ بوہیمیا میں آٹھ فٹ کی گہرائی تک چالیس مربع میل میں سلیٹ کا ذخیرہ موجود ہے جس کے ہر ایک مکعب انچ میں خوردبینی پیمائش کے ذریعہ سے اکتالیس ارب کا پسماندہ دریافت کیا گیا ہے۔ جہاں چشم عریاں کو حیات کے آثار تک نظر نہیں آتے وہاں خوردبین کے ذریعہ سے نئی نئی دنیائیں آباد معلوم ہوتی ہیں۔ جہاں کل تک ایک ذی حیات بھی موجود نہ مانا جاتا تھا وہاں آج جدید سائنس نے ایسے حیرت انگیز عالم حیات پیش نظر کردیے جیسے دُوربین کے ذریعہ سے فضائے بسیط میں نظر آتے ہیں، اور جن میں انسان سے اسی قدر چھوٹی مخلوق آباد ہے جس قدر انسان ان اجرام فلکی سے چھوٹا ہے

درخت ایک کائنات ہے اور برگ درخت اس کی ایک دنیا ہے۔ آپ کی عریاں اور غیر مانوس آنکھ کچھ نہیں دیکھ سکتی، لیکن اگر آپ ایک خردبین لیکر کسی ماہر طبیعیات کو اپنا رہبر بنائیں تو وہ آپ کی آنکھوں سے حجاب اٹھاکر ایسے ایسے عجیب و غریب رازہائے سربستہ کو بے نقاب کردے گا کہ آپ کو اپنے گردوپیش کھلے ہوئے دروازے نظر آئیں گے۔ جن میں داخل ہوکر آپ قدم قدم پر ایسی ہی لاانتہا اور تعجب خیز چھوٹی چھوٹی دنیائیں مشاہدہ کریں گے جیسی کہ دوربین کے ذریعہ سے فضائے بسیط میں نظر آتی ہیں

خود انسان کا جسم بھی ایک کائنات ہے۔ انسانی خون کے ہر قطرہ میں دو کروڑ سے زیادہ جراثیم حیات پائی جاتی ہیں۔ اس طرح سے تمام قطرہائے خون ملاکر انسان ایک کائنات ہے اور اس کی شرائیں کہکشاں ہیں جن کے حلقوں میں ان سیارہائے احمر کے گردہ اپنے غیر مختتم دور لگا رہے ہیں

الغرض اگر ہم انسان کی روحانی حیثیت سے بھی کوئی سروکار نہ رکھیں اور اس کو محض ایک کرم ماہی ہی تصور

کریں تب بھی وہ خدا کی مخلوق میں درجۂ متوسط کا مستحق ہے۔ اگر بالائے انسان اُس سے بدرجہا بڑے عالم، نظام اور کہکشاں موجود ہیں تو زیریں انسان اور اندرونی انسان میں بھی اس سے بدرجہا چھوٹے عالم، نظام اور کہکشاں موجود ہیں اگر ایک طرف فضائے بسیط کی بے پایانی اس کی وقعت کو گھٹاتی ہے تو دوسری طرف برگ درخت، قطرۂ خون اور خود اس کے مادۂ ترکیبی کی لاانتہائی اس کی منزلت کو بڑھاتی ہے۔ اس لئے اگر کوئی جسامت کی بنا پر ہماری تحقیر کرے اور انجم زار آسمان کی طرف اشارہ کرکے یوں طعنہ زن ہو کہ کیا آپ کا یہ اعتقاد ہے کہ ان بعید از شمار دنیاؤں کا خدا آپ کی پرواہ کرتا ہے تو ہم اس کو ایک قطرۂ آب کے کروروں کیڑوں کی طرف اشارہ کرکے یہ جواب دے سکتے ہیں کہ وہ خدا جو ان کو فراموش نہیں کرتا ہم کو کیونکر فراموش کر سکتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ انسان کی حقیقی عظمت مادی لحاظ سے نہیں ہے بلکہ روحانی اعتبار سے ہے۔ انسان کی جو کچھ وقعت ہے۔ وہ اس کے دماغ کی وجہ سے ہے نہ کہ جسم کی وجہ سے، اس لئے اگر اس کے رہنے کی دنیا چھوٹی ہے تو کیا اور بڑی ہے تو کیا۔ کیا ایک مادی عرض وطول سے محدود کوہ تمثال تودۂ خاک ایک عرض وطول سے مبرا اور مادی حدود سے منزہ نفس کا مقابلہ کر سکتا ہے ؟ کیا مادہ کے ایک سر بفلک کشیدہ ڈھیر کے مقابلہ میں روح محجوب و سرنگوں ہو سکتی ہے ؟ کیا ایک پہاڑ کو خیال سے بڑا کہہ سکتے ہیں ؟ کیا ایک بڑے سے بڑا سمندر اس انسانی دماغ پر تفوق حاصل کر سکتا ہے جو اس کو اپنے تصور میں محصور کر لیتا ہے، اس کو شاہروں میں منتقل کر دیتا ہے، اس کے ایک کنارہ سے دوسرے کنارہ پر اس طرح پر گفتگو کر سکتا ہے گویا کہ اس کے ہزارہا میل محض چند انچوں کے برابر ہیں، اور اس کی خوفناک ترین لہروں کو اپنا غلام بنا لیتا ہے ؟ اور کیا وہ تمام دوربین سے ظاہر کی ہوئی غیر شعوری دنیائیں ایک شعوری دماغ کے مقابلہ میں کوئی حیثیت رکھ سکتی ہیں ؟

فلکیات جدیدہ کے انکشافات اجرام فلکی کے درمیان اس دنیا کی قدیم اہمیت کو خواہ کتنا ہی گھٹا دیں لیکن وہ اس وقت تک انسان کی عظمت کو کوئی ٹھیس نہیں لگا سکتے جب تک اُس میں قوتِ شعور موجود ہے۔ انسان کی عظمت اس کی فطرت میں ودیعت کی ہوئی طاقت کی بدولت ہے۔ اس لئے وہ سائنس کی تمام امکانی مادی تحقیقاتوں سے غیر متاثر ہے وہ محض اس لئے بڑا ہے کہ وہ جان سکتا ہے، استنباط کر سکتا ہے، حق و باطل میں تمیز کر سکتا ہے، امید کر سکتا ہے محبت کر سکتا ہے عبادت کر سکتا ہے اور یہ چیزیں وہ اس لئے کر سکتا ہے کہ وہ روح ہے۔ لیکن دُوربین کی ظاہر کی ہوئی بڑی سے بڑی دنیا محض ایک تودۂ مادی ہونے کے باعث ان میں سے ایک کام بھی کرنے سے ایسی ہی معذور ہے جیسے کہ ایک ہوا میں اُڑنے والا حقیر کیڑا یا خاک ریزہ معذور ہے اور اسی سے انسان کی اُس لا تحدود اور لازوال فضیلت کا اندازہ ہو سکتا ہے جو اس کو فضائے بسیط میں عظمت و شان سے چمکنے والے تمام لاتعداد اور عظیم الجثہ کرّوں پر حاصل ہے

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ انسان کا فضائے بسیط میں منتشر ستاروں کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو جانا اس کی حقارت کی

علامت نہیں ہے بلکہ بزرگی کا نشان ہے۔ ایک سنگریزہ یا ایک مٹی کا ڈھیلا کیا حیرت زدہ ہو سکتا ہے محفل ثوابت و بزم سیارگاں کو دیکھ کر ایک وحشی درندہ میں کوئی حِس تک پیدا نہ ہوگی۔ وحشی درندہ اس لئے بے حِس ہے کہ اس میں قوتِ تصور نہیں ہے اور انسان اس لئے حمد و ثنا کرتا ہے کہ وہ جانتا ہے، سمجھتا ہے، محسوس کرتا ہے، اور اس کی لطیف روح عالم قدس کے ساتھ التزام رکھتی ہے۔ دنیا کا تصور دنیا سے بہتر ہے اور ستاروں کا علم ستاروں سے برتر

سورج جسامت میں بہت بڑا ہے اور اُس کی جسامت کے مقابلہ میں زمین بالکل بے حقیقت شے ہے، لیکن اس سے انسان کی حقیقی عظمت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ کیا سورج باوجود اس قد و قامت کے خود اپنی پیمائش کر سکتا ہے اپنا وزن جان سکتا ہے، فضائے بسیط میں اپنے دائرۃ البروج کا اندازہ کر سکتا ہے یا اُن قوانین قدرت میں سے جن کی وہ کورانہ پابندی کر رہا ہے ایک قانون کو بھی سمجھ سکتا ہے، لیکن انسان یہ سب کچھ کر سکتا ہے اور اس لئے وہ باوجود قد و قامت میں چھ فٹ ہونے کے سورج سے بڑا ہے

علم ہیئت ہم کو ستاروں کا بہت کچھ حال بتاتا ہے لیکن کیا ہم کبھی یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ ہم کو اسی قدر انسان کا حال بھی بتلا سکتا ہے۔ انسان کا دماغ یہی نہیں کہ علم الافلاک کی روز افزوں ترقی کا ساتھ دینے کی قابلیت رکھتا ہے بلکہ وہ اس کی ترقی کا سبب ہے۔ اگر سمٰوات خداوند تعالےٰ کی قدرت کے مظاہرات ہیں تو وہ اسی قدر انسانی روح کی عظمت کے بھی نشانات ہیں کیونکہ انسان محض اپنی روحانی فضیلت ہی کے باعث کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں قدرت کے جلوؤں کا مطالعہ کرتا ہے

کائنات کی تخلیقی طاقتیں خیال اور محبت ہیں اور چونکہ انسان ان دونوں صفات سے متصف ہے اس لئے وہ خالق ہے

چیننگ کا قول ہے کہ تمام نفس ایک ہی سلسلہ سے ملحق ہیں۔ اگر یہ حقیقت ہے تو میرا وجود بھی وجودِ حقیقی سے متصل ہے۔ اس قادر مطلق نے میری ہستی کو محض پیدا ہی نہیں کیا ہے بلکہ میرا اس کے ساتھ رشتۂ قرابت ہے کیونکہ میری روح روحِ حقیقی سے مشتق ہے۔ میں بھی اسی طرح جانتا ہوں جس طرح سے وہ جانتا ہے اور اسی طرح سے محبت کرتا ہوں جس طرح سے وہ محبت کرتا ہے، اس لئے مجھے جس طرح اُس "نور السمٰوات والارض" کے مشاہدۂ جمال کا حق حاصل ہے۔ اسی طرح یہ کہنے کا بھی حق حاصل ہے کہ تو میرا حقیقی باپ ہے اور میں کوئی تیری از دست افتادہ چیز نہیں ہوں بلکہ تیرا بچہ ہوں اور تیری برگزیدہ فطرت مجھ میں موجود ہے

انسانی عظمت کے مستحکم ترین ثبوتوں میں سے ایک ثبوت قطعی اور نئے ذریعہ سے حاصل ہوا ہے اور وہ ذریعہ "جدید نظریۂ ارتقاء" ہے۔ اس سے قبل انسان کا خیال بالکل مختلف تھا اور "ارتقاء" ایک خوفناک شے معلوم ہوتا تھا کیونکہ وہ انسان کی پیدائش کو عمل فطرت سے منسلک کرتا تھا اور اس کی موجودہ نو یافتہ ہیئت کذائی

کو ادنیٰ قسم کی حیات سے مستلزم کرتا تھا اور اس لئے وہ تذلیل انسانیت کا باعث سمجھا جاتا تھا، لیکن اب یہ سب باتیں بدل گئی ہیں اور بڑے بڑے ارباب فکر اس حقیقت کو تسلیم کرتے جاتے ہیں کہ نظریۂ ارتقا نے انسان کی عظمت میں غیر محدود اضافہ کردیا ہے - چونکہ انسان لاریب تمام سابقہ مدارج ارتقا کی حد کمال ہے اس لئے وہ اس تمام عمل فطرت کی معقول ترین اور مناسب ترین توجیہہ پیش کرتا ہے - عمل ارتقا اپنی آتشی حالت کی ابتدا سے دور دراز راستے طے کرکے اس منزل پر پہونچا ہے جو آج ہماری پیش نظر ہے لیکن اس نے ہمیشہ آگے ہی کو قدم بڑھایا ہے جس کی معراج انسان ہے - غیر ذی حیات سے ذی حیات تک، ادنیٰ قسم کی حیات سے اعلیٰ قسم کی حیات تک اور حیوان سے انسان تک سلسلہ بسلسلہ گامزن ہوا ہے اور اس طرح انسان آفرینش کی بلند ترین منزل پر پہونچ گیا ہے جو آفرینش کا نصب العین اور منزل مقصود ہے - جس وقت مادی جسم اپنی امکانی حد تک پہونچ گیا اس وقت نفس کی ابتدا ہوئی جس نے اسی وقت سے حکمرانی شروع کردی اور مُدرک انسان کو وہ شرف حاصل ہوا جو صرف مدرک مطلق کی عظمت سے دوسرے درجہ پر ہے

ہمیں اس بات کا علم نہیں ہے کہ کائنات کی دوسری کتنی دنیاؤں میں عمل ارتقا ترقی کی اس منزل پر پہونچ گیا ہے جس پر کہ وہ ہمارے یہاں پہونچا ہے - لیکن اگر کسی جگہ ایسا ہوا ہے تو وہاں بھی اُس نے کسی نہ کسی شکل میں انسان ہی کا روحانی مثنیٰ پیش کیا ہوگا یعنی کوئی اس قسم کی ہستی پیدا کی ہوگی جس میں انسان کی طرح ایسی قوت ادراک وشعور پائی جاتی ہو جو " الٰہی خیالات کو اسی کی طرح خیال کرسکے " جیسا کہ انسان کرسکتا ہے، جو اس جہان میں " عمل ارتقا " کا ویسا ہی شاندار تکملہ ہو جیسا اس جہان میں انسان ہے اور جو بدیں سبب کسی صحیح مفہوم میں وہاں پر خدا کا ایسا ہی ہمشکل اور ہم رشتہ ہو جیسا انسان یہاں پر ہے

اس بنا پر یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ مادۂ اولین کی پہلی حرکت سے لیکر اس وقت تک کائنات کا تمام "عمل ارتقا" اس دنیا میں اور نہ معلوم کتنی اور دنیاؤں میں اسی اُدھیڑ بن میں مصروف رہا کہ انسان یا اُس کا مماثل پیدا کرے پھر اگر کائنات اس تمام " عمل ارتقا " کے مصائب ومصارف برداشت کرنے کے بعد ایسی اعلیٰ فطرت کا انسان بنانے میں کامیاب ہوئی ہے تو کیا اس کا انجام بھی اسی مناسبت سے اعلیٰ اور افضل نہ ہونا چاہیئے اور کیا اس کی حیات بعد الممات عارضی مکان وزماں کی قیود سے آزاد نہ ہونی چاہیئے ؟ کیا ان تمام موجودات کا خالق اکبر اور صانع حقیقی ایسا غیر معقول ہے کہ وہ اپنی کامل ترین مخلوق کو پایۂ تکمیل تک پہونچاتے ہی نیست ونابود کردے گا ؟ اگر انسان الٰہی الاصل ہے اور اعلیٰ الٰہی صفات سے مشرف ہوا ہے تو کیا وہ فنا ہوسکتا ہے اور کیا اس کو ایک ایسی ہی بقا کا وارث نہ ہونا چاہیئے جو بقائے الٰہی کے متوازی ہو ؟

لوگ دوسری دنیاؤں، نظاموں اور ہجوم سیارگاں کو انسان کی تذلیل وتحقیر کے لئے بطور دلیل کے پیش

کرتے ہیں، لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ ادنیٰ اعلیٰ پر سبقت لے جائے ؟ کیا کوئی مادی شے، خواہ وہ جسامت میں کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، روح پر فایق یا النفس پر غالب ہو سکتی ہے ؟

کائنات خدا کا ایک نادر محل ہے - لیکن کیا محل اولاد سے زیادہ قیمتی ہے ؟ کیا کوئی باپ ایسا ہے جس کے پاس ایک ایسا محل ہو جس کی وسعت شمال سے جنوب تک ہو، جس کی چھت کہکشانی نقش و نگار سے منقش ہو اور جس میں لاکھوں آفتاب جگمگا رہے ہوں، اور بے ساختہ نہ پکار اٹھے کہ مجکو اپنا بچہ ان تمام چیزوں سے زیادہ عزیز ہے ؟

اس لئے جب میں تنہا رات کے وقت آسمان کے نیچے چلتا ہوں اور اس چرخ نیلوفری کے محیر العقول اور غیر محدود نقش و نگار کو دیکھتا ہوں تو میں عرش دوام سے یہ آواز آتی ہوئی سنتا ہوں کہ اے وہ انسان جس کو میں نے اپنی ہی شکل پر بنایا ہے - تو میری نظروں میں تمام موجودات سے زیادہ عزیز ہے سورج اور ستاروں کی پیدایش سے بھی قبل میں تجھ سے محبت کرتا تھا، جبکہ تو دور افتادہ مقامات پر آتشی کروں کے گہوارہ میں کھیلتا تھا - میں اس وقت بھی تیرا نگراں تھا، تیرا اور میرا انجام ایک ہے، کبھی تجکو کوئی چیز مجھ سے جدا نہیں کر سکتی - اور جب عالم بالا کی آواز خاموش ہو جاتی ہے تو میں ویسی ہی ایک اور صدائے لاہوتی اپنی روح کے تخنگاہ وجدانی سے آتی ہوئی سنتا ہوں - کہ اے میری زندگی کے مالک خدا میں تجھ پر بھروسہ کرتا ہوں اور میں جس وقت تیرے اس نگارخانۂ قدرت کے خوبصورت دنیوی محل میں داخل ہوا تو تیرے ہی پاس سے آیا، یہاں تو نے مجکو صرف چند سال قیام کی اجازت دی ہے تاکہ میں تیرے ساتھ رہ کر اور تیری امداد سے قدرت کی ان صنعتوں اور نیز اپنی روح ..... کے عجائبات کا مطالعہ کروں، تجربات زندگی حاصل کروں، حتے الوسع اپنے ہم جنسوں کی مدد کروں اور اپنے دیگر فرایض منصبی کو انجام دوں - میں ایسی زمین پر عارضی قیام کے واسطے تیرا شکر گزار ہوں - میں بہت جلد یہاں سے کسی نامعلوم مقام کو روانہ ہو جاؤں گا جس کا تجکو علم ہے - مگر میرے لئے یہی امر باعث تسکین ہے کہ میں جہاں کہیں رہوں گا تیرے ہی ساتھ رہوں گا - موت صرف تیرے غیر محدود مکان کے دوسرے دروازے کھول دے گی - اس لئے مجکو کوئی ہراس نہیں جہاں تو ہے وہ جگہ خوبصورت ہے حتے کہ دوزخ بھی تیرے ساتھ - میرے لئے بہت محفوظ مقام ہے

(جے۔ بی سنڈرلینڈ)

عبد الحفیظ (علیگ) میرٹھ

مکتوبات نیاز

آرام جاں

کل میاں نثار کا خط ملا اور اس صحبت کا حال معلوم ہوا جو وہاں برپا ہوئی تھی۔ جلیل صاحب نے جو کچھ فرمایا وہ اصولاً صحیح ہو یا نہ ہو، لیکن چونکہ حسب حال ہے اس لئے بہت پسند آیا، میاں ذاکر نے جن الفاظ میں میرا ذکر کیا، ان پر مجھے فخر ہو یا نہ ہو، لیکن رسم تشکر ادا کرنے کو ضرور جی چاہتا ہے۔ تم لاکھ کہو کہ مجھے علم نہیں میرا کوئی اشارہ شامل نہیں، لیکن میں تو جانتا ہوں کہ

کارِ زلفِ تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

بہرحال یہ حقیقت نہ ہو۔ تو بھی مصلحتاً یا رعایتاً سر جھکا لو۔ اور مجھ سے یہ پندار نہ چھینو کہ دنیا میں جو کوئی مجھے اچھے نام سے پکارتا ہے، وہ حقیقتاً تمہاری ہی آواز ہے

خاں صاحب

حیران ہوں کہ آپ کی وضع عاشقانہ کی داد دوں، یا آپ کے اخلاق کریمانہ کی، یعنی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا وہ صرف بربنائے محبت تھا جو میرے لئے مخصوص ہے یا یہ کہ اس نوع کا لطف فرمانا آپ کی فطرت ہے، تعیین و تخصیص سے بے نیاز !

خونی مجرم کو بھی ایک بار اظہارِ حال کا موقعہ دیا جاتا ہے نہ کہ میں جس کا جرم اس سے زیادہ نہیں کہ رات کو دن نہیں کہتا اور دن کو دن سمجھتا ہوں۔ بہرحال مجھے مسرت ہوئی کہ آپ نے میری طرف سے اپنی بیزاریوں کا اعلان کرکے برسوں کی پڑی ہوئی گتھی کو سلجھا دیا اور اب میرے لئے وہ الجھن باقی نہ رہی، کہ آپ کو کس صف میں جگہ دوں

مانا کہ مجھے آپ کے جذبات پر اقتدار حاصل نہیں، لیکن خدارا، یہ کہاں کا انصاف ہے کہ میں اپنے جذبات

کا خون صرف اس لئے کر دوں کہ آپ اُن سے متفق نہیں
میں غریب ہوں اور غریب الدیار بھی، جاہل بھی ہوں اور لاچار بھی، لیکن کیا کروں۔ یہ بات کبھی سمجھ میں نہیں آئی کہ عقل آپ کی اور اعتماد میرا! جینے کا آخر یہ کونسا طریقہ ہے ـــــ بہر حال اگر جنس ناکارہ سمجھ کر میرے وجود کو نظر انداز کرنا آپ کے لئے ممکن نہیں تو

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

حبیب المکرم
پھلوں کے بھیجنے کی زحمت نہ اختیار کیجئے۔ کیونکہ اوّل تو میں اتنا شائق نہیں، دوسرے یہ کہ بغیر آپ کی معیت کے وہ ہضم بھی نہ ہوں گے۔ ہاں ایک صورت مفاہمت کی ہے اور وہ یہ کہ پہلے میں آپ کو یہاں سے شریفے بھیجوں اور جب آپ اپنی پسندیدگی کا اظہار فرماتے ہوئے میرا شکریہ ادا کریں تو میں جواب میں لکھوں کہ حضرت محض شکریہ سے کام نہیں چلتا، سفیدہ اور دسہری بھیجئے ـــــ ہر چند میں پھر بھی زیر بار احسان رہوں گا، لیکن کم از کم یہ اطمینان تو مجھے رہے گا کہ جو کچھ کھا رہا ہوں اس کے حصول میں تھوڑی بہت قوتِ بازو میں نے بھی صرف کی ہے ـــــ آپ باور کیجئے کہ یوں مجھے خاک مزا نہ آئے گا
اس لئے کہ فضول خط و کتابت میں وقت نہ ضایع ہو۔ اس عریضہ کے ساتھ ۳۰ سیر شریفوں کی بلٹی ملفوف کرتا ہوں۔ اس جوار کا یہ پھل اتنا ہی مشہور و لذیذ ہے جتنا اودھ کا سفیدہ، گو مزہ کے نوعیت کو دیکھتے ہوئے دونوں کا تقابل دُرست نہ ہو ـــــ اور ہاں، یہ کہنا بھول گیا کہ یہ پھل آپ کے لئے نہیں بھیجتا۔ بلکہ اپنے بھتیجوں اور بھتیجیوں کے لئے بھیج رہا ہوں۔ بھابھی کو بھی چکھنے کی اجازت نہیں

کرم گسترا

کس منہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا

کہ پائے سخن بھی درمیان ہے اور سر چارہ فرمائی بھی ! ـــــ یعنی خود بھی لُطف فرماتے ہیں اور دوسروں کو بھی آمادہ کرتے ہیں ـــــ حیران ہوں کہ وہ خدا جس کے بندے اسقدر بندہ نواز ہوں، وہ خود اتنا بے نیاز ہو! بے نیازی سے میری مراد مستغنی اور بے پرواہ ہونا ہے کہ میں مر رہا ہوں اور اسے فکر نہیں، میں ایڑیاں رگڑ رہا ہوں اور اُدھر سے کوئی تسکین نہیں ـــــ شاید خدا اور خداوند میں یہی فرق ہوگا اور اس لئے مجھے کہنے دیجئے کہ

تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

یہ تو خیر سب کچھ ہو گیا، لیکن یہ فرمائیے کہ میری "طبیع اندوہگیں" کا کیا علاج ہے۔ اگر باوجود ان تمام الطاف و عنایات کے میری سوگواریاں بدستور قائم رہیں تو پھر میں کیا کروں گا۔ اس لئے خدا کے لئے کوئی شکل تو ایسی رہنے دیجئے کہ میں آپ کو صورت دکھا سکوں ــــــ یاد رکھئے میں ہرگز مستحق نوازش نہیں، مجھ پر احسان کرنا مجھے ہلاک کرنا ہے ــــ نمرود کی خدائی میں رہتا ہوں اور اسی میں جان دینا پسند کرتا ہوں۔ آپ کیوں اپنا دل دکھائیں

جانِ نیاز

قاصد پہونچا، اور دفعتہً آپ کا باندہ چلا آنا معلوم ہوا ــــــ اتنی بڑی قربانی اور میرے لئے! اُف آپ کی جس محبت سے جان بچا کر میں یہاں چلا آیا تھا، وہ اب اس خطرناک حد تک پہونچ گئی!

دلے دارم خراب از التفات چشم بیمارت
ہمہ از جور می ترسند و من از لطفِ بسیارت

میری مجبوریاں آپ سے مخفی نہیں، اس لئے اب آپ ہی بتائیے کہ ان حالات میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ میں وہاں آکر آپ پر سے قربان ہو جاؤں، لیکن یہاں آپ کو بلانا امکان سے باہر ہے، اگر آپ کا ابے گڈھ سے چلا آنا بغیر اجازت کے ہوا ہے تو بھی واپسی میں حرج نہیں، زیادہ سے زیادہ دو چار اشک ندامت کافی ہوں گے۔ اور اگر اجازت حاصل کرلی گئی ہے تو پھر کوئی جھگڑا ہی نہیں۔

اوّل تو مجھے یقین نہیں کہ مہاراج کو حقیقت کا علم ہو گیا ہے اور اگر تھوڑی دیر کے لئے اس کو صحیح باور کر لیا جائے تو بھی حقیقت سے "انکار" آپ کے لئے چنداں مشکل نہیں۔ آنسو بہا کر نہ سہی، بپھر کر، بگڑ کر، تیوریوں پر بل ڈال کر سہی

میں خود باندہ آکر آپ سے زبانی گفتگو کرتا، لیکن وہاں میرا آنا مناسب نہیں اس لئے اب چارۂ کار بجز اس کے کیا ہے کہ پھر وہیں واپس جائیے، اور مجھے اطلاع دیجئے کہ کیا رنگ ہے۔ ممکن ہے رخصت ختم ہونے پر میں بھی حاضر ہو جاؤں گو بظاہر اس کی امید کوئی نہیں

ظالم، اب کیا پوچھتے ہو کہ یہ سب کیونکر ہوا ــــــ

شام کا وقت ہے، ہلکی ہلکی خنک ہوا چل رہی ہے، محل کے پائیں باغ میں روشوں پر ٹہل رہا ہوں، مہاراج کی طلبی کا انتظار ہے ــــ دفعتہً سامنے ایک مجسمۂ حسن و رعنائی نظر آتا ہے ــــــ ذی حیات، متحرک، نگراں،

خنداں ! ٹھیک اس وقت چوبدار آتا ہے اور میں چلا جاتا ہوں ـــــ لیکن یہ دو چیزیں اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔ ہلکے سانولے رنگ میں شفق کا انعکاس، اور طاؤس کی سی سستی رفتار!

اے جمال تو بہ تاراج نظر ہا گستاخ
اے خرام تو بہ پامالی سر ہا گستاخ

بسنت کی صبح ہے، دربار میں رسم گلبازی کی طیاریاں ہو رہی ہیں، گلاب اور گیندے کے سُرخ و زرد پھولوں سے آنچل معمور ہیں، مہاراج برآمد ہوتے ہیں اور درباری راگنی کے ساتھ ہی یہ رسم شروع ہو جاتی ہے۔ تم کبھی آؤ گے تو دکھاؤں گا کہ اُس پھول کی پنکھڑی اب تک میرے پاس محفوظ ہے جو میرے سینہ پر پڑ کر ہمیشہ کے لئے ایک زخم چھوڑ گیا ـــــ آہ،

کتانِ خویشتن می شویم بہ مہتاب

خیر یہ تو وہ باتیں تھیں جن کا ذکر کچھ افسانوں ہی میں اچھا معلوم ہوتا ہے، لیکن قہر تو یہ ہے کہ میں اس سے زیادہ کچھ لکھ بھی تو نہیں سکتا

رگِ سنگم شرارے می نویسم
کفِ خاکم غبارے می نویسم

رہا انجام و نتیجہ سو اب اس کے متعلق کیا عرض کروں

غالب نے ایک جگہ بنارس کا حال بیان کرتے ہوئے وہاں کی "قیامت قامتاں مژگاں درازاں" کا ذکر اس طرح کیا ہے

ز رنگیں جلوہ ہا غارت گرِ ہوش
بہار بستر و نوروزِ آغوش

سو اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ تم رشک و حسد سے مر جاؤ گے تو میں بھی اس شعر کا دوسرا مصرعہ پڑھ کر خاموش ہو جاتا ـــــ لاحول ولا قوہ، میں بھی کس قدر لغو و مہمل ہوں کہ ایک جھوٹ ختم نہیں ہوتا اور دوسرا شروع کر دیتا ہوں یقین کرو کہ یہ سب افسانہ نوازی کے سوا کچھ نہیں ـــ تم میری "سازگاری بخت" سے اچھی طرح واقف ہو، اگر حقیقتاً ایسا ہو بھی تو یقین کرنے کی بات نہیں

لاحول ولا قوہ، تم بھی کس درجہ پست ہمت واقع ہوئے ہو۔ صبح بہار میسر نہیں، تو شب ماہ میں کیا بُرائی ہے، جلوۂ سیرت کا فقدان ہے تو ہونے دو۔

خمِ زلف و شکنِ طرفِ کلاہ ہے درباب
تُف ہے تمھاری جوانی پر اور حیف ہے تمھارے شباب پر۔ گفتگو اصولی شروع ہو جائے گی اور غالباً ذاتیات تک پہونچ جائے، اس لئے خاموش رہتا ہوں، ورنہ کہتا میرے شیب و انحطاط سے اپنا شباب و عروج بدل لو، یا پھر اپنا نصیب مجھے دیدو، کہ کوئی ایک تو مکمل ہو جائے ــــ مجھے فرصت نہیں ورنہ وہاں پہونچ کر بجائے مقال کے عمل سے اس نظریہ کی اہمیت ثابت کر دیتا

ہمارے "سلیم چشتی" کیسے ہیں ــــ اگر ملاقات ہو تو کہدینا کہ "نفحات" کا نسخہ میرے پاس سے کہیں گم ہو گیا، مولانا جامی کے دستخط اگر اس پر ثبت نہ ہوتے تو بھی افسوس کرنا چاہئے تھا، لیکن اگر آج ملک الموت میری ہی روح قبض کرنے آجائیں تو کیا وہ مجھے بچا سکتے ہیں

بحمداللہ، میں صحیح و تندرست ہوں اور اسی لئے آپ کی صحت و عافیت کا طالب، ورنہ یوں بیمار پڑ جانے تو میں چاہتا ہوں کہ ساری دنیا میری طرح کراہنے لگے

آپ کی پرستشِ حال کا شکریہ، لیکن یہ آپ سے کہ کس نے دیا کہ میری حالت اس قدر سقیم ہے، اور پھر یہ کہ آپ کو میرا اتنا بڑا ہمدرد کیونکر جان لیا کہ ساری دنیا میں آپ ہی پر اس کی نظر انتخاب پڑی

اگر یہ صرف بہانہ ہے اجراءِ مُراسلت کے لئے، تو خیر، ورنہ میں اس شخص کا نام معلوم کرنے پر اصرار کروں گا، جس نے یہ شگونِ بد منہ سے نکالا

عزیز یہاں نہیں ہیں، پرسوں اجمیر گئے ہیں۔ اگر جلد واپس آگئے تو آپ کا پیام پہونچا دوں گا، اور کوشش کروں گا کہ وہ آپ کو مایوس نہ کریں ــــ لیکن اگر ان کی واپسی میں تاخیر ہوئی تو مجھے معذور سمجھئے کیونکہ میں خود آیندہ ماہ کی ابتدا میں یہاں سے باہر چلا جاؤں گا اور غالباً دو ماہ کے بعد واپسی ہو

منظومات کا مجموعہ نہ چھپا ہے اور نہ اس کے چھاپنے کا ارادہ۔ شعر کہنے سے قبل شعر سمجھنے کا سلیقہ نہ تھا اور جب یہ سلیقہ پیدا ہو تو وہ زمانہ گزر گیا۔ میرے بعد لوگوں کو اختیار ہے

بَیراگ کا بروگ

(۱)

راجکماری آئینہ کے سامنے ہلکے بنفشئی رنگ کی ساری پہنے بیٹھی ہوئی تھی، کنیزیں اسے سنوار رہی تھیں ــــ لمبے لمبے بال سلجھائے جا رہے تھے اور ان کی باتوں پر جو وہ کبھی ہنس پڑتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آئینہ کے اندر بجلی کی سی لہر دوڑ گئی۔ وہ اس وقت محل کے اس حصہ میں تھی جو اس کی خلوت و آزادی طلوت کے لئے مخصوص تھا

اس کا نام کملا تھا اور اس میں شک نہیں کہ وہ ایک کنول ہی کی طرح ــــــــ اُس کنول کی طرح جو سطح آب سے اونچا ہو کر پتلی سی شاخ پر کھلتا ہے۔ نازک اور لچیلی تھی

اس نے پشت کی طرف کرسی پر اپنی ہنس کی سی گردن ڈال دی، موتیوں سے مانگ بھرنے کے لئے کنیز نے اپنا زریں ظرف سنبھالا اور راجکماری گنگنانے لگی۔ اس کی آواز میں ایسی جھنکار تھی جیسے چاندی کے برتن پر کوئی ضرب لگا دی جائے۔ سچے موتیوں کے باریک باریک ذرّے اور مقیش کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس کے بالوں کے اندر ایسے نظر آتے تھے جیسے اندھیری رات میں جگنو چمک رہے ہوں ــــــــ

اس نے ایک آہ کے ساتھ گردن اٹھائی اور آئینہ کے سامنے بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹتی ہوئی، سینہ کے ہار کو سنبھالتی ہوئی بولی :ــــ "تم نے تو آج مجھے تھکا دیا" کنیزیں پیچھے خاموش کھڑی ہوئی مسکرا رہی تھیں ــــــــ راجکماری نے دفعتہً پلٹ کر دیکھا اور ان سب کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر خود بھی ہنس پڑی۔ کسی نے جلدی سے ساری کا آنچل سنبھال کر اس کے شانہ پر ڈالا، کسی نے ماتھے پر سُرخ بندی لگا دی اور کسی نے زرکار اطلس کی جوتی پاؤں میں پہنائی اور کملا آئینہ میں ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر اٹھ کھڑی ہوئی

کملا راجہ جگدیس پور کی لڑکی تھی اور راجپوتانہ بھر میں کوئی راجکماری اس کے حُسن و جمال کو نہ پہونچتی تھی لوگ کہا کرتے تھے کہ راجکماری کملا کے اندر تو سرسوتی دیوی نے جنم لیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مُلک کے نوجوان جو کوئی توقع اس کی طرف سے قایم نہ کر سکتے تھے، یہ نہ کہتے تو کیا کرتے

(۲)

بلداؤجی کا مندر رتن گڈھ کا تاریخی مندر ہے اور اپنی وسعت تعمیر کے لحاظ سے بھی خاص شہرت رکھتا ہے۔ ہر سال یہاں پھاگن کی پورنماشی کو بڑا میلہ لگتا ہے اور دور دور سے لوگ جاترا کرنے آیا کرتے ہیں۔ مندر کے چاروں طرف فقیروں اور سادھوؤں کے قیام کے لئے مسلسل کوٹھریاں ہیں۔ اور ان کے سامنے چاروں طرف برآمدہ بنا ہوا ہے، جہاں تپسیا کرنے والے اور دنیا کو تج دینے والے سادھو گیان دھیان میں مصروف نظر آتے ہیں

صبح کا وقت ہے اور سیکڑوں عورتیں تھالیوں میں رنگ برنگ کے پھول رکھے ہوئے پوجا کے لئے آ جا رہی ہیں۔ مندر کی پشت پر جہاں نسبتاً بہت کم ہجوم ہے، راجکماری کملا اپنی دو کنیزوں کے ساتھ کھڑی ہوئی آنے جانے والوں کو دیکھ رہی ہے، متعدد تھالیاں پھولوں سے بھری ہوئی صحن کے گوشہ میں رکھی ہوئی ہیں۔ اور اس بات کا انتظار ہو رہا ہے کہ ہجوم کم ہو تو یہ پھول بھی شیوجی کے استھان پر چڑھا دئے جائیں۔ کملا کا معمول تھا کہ وہ کبھی کبھی شہر کی دوسری عورتوں کی طرح یہاں آتی اور آزادی کے چند لمحے بسر کر کے چلی جاتی۔ ہر چند بعض پجاریوں اور پنڈتوں کو اس کا علم تھا، لیکن آج تک وہ کبھی یہ نہ معلوم کر سکے تھے کہ وہ کب آتی ہے اور کب چلی جاتی ہے

راجکماری کملا تھک کر وہیں فرش پر بیٹھ گئی اور رکمنی اور لیلاوتی سے آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگی۔ راجکماری کملا نے مسکراتے ہوئے کہا " لیلا، سچ بتا جس وقت تو شیوجی پر پھول چڑھاتی ہے تو تیرے دل میں کتنا آرزو ہوتی ہے "

لیلا — " راجکماری، میں کیا اور میری آرزو کیا "

رکمنی — " اور آرزو ہو بھی تو کیا، کبھی پوری ہوتے تو دیکھی نہیں "

کملا — (ہنستے ہوئے) " رکمنی، خوب کہا۔ لیکن کیا میں سن سکتی ہوں کہ تیری کیا آرزو ہے جو شیوجی نے آج تک پوری نہیں کی "

رکمنی — (افسردگی کے ساتھ) " راجکماری، کچھ نہیں، میں نے تو یونہی ایک بات کہدی۔ لیکن یہ جانتی ہوں کہ جو ہونا ہوتا ہے وہ بغیر پھول چڑھائے بھی ہو جاتا ہے اور جو بات ہونے والی نہیں، وہ کسی طرح نہیں ہوتی، چاہے کوئی لاکھ سر رگڑا کرے "

لیلا — (پیشانی پر تیوریاں ڈال کر) " کیوں ایسی بات زبان سے نکالتی ہے، پرمیشر اگر سن لے تو نہ جانے کیا کرے "

اسی وقت دو عورتیں قریب سے گزریں۔ ایک دوسری سے کہ رہی تھی۔ " بڑے گیانی سادھو ہیں، چرن چھوتے ہی میرا سب دکھ جاتا رہا، یہ معلوم ہوتا تھا گویا آنکھوں میں نیند سی بھری جا رہی ہے۔ تم بھی چلو کل صبح چل کر درشن

کرلو، وہیں تم سے قریب ہی رام گوپھا میں رہتے ہیں"
کملا رانی دیر تک خاموش کچھ سوچتی رہی اور بغیر پھول چڑھائے ہوئے واپس چلی گئی

(۳)

مہاراجہ —— " مجھے سوامی جی کا حال بالکل نہیں معلوم، لیکن تم ان سے ملنا چاہتی ہو تو میں انھیں یہیں بلاتا ہوں اچھا ہے میں بھی مل لوں گا "

کملا —— " مہاراج، جو لوگ دنیا چھوڑ چکے ہیں اُن سے دنیاوی جاہ وجلال کے ساتھ ملنا مناسب نہیں میں ان پر یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتی کہ میں کون ہوں "

مہاراجہ —— (مسکراکر) " تمھاری اس آزاد طبیعت سے جگدلیس پور والے بھی کچھ واقف ہو چلے ہیں۔ اور تمھیں معلوم ہے کہ وہ کیسے پُرانے خیال کے لوگ ہیں۔ صرف ایک مہینہ باقی ہے کہ تم انھیں کے بس میں آ جاؤ گی اس لئے مناسب نہیں کہ ان کو تمھاری طرف سے کسی بُرے خیال قائم کرنے کا موقع ملے۔ محلوں کی ذرا سی بات بھی کوٹھوں کوٹھوں پھرتی ہے "

یہ سنکر راجکماری کملا کے چہرہ پر انفعال و برہمی کی ملی ہوئی کیفیت کا ایک خاص رنگ پیدا ہو گیا۔ اور تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد جو حقیقتاً اس کے انتہائی ضبط و تامل کو ظاہر کر رہا تھا

بولی —— " سچ ہے مہاراج، لڑکی ہر جگہ لڑکی ہے، خواہ وہ راجہ کے گھر میں پیدا ہو، یا کسان کے جھونپڑے میں، عورت کی کمزوری، قدرت کی وہ بے اعتمادی ہے جس کا علاج اس دنیا میں ممکن نہیں، بہتر ہے میں نہ جاؤں گی، لیکن سوامی جی کو بھی یہاں آنے کی تکلیف نہ دیجئے اور رتن گڈھ کو جگدلیس پور نہ بنائیے "

یہ کہکر راجکماری کملا جانے ہی والی تھی کہ اس کے باپ نے اس کو روک لیا اور بولا کہ " کملا میرا مطلب یہ نہ تھا کہ تم وہاں نہ جاؤ، میں نے تو یوں ہی ایک بات کہ دی تھی، تم آزردہ نہ ہو۔ میں تمھاری خوشی کے لئے دنیا کی ہر مصلحت کو قربان کر سکتا ہوں بشرطیکہ رتن گڈھ کی عزت پر حرف نہ آئے "

(۴)

یوں تو رتن گڈھ کوہستان بندھاچل کے دامن میں واقع ہے لیکن اس کی آبادی پہاڑ کی بلندی تک پھیلی ہوئی ہے۔ جہاں قلعہ اور رنواس کی عمارتیں بھی نظر آتی ہیں۔ سب سے بلند مقام رام گوپھا کے نام سے مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب سری رام جی نے لنکا پر فوجکشی کی تھی تو اسی راستہ سے گزرے تھے اور یہاں ایک رات دن قیام کیا تھا

صبح کا وقت ہے، اور گو آفتاب کافی بلند ہو گیا ہے، لیکن موسم کی خنکی کی وجہ سے ابھی تک زیادہ چہل پہل کہیں نظر نہیں آتی

رام گوپھا ایک وسیع کھوہ ہے جس نے ایک وسیع کوٹھری کی صورت اختیار کر لی ہے اور قدرت نے اس کے آگے ایک بڑی چٹان کی چھت قائم کر کے اچھا خاصہ برآمدہ بھی بنا دیا ہے، جگہ نہایت صاف، ستھری ہے اور چاروں طرف سبز جھاڑیوں کی وجہ سے گرمی میں بھی یہ جگہ کافی خنک رہتی ہے۔ قریب ہی ایک سنگستانی چشمہ ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے اور بہت متبرک سمجھا جاتا ہے۔ یہ گوپھا عرصہ سے غیر آباد تھا، لیکن چند دن سے سوامی رام ناتھ، بنگال کے مشہور سنیاسی فقیر یہاں آکر ٹھہر گئے ہیں

سوامی رام ایک دولتمند باپ کے بیٹے اور تعلیم یافتہ خاندان کے فرد تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی ایسے ماحول میں بسر ہوئی تھی جسے نہ مذہب سے کوئی سروکار تھا اور نہ سنیاس سے، لیکن چونکہ وہ فطرت کی طرف سے نہایت سنجیدہ اور سوچنے والا دماغ لے کر آئے تھے۔ اس لئے وہ اپنے ماحول اور عیش و تنعم کی فضا سے بہت کم متاثر ہوئے تھے اور ان کی زندگی کافی سادہ بسر ہوئی تھی، جب ان کا مطالعہ وسیع ہوا تو اُن کی یہ فطری سادگی اور زیادہ ظاہر ہونے لگی، یہاں تک کہ آخرکار ایک گیروے رنگ کی چادر کے سوا اُن کے جسم پر کوئی کپڑا نہ رہ گیا

ہر چند ان کے باپ جو رنگ پور کے مشہور سربرآوردہ زمیندار تھے، اپنے بیٹے کی اس زندگی سے خوش نہ تھے اور انھوں نے بارہا اس موضوع پر گفتگو بھی کی، لیکن رام ناتھ کا وہ گہرا سکوت جس میں عجیب طرح کی کیفیت مقاومت پنہاں تھی، ایک ایسا فیصلہ کن جواب ہوا کرتا تھا کہ آخرکار یہ تعرض چھوڑ دیا گیا اور وہ اپنی عمر کے چوبیسویں سال تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد دفعتہً گھر سے غائب ہو گئے

رام ناتھ گھر سے نکلنے کے بعد کہاں گئے، کہاں کہاں کی خاک چھانی، اور کس کس جگہ گیان دھیان میں مصروف رہے، یہ ان کی زندگی کی وہ باتیں ہیں جن کا علم صرف انھیں کو حاصل تھا، جس وقت وہ رتن گڈھ آئے ہیں ان کی عمر ۳۲ سال کی تھی اور سوائے کتابوں کے انبار کے کوئی اور سامان اُن کے ساتھ نہ تھا

صورت و شکل کے لحاظ سے ان میں کوئی غیر معمولی بات نہ پائی جاتی تھی، لیکن چونکہ ابھی شباب کا زمانہ تھا اور شباب بھی ایک سنیاسی کا، اس لئے ان کی صورت میں ایک عجیب قسم کی کشش پائی جاتی تھی، اور آنکھوں کی کشش کا تو یہ عالم تھا کہ آنکھ میں آنکھ ڈال کر ان کا باتیں کر لینا۔ بڑے بڑوں کے قدم اکھاڑ دیتا تھا ان کا رنگ کھلا ہوا گندمی تھا، اور قامت و اعضاء کے لحاظ سے ایک چھریرے سڈول جسم کے انسان تھے

کملا جس وقت رُکمنی کے ساتھ وہاں پہونچی تو سوامی جی اپنے مطالعہ میں مشغول تھے اور کوٹھری کے اندر بیٹھے ہوئے تھے ———

رکمنی نے دستک دی اور تھوڑی دیر میں وہ باہر نکلے، لیکن اس شان سے کہ ہاتھ میں کوئی کتاب تھی اور ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ کملانے ان کو دیکھتے ہی نگاہیں نیچی کرلیں اور وہ اپنی جگہ ٹھٹک کر رہ گئے۔ سوامی جی عورتوں کی آمد و رفت کبھی پسند نہ کرتے تھے اور حتے الامکان اس سے بہت گریز کرتے تھے کہ عورتوں سے انھیں خطاب کرنا پڑے، اس لئے دستک سننے کے بعد جب وہ باہر نکلے اور انھوں نے دو عورتوں کو کھڑا ہوا دیکھا تو وہ گھبرا سے گئے۔ لیکن چونکہ وہ باہر آگئے تھے اس لئے اب واپس بھی نہ جاسکتے تھے۔ ملاجا لو نہ میں ایک جگہ بیٹھ گئے اور ان کو بھی بیٹھ جانے کا اشارہ کیا

رکمنی نے بڑھ کر اُن کے پاؤں چھونا چاہے، لیکن انھوں نے روک دیا اور بولے کہ "دیویو، میرے چرنوں میں کیا رکھا ہے، ہندو دھرم میں غیر کی پوجا حرام ہے"

رکمنی — "سوامی جی، یہ تو پرمیشر کی پوجا ہے آپ کے چرنوں کی نہیں"

سوامی جی — "پرمیشر کہاں ہے جس کی پوجا کرتی ہو، انسان خود پرمیشر ہے، اور اس کو خود اپنی ہی پوجا کرنا چاہئے"

کملا سوامی جی کے منہ سے یہ باتیں سُنکر حیران رہ گئی اور اس نے اپنی زندگی میں سب سے پہلے اس آواز کو سُنا جو زمانہ نامعلوم سے اس کے دل و دماغ میں گونج رہی تھی لیکن لب تک نہ آسکتی تھی۔

اس نے کہا — "سوامی جی، اپنی پوجا کا کیا طریقہ ہے"

سوامی جی — (مسکراتے ہوئے) "تم نے اپنی صورت کبھی آئینہ میں دیکھی ہے؟"

کملا — (انفعال کے ہلکے رنگ کے ساتھ) "جی ہاں، روز ہی دیکھتی ہوں"

سوامی جی — "تمھیں وہاں کیا نظر آتا ہے"

کملا — "ایک صورت نظر آتی ہے"

سوامی — "کس کی"

کملا — "اپنی"

سوامی — "وہ چیز جسے تم "اپنی" کہتے ہو کیا ہے، کہاں ہے، کیا "میں" نام خوبصورت چہرہ کا ہے، بڑی بڑی آنکھوں اور گورے گورے رنگ کا ہے؟ یہ تمام باتیں تو چند دن میں مٹ جانے والی ہیں، تو کیا "میں" بھی ان کے ساتھ فنا ہو جاتا ہے"

کملا — "بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے، گو ہونا تو نہ چاہئے"

سوامی — "کبھی سمندر تم نے دیکھا ہے"

کملا — "جی ہاں، دیکھا ہے"

سوامی ــــ "کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ قطروں کا مجموعہ نہیں، لیکن سمندر نام قطرہ کا تو نہیں۔ قطرہ جب تک سمندر میں شامل ہے خود بھی سمندر ہے، اور جب اس سے علحدہ ہو گیا تو وہ ایک فانی قطرہ ہے، درانحالیکہ سمندر بدستور اسی طرح قائم ہے۔ اسی طرح "میں" نام نہ تمھاری صورت کا ہے اور نہ میری صورت کا، نہ تمھاری ایک ذات کا، نہ میری تنہا ہستی کا، بلکہ اس کُل کا جو "ہم سب" کے پردہ میں ظاہر ہوا ہے، درانحالیکہ وہ "ہم" نہیں ہے۔ اسی کُل کا دوسرا نام "پرمیشور" ہے اور جب تک ہم اس میں شامل ہیں، خود بھی "پرمیشور" ہیں اور اس لئے اپنی پوجا کرنا پرمیشور کی پوجا کرنا ہے"

کملا ــــ "مہاراج، یہی تو میں پوچھتی ہوں کہ اپنی پوجا کیونکر کی جائے"

سوامی ــــ "تم نے کبھی آدھی رات کو جنگل کا سناٹا دیکھا ہے، جبکہ کہیں کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آتی"

کملا ــــ "جی ہاں، دیکھا ہے"

سوامی ــــ "پھر تم نے کبھی غور کیا ہے کہ اس انتہائی سکوت کی بھی ایک آواز ہوتی ہے، اس گہری خاموشی میں بھی ایک خاص قسم کی سرگوشی سی پائی جاتی ہے۔ انسان بھی اگر دھیان سے کام لے کر خود اپنی خلوت میں ڈوب جائے، تو وہ بھی خاص قسم کی آواز اپنے اندر سے پیدا ہوتے ہوئے سُن سکتا ہے اور محسوس کرسکتا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ کائنات میں وسیع ہوتا جا رہا ہے اور پرمیشور کی طرح سب پر چھایا جا رہا ہے"

کملا ــــ "اگر ایسا ہو بھی جائے تو اس سے نتیجہ کیا ہے"

سوامی ــــ "نتیجہ کا سوال، منزل کا سوال ہے، اور منزل کا سوال قطع جستجو کا"

سوامی جی کی آنکھوں میں آنسو آگئے، اور سر جھکا کر خاموش ہو گئے۔ کملا بھی اپنے جسم میں ایک خاص قسم کی جھرجھری محسوس کر رہی تھی اور جس وقت رخصت ہوتے وقت سوامی جی نے اس کو اپنی اشک آلود آنکھوں سے دیکھا تو وہ کانپنے لگی اور اس طرح گھر کی طرف لوٹی گویا اس کی کوئی چیز کھو گئی ہے اور وہ سمجھنا چاہتی ہے کہ وہ کیا چیز ہے (باقی)

نیاز

میکدۂ اسلام

اور

اڈیٹر سہیل یمن کی بہکی بہکی باتیں

لکھنؤ سے ایک شیعی رسالہ "سہیل یمن" جناب ظفر مہدی صاحب کی ادارت میں برسوں سے شائع ہو رہا ہے اور اسی ذہنیت کے ماتحت جو اخبار "النجم" کی ہے۔ یعنی شیعہ سنیوں کے درمیان تفریق و اختلاف کی خلیج کو وسیع کرتے رہنا اور کبھی کوئی ایک بات بھی سمجھ کی ایسی نہ کرنا جسے صحیح معنی میں دینی یا انسانی خدمت کہا جائے

"میکدۂ اسلام" ایک مختصر سا رسالہ ہے۔ جو انہیں کی قوت فکر و اجتہاد کا نتیجہ ہے اور خصوصیت کے ساتھ میرے پاس اس لئے بھیجا گیا ہے کہ اس میں جابجا میرا اور نگار کا بھی ذکر آیا ہے

اس رسالہ کا مقصود اس مسئلہ پر گفتگو کرنا ہے جو جناب امیر کی شراب نوشی سے متعلق ہے اور جس کا ذکر مولانا شبلی نے بھی کیا ہے۔ مجھ پر یہ الزام ہے کہ میں نے بھی اس کی تائید کی

میکدۂ اسلام میں شبلی کی تحقیق کو غلط ثابت کرتے ہوئے جن جن دور از کار مباحث و مسائل پر خامہ فرسائی کرکے ذوق سب و شتم کو پورا کیا گیا ہے، اُن سے اعتنا کرنا میرا فرض نہیں، کیونکہ وہ سب شیعہ و سُنی کی اُس دیرینہ نزاع سے متعلق ہیں جس کا خیال بھی میرے لئے حد درجہ تکلیف دہ ہے چہ جائیکہ اس کی حمایت یا مخالفت میں قلم اُٹھانا لیکن چونکہ صاحب رسالہ نے میرے خلاف ایک نہایت لغو و غلط الزام مولانا شبلی کی تائید کا قائم کیا ہے اس لئے اس کو رفع کر دینا ضروری سمجھتا ہوں

سنہ ۲۰ء میں ایک صاحب نے استفسار کیا کہ رسالہ سہیل یمن میں جناب عمر کے متعلق "شراب صلب" کا پینا کتب اہل سنت سے ثابت کیا گیا ہے، سو اس کی کیا اصلیت ہے" میں نے اس کا جواب دیتے ہوئے ایک جگہ

یہ ظاہر کیا تھا کہ

" سہیل یمن کے اس مضمون کا ماخذ عقد الفرید ہے یا عقد الفرید کے حوالہ سے "ابن قتیبہ"
لیکن مقالہ نگار نے دیانت سے کام لے کر نہ عقد الفرید کی پوری بحث پیش کی اور نہ ابن قتیبہ
کی عبارت نقل کی، کیونکہ اگر ایسا کیا جاتا تو اصل مقصود فوت ہو جاتا اور حضرت عمر پر بادہ خواری
کا الزام اسقدر صفائی سے عائد نہ ہو سکتا "

اسی سلسلہ میں میں نے ایک جگہ یہ بھی لکھا تھا

" یہ بالکل صحیح ہے کہ آیت " یسئلونک عن الخمر ——— " نازل ہونے سے پہلے
عام طور پر لوگ شراب کے عادی تھے اور اس آیت کے نازل ہونے پر بھی سب نے اسے ترک
نہیں کیا تھا، لیکن ایک مرتبہ جب یہ واقعہ پیش آیا کہ کسی صحابی نے (اور بعض کے نزدیک خود
حضرت علی نے) نماز مغرب بہ حالتِ سُکر پڑھائی اور قرات میں غلطی ہو گئی تو آیت
" لاتقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ " نازل ہوئی . . . . . "

میرے اس جواب میں (جو مئی ۲۶ء کے نگار میں درج ہوا ہے) ایک بات تو مدیر سہیل یمن کو یہ ناگوار ہوئی
کہ میں نے اُن پر مناظرانہ دیانت سے انحراف کرنے کا الزام قایم کیا تھا اور دوسری یہ کہ بہ حالتِ سُکر نماز پڑھانے
والے صحابی کا ذکر کرتے ہوئے۔ میں نے یہ بھی لکھ دیا تھا کہ بعض کے نزدیک یہ صحابی خود حضرت علی تھے

اب کامل سات سال گزرنے کے بعد ظفر مہدی صاحب " میکدۂ اسلام " شایع کرتے ہیں اور اس میں اپنی
دیانت کے مسئلہ کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف جناب امیر کے واقعۂ شراب نوشی کو لے کر مجھے بھی مولانا شبلی کی طرح
موردِ الزام قرار دیتے ہیں، درانحالیکہ حقیقت بالکل اس کے خلاف ہے

میں نے صرف اتنا لکھا تھا کہ بعض کے نزدیک خود حضرت علی نے بہ حالتِ سُکر نماز مغرب پڑھائی تھی، لیکن
اس سے میرا مدعا یہ ظاہر کرنا نہ تھا کہ میں بھی اُن " بعض " سے متفق ہوں، جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے۔ کہ
اس سے قبل میں صراحۃً اس باب میں مولانا شبلی کے خلاف اظہارِ خیال کر چکا تھا ———

اگست و ستمبر ۲۵ء کے مسلسل دو اشاعتوں میں جناب سید وصی احمد صاحب بلگرامی کا ایک مضمون " ملکِ خطا
کے شہزادے " کے عنوان سے نگار میں شایع ہوا تھا اور پہلا اعتراض مولانا شبلی پر انھوں نے یہی کیا تھا کہ

" آیت لاتقربوا الصلوٰۃ کی شان نزول میں ابوداؤد سے جو روایت انھوں نے نقل
کی ہے اور حضرت علی کے واقعۂ بادہ نوشی کا ذکر کیا ہے، حد درجہ قابل ملامت ہے۔ اور وہ حدیث
اس قابل نہ تھی کہ اس سے استدلال کیا جاتا . . . . . "

میں نے اس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

" اس مسئلہ میں کئی باتیں غور طلب ہیں

(۱) ابوداؤد کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے بھی یہ حدیث روایت ہوئی یا نہیں

(۲) اس کے راوی مجروح ہیں یا نہیں

(۳) آیۂ لاتقربوا الصلوٰۃ کی شان نزول یہی واقعہ ہے یا کوئی اور

(۴) مفسرین کی اس باب میں کیا رائے ہے

ابوداؤد کے علاوہ ترمذی میں بھی یہی واقعہ موجود ہے۔ لیکن ذرا اختلاف کے ساتھ۔ ابوداؤد کے الفاظ یہ ہیں

" عن علی ابن ابی طالب ان رجلاً من الانصار دعاہ (علی) وعبدالرحمٰن بن عوف فسقاھما قبل ان تحرم الخمر فامھم علی فی المغرب وقرأ قل یا ایہا الکفرون، فخلط فیھا، فنزلت لاتقربوا الصلوٰۃ الخ "

یعنی شراب حرام ہونے سے قبل حضرت علی اور عبدالرحمٰن بن عوف کو کسی انصاری نے مدعو کیا۔ اور ان کو شراب پلائی۔ پھر مغرب کی نماز میں حضرت علی نے امامت کی اور اثنائے قرأت میں " قل یا ایہا الکفرون " غلط پڑھ گئے جس پر آیۂ " لاتقربوا الصلوٰۃ " نازل ہوئی (ابوداؤد کتاب الاشربہ صفحہ ۱۶۱ جلد دوم مطبوعہ نولکشور)

ترمذی کے الفاظ یہ ہیں :-

" عن ابن ابی طالب صنع لنا عبدالرحمٰن بن عوف طعاماً ودعانا وسقانا من الخمر فاخذت الخمر منا وحضرت الصلوٰۃ فقدمونی فقرأت قل یا ایہا الکفرون ولا اعبد ما تعبدون ونحن نعبد ما تعبدون قال فانزل اللہ تعالیٰ یا ایہا الذین آمنوا لاتقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ الخ "

(ترمذی جلد دوم صفحہ ۱، مطبوعۂ مصر)

ابوداؤد نے یہ واقعہ مسدد سے روایت کیا ہے اور ترمذی نے سوید سے۔ ابوداؤد کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کسی انصاری نے حضرت علی اور عبدالرحمٰن بن عوف کی دعوت کی تھی۔ اور ترمذی کی روایت سے عبدالرحمٰن بن عوف کا دعوت کرنا پایا جاتا ہے۔ ابوداؤد میں مغرب کے وقت کی تصریح ہے۔ اور ترمذی میں کسی وقت کا ذکر نہیں

بخاری اور ابن ماجہ میں یہ روایت نہیں پائی جاتی۔ نسائی میں اس آیت کی شان نزول کے متعلق ایک اور واقعہ نقل کیا ہے جو ابوداؤد میں بھی ہے لیکن حضرت علی کی شراب نوشی اور دعوت کا کوئی ذکر نہیں ہے

انوار التنزیل میں " لاتقربوا الصلوٰۃ " کی جو شان نزول بیان کی ہے۔ وہاں بھی حضرت علی کا کوئی ذکر نہیں ہے اس میں لکھا ہے کہ :-

" عبدالرحمٰن بن عوف نے جس زمانہ میں شراب حرام نہیں ہوئی تھی کسی صحابی کو مدعو کیا اور پینے

مل کر کھانا کھایا، اور شراب پی یہاں تک کہ خوب سیر ہوگئے، اور نماز مغرب کا وقت آگیا۔ ان میں سے کوئی نماز پڑھانے لگا اور اثنائے قرأت میں "اعبد ما تعبدون" پڑھ گیا، جس پر آیۂ "لاتقربوا الصلوٰۃ" نازل ہوئی۔" [1]

اسی طرح علامہ زمخشری اور امام رازی وغیرہ نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ لیکن حضرت علی کی شراب نوشی کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ امام رازی نے آیۂ "لاتقربوا الصلوٰۃ" کے متعلق حضرت ابن عباس کی ایک اور روایت نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قبل حرمت خمر صحابہ شراب پی کر مسجد میں آتے تھے۔ اور نماز پڑھتے تھے۔ پس اللہ نے ان کو اس آیت کے ذریعہ سے منع کیا

دُرِّ منثور میں ایک جگہ سبب نزول وہی واقعہ حضرت علی کا نقل کیا ہے اور دوسری جگہ ضحاک اور ابن عباس کو سکر نوم یعنی نعاس سبب نزول قرار پایا ہے

بہر حال آیۂ "لاتقربوا الصلوٰۃ" کی شان نزول میں مفسرین کا اختلاف ہے اور چونکہ ابو داؤد اور ترمذی میں حضرت علی کے واقعۂ بادہ نوشی ہی کو اس آیت کا سبب نزول قرار دیا ہے اور دوسری روائتیں اس کی معارض واقع ہیں۔ اس لئے ہمارے نزدیک حدیث قابل اعتبار نہیں ہے۔ اور اس پر اعتماد کرکے ہم حضرت علی کے متعلق یقینی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ انھوں نے شراب پی۔ اور مولانا شبلی نے یقیناً اس معاملہ میں کاوش نہیں کی اور ابوداؤد کی اس حدیث کو صرف اس بناء پر کہ اس کے راوی غیر مجروح ہیں اختیار کر لیا

یہ تھے میرے خیالات اس خاص واقعہ کے متعلق جو میں فروری ۲۶ء کے نگار میں ظاہر کر چکا تھا، لیکن سہیل یمن کے وہ فاضل و مجاہد مدیر جو حضرت عمر پر شراب نوشی کا الزام عاید کرتے ہوئے عقد الفرید کی پوری عبارت نقل کرنے میں خیانت سے کام لے سکتا تھا وہ میرے باب میں کیوں دیانت سے کام لیتا اور کیوں میرے اصل خیال کو پیش کرتا ———

یہ ہے ہمارے مناظرہ کرنے والے مولویوں کی ذہنیت و قابلیت کا حال، اور یہ ہیں ان کی مبلغانہ راستبازیاں، جن سے وہ سپید کو سیاہ ثابت کرنے کی کوشش میں کام لیتے رہتے ہیں —— اصل موضوع کے متعلق جناب ظفر مہدی صاحب نے اس "میکدۂ اسلام" میں کیا لکھا ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ میں نے حضرت عمر کے شراب نوشی کے متعلق جو کچھ ۲۷ء میں لکھا تھا۔ اس میں کسی ایک بات کا بھی جواب جناب ظفر مہدی صاحب سے بن نہ پڑا اور سات سال کی مسلسل فکر و کاوش کے بعد بھی سوائے چندان مزخرفات

---

[1] انوار التنزیل جلد دوم صفحہ ۸۸ مطبوعہ مصر و مفاتیح الغیب الرازی جلد دوم صفحہ ۴۴۴ مطبوعہ مصر

کے جو متعصب مولویوں کی طرف سے اکثر و بیشتر ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ وہ کوئی ایک بات بھی لایق اعتنار پیش نہ کر سکے

باب الانتقاد

تعلیمات قرآن اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جسے مولانا اسلم جیراجپوری نے مرتب کرکے ان لوگوں کے لئے جو قرآن کو قرآن ہی سے سمجھنا چاہتے ہیں بڑی آسانیاں پیدا کردی ہیں

قرآن کی تعلیم کا اسلوب زمانۂ دراز سے اس وقت تک یہی چلا آرہا ہے کہ چند مخصوص تفاسیر کو سامنے رکھ کر اس کے مطالب سمجھائے جاتے ہیں۔ نہ مدرس خود غور و تامل سے کام لیتا ہے، نہ طلبہ کو اس طرف مایل کیا جاتا ہے ویا قرآن سے پہلے تفاسیر پر ایمان لے آنا ضروری ہوتا ہے اور چونکہ تفاسیر کا ماخذ بالعموم کتب احادیث ہیں جن میں شرت سے موضوع روایات پائی جاتی ہیں، اس لئے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن سمجھنے کی صحیح اہلیت طلبہ میں پیدا ہی نہیں ہوتی اور کورانہ تقلید اُن کی قوت فکر و اجتہاد کو یکسر محو کر دیتی ہے

عام طور پر مسلمانوں میں یہ غلط خیال پیدا ہوگیا ہے (جو یقیناً مولویوں ہی کی تعلیم کا نتیجہ ہے) کہ قرآن کو سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں اور اسلاف جو کچھ بتا گئے ہیں اس سے انحراف کرنا قرآن و رسول سے منحرف ہوجانا ہے

یہ خیال خود قرآنی تعلیم کے منافی ہے، کیونکہ وہاں تو ہر جگہ ہر انسان کو غور و فکر تدبر و تامل کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن مولوی کہتا ہے کہ نہیں تفکر و تعقل کا دور گزر چکا اور اب ہمارے لئے چارۂ کار سوائے اس کے کچھ نہیں کہ جو کچھ ہمارے اسلاف لکھ گئے ہیں اُن پر آنکھ بند کرکے ایمان لے آیا جائے

اس تعلیم نے یہ نقصان پہونچایا کہ مسلمانوں میں ذہنی غلامی پوری طرح سرایت کر گئی اور وہ اس دورِ علم و حکمت میں ناکارہ محض ہوکر رہ گئے

مولانا اسلم مُلک کے اُن چند روشن خیال مولویوں میں سے ہیں، جو کورانہ تقلید کے مخالف ہیں اور وہ قرآن میں غور و فکر کرنا ہر شخص کا فطری حق خیال کرتے ہیں،

اور اسی کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے یہ کتاب مرتب کی ہے۔ اس جلد میں اللہ اور اس کے صفات، مخلوق، دین، رسالت، کتاب، اور معاد کے متعلق جو کھلی ہوئی آیات قرآن میں پائی جاتی ہیں ان کو یکجا

کردیا ہے اور اس اسلوب سے یکجا کیا ہے کہ ایک آیت خود دوسری آیت کی تفسیر کرتی ہے

ہر چند اعظم گڈھ کا قدامت پرست شبلی اسکول جس کی "سیرۃ نبوی" پر مولانا اسلم نے آزادانہ تنقید کرکے اس کے نقائص ظاہر کئے ہیں، اور مولویوں کی دوسری جماعتیں جو اسی کورذہنیت کی مالک ہیں مولانا اسلم کے اس اقدام کو پسند نہ کریں گی اور ممکن ہے کہ وہ اس کے خلاف کافی پروپاگنڈا کریں لیکن مولانا اسلم باور کریں کہ اُن کی اس خدمت کی قدر کرنے والے اب مُلک میں کافی پیدا ہوگئے ہیں اور انھیں اس تالیف کے دوسرے حصّوں کو بھی جلد از جلد مکمل کر دینا چاہیئے

مہ نور می فشاند وسگ بانگ می زند

یہ کتاب نہایت اچھی طباعت وکتابت کے ساتھ ۲۲۸ صفحات پر شایع ہوئی ہے اور مولانا سے جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی کے پتہ پر دو روپیہ میں مل سکتی ہے

جنسی امراض اوران کاعلاج

یہ کتاب ڈاکٹر کرنل بھولاناتھ آئی۔ ام۔ اس۔ نے لکھی ہے اور تین حصّوں پر منقسم ہے۔ پہلا حصّہ تعلقات جنسی اور امراض و علاج سے متعلق ہے جسے خود کرنل صاحب نے لکھا ہے۔ دوسرا حصّہ حکیم مظفر حسین صاحب کا مرتب کیا ہے اور اس میں ویدک و یونانی نسخے درج کئے گئے ہیں۔ تیسرا حصّہ۔ برتھ کنٹرول کے لئے وقف ہے۔ کتاب بہ حیثیت مجموعی مفید ہے اور بہت ایسی معلومات کی حامل ہے جن سے ہر شخص کو واقف ہونا چاہیئے

اس دَور میں دیگر علوم وفنون کے ساتھ ساتھ "جنسیات" پر بھی خاص توجہ کی جارہی ہے اور کوشش ہورہی ہے کہ اس فن کی معلومات عام کردی جائیں۔ اس لئے مُلک کو کرنل صاحب کا ممنون ہونا چاہیئے کہ انھوں نے اُردو میں اپنے تجربات کو قلمبند کرکے عوام کو اُن کے سمجھنے کا موقعہ دیا

ڈاکٹر محمد اشرف الحق صاحب کے رسایل کے بعد یہ دوسری مستحسن کوشش ہے۔ جس کی قدر مُلک کو کرنا چاہیئے

یہ کتاب تین روپیہ (عہ) میں کتب خانہ لُطف زندگی اعوان منزل لاہور سے مل سکتی ہے

اصغر گونڈوی کی شاعری

اس کے مؤلف کوئی صاحب سرکوب الہ آبادی ہیں اس تالیف کا مقصود یہ ثابت کرنا ہے کہ اصغر مطلقاً شعر کہنا نہیں جانتے اور جب ان کو چیلنج دیا گیا کہ وہ کسی صحبت میں سب کے سامنے کسی طرح پر غزل کہیں، وہ جان بچا گئے

ہرچند اس کتاب میں اصغر صاحب کے خلاف وموافق دونوں مضامین جمع کئے گئے ہیں۔ لیکن مؤلف نے نتیجہ یہی نکالا ہے کہ وہ فن شعر سے بالکل نابلد ہیں

اس نوع کی تالیفات میرے نزدیک سنجیدہ طبائع کو متاثر کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں، کیونکہ ان کا تعلق یکسر ذاتیات سے ہوتا ہے اور دیکھنے والا بہ اوّل نظر خراب رائے قائم کرنے پر مجبور رہوتا ہے

محض یہ امر کہ اصغر صاحب نے چیلنج کو قبول نہیں کیا، اس امر کا ثبوت نہیں کہ وہ شعر نہیں کہہ سکتے، اور ہر سنجیدہ شخص کو وہی طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیئے تھا جو اصغر صاحب نے اختیار کیا۔ اگر اس کے بجائے اصغر کی شاعری پر تبصرہ کرکے اس کے نقائص کو ظاہر کیا جاتا۔ تو بھی خیر کوئی بات ہوتی، گو ایسی، ہم وہ بھی نہیں ——— معلوم نہیں اصغر صاحب اپنے شاعر ہونے پر فخر کرتے ہیں یا نہیں، لیکن میرے نزدیک ایک انسان کو سب سے پہلے اپنے انسان ہونے پر فخر کرنا چاہیئے

اگر اصغر صاحب اپنے اخلاق کے لحاظ سے صرف انسان ہیں اور شاعر نہیں تو بھی ان کے لئے یہی بس ہے اور شاعر نہ ہونا اُن کی عظمت کو کم نہیں کرسکتا

مجھے یہ کتاب دیکھ کر تکلیف ہوئی اور میں سرکوب صاحب کو مشورہ دوں گا کہ وہ آیندہ ایسی کوشش سے باز رہیں کیونکہ اصغر کو غیر شاعر ثابت کرنے کے سلسلہ میں اپنے حسن اخلاق کا جو نمونہ وہ پیش کر رہے ہیں، وہ حد درجہ قابل نفرت ہے

یہ کتاب ۸ر میں مہدی علی خاں بُک سیلر چوک الہ آباد سے مل سکتی ہے

بہار کی بھکارن جناب سید فرید جعفری مچھلی شہری کا دوسرا افسانہ ہے جو علیحدہ رسالہ کی صورت میں شایع ہوا ہے۔ اس کہانی کا مقصود زلزلۂ بہار کی تباہیوں کے متعلق لوگوں میں جذبۂ ہمدردی پیدا کرنا ہے

فرید صاحب نے جس مقصد کے ساتھ یہ تصنیف پیش کی ہے وہ ہر آئینہ قابل قدر ہے اور چونکہ اس کی آمدنی زلزلہ فنڈ میں جائے گی اس لئے لوگوں کو قدر کرنی چاہیئے۔ قیمت درج نہیں ہے

ملنے کا پتہ سکرٹری بہار سنٹرل ریلیف کمیٹی پٹنہ ہے

رسالۂ معلومات "افادیت" میں تجارت یقیناً شامل ہے، لیکن صرف تجارت تو افادیت کا مقصود واحد نہیں ———

اس نظریہ کو سامنے رکھ کر ملک کے موجودہ رسایل وجرائد پر نگاہ ڈالئے اور فیصلہ کیجئے کہ ان سے انسانی زندگی کا کون سا مفاد متعلق ہے۔ یعنی کیا تجارت کے علاوہ کوئی اور مقصد ان کے سامنے ہے ——— پھر تجارت تجارت میں بھی فرق ہے۔ امریکن وانگریزی مصنوعات کی مانگ چاہے کتنی ہی کم ہو۔ لیکن ان کی مضبوطی کا اعتراف ہر شخص کو کرنا پڑے گا۔ برخلاف اس کے کہ جاپان کا نام آتے ہی جنس کے ناکارہ، و نامضبوط ہونے کی

طرف خود بہ خود خیال منتقل ہو جاتا ہے

بالکل یہی کیفیت ہمارے ملک کے رسایل کی ہے کہ وہ تجارت بھی کرتے ہیں تو بالکل جاپانی قسم کی کہ چیز بظاہر نہایت خوشنما و ارزاں ہے، لیکن اگر نقش و نگار مٹا دیجئے تو اندر سوائے ردی کاغذ اور بوسیدہ لکڑی کے اور کچھ ہاتھ نہ آئے گا

یہ وبا اوّل اوّل پنجاب سے شروع ہوئی۔ اور اب تمام ہندوستان اس میں مبتلا نظر آتا ہے ——

آپ کسی رسالہ کو اٹھا کر دیکھئے، سرورق نہایت خوشنما و رنگین ہوگا، تصویروں کی بھرمار ہوگی۔ غزلیں بھی ہوں گی، فسانے و ڈرامے بھی نظر آئیں گے، ہنسنے ہنسانے والے مضامین بھی ہوں گے، لیکن آپ یہ چاہیں کہ ان کے مطالعہ کے بعد آپ کی معلومات میں کوئی اضافہ ہو یا کسی ذہنی و دماغی ترقی کی طرف خیال مایل ہو، تو آپ کو سخت مایوس ہونا پڑے گا

معارف اور سچ وغیرہ قدامت پرست مذہبی رسایل کا ذکر نہیں کہ وہ تو کولھو کا بیل ہیں۔ جن کے لئے آنکھ پر پٹی باندھ کر ایک ہی حلقہ میں چکر لگانا مقسوم ہو چکا ہے اس طرح نہ اُن رسائل کا ذکر ہے جو مذہب کے پردہ میں لغو و مہمل کتابوں کی تجارت کرنا چاہتے ہیں اور جو آپ کے دماغ کو سال بھر تک ادنیٰ قسم کا مذہبی لٹریچر سے تباہ کرنے کا معاوضہ بارہ آنے ایک روپیہ سے زیادہ نہیں لیتے۔ بلکہ افسوس تو اُن لوگوں پر ہے جو اپنے آپ کو روشن خیال و روشن دماغ کہتے ہیں اور پھر بھی اُن کے سامنے افادیت کا مفہوم ارزاں تجارت کے علاوہ کچھ نہیں ——

پنجاب میں اس وقت بعض رسایل ایک خاص مرتبہ و امتیاز کے مالک سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ ان کا عنصر غالب بھی افسانوں اور غزلوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا، درانحالیکہ ان کے مالک ایسے ہیں جن کو کوئی مادی فائدہ اٹھانا مقصود نہیں ہے اور اگر وہ چاہتے تو اپنے رسائل کو اقتصاد و سیاست اور معیشت و معاشرت کے اُن مسایل کے لئے وقف کر سکتے ہیں جن کی تعلیم و اشاعت کی اس وقت سخت ضرورت ہے۔ البتہ اگر دہلی پنجاب میں شامل سمجھا جائے تو رسالہ جامعہ کو مستثنیٰ سمجھنا پڑے گا، جو واقعی صحیح معنے میں ملک و قوم کی برمحل خدمت انجام دے رہا ہے

یو۔ پی کے رسایل اس سے زیادہ بدبختی میں مبتلا ہیں کہ اُن کو تجارت کا بھی سلیقہ نہیں اور کجن و زبیدہ کی تصویریں شایع کرنے کے بعد بھی خریداروں میں اضافہ نہیں کر سکتے۔ پھر اس کا سبب یہ نہیں کہ مفید چیز کی مانگ نہیں ہے بلکہ وجہ صرف یہ ہے کہ پہلے رسایل کی ترتیب پڑھے لکھے لوگوں کے ہاتھ میں تھی اور اب ہر وہ شخص جو ایک بورڈ کی قیمت ادا کر سکتا ہے اڈیٹر بنا ہوا ہے

البتہ اب سے ۸ سال قبل ہمیں لکھنؤ سے اور رسالے صبح امید اور معلومات ایسے جاری تھے جو واقعی مفید تھے۔ صبح امید کے احیاء کی تو کوئی توقع نہیں؛ لیکن معلومات پھر جاری ہوا ہے

اس کے اڈیٹر مسٹر عبد الوالی۔ بی۔ اے نہایت روشن خیال اور وسیع المطالعہ انسان ہیں اور اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ملک و قوم کے سامنے کس قسم کا لٹریچر پیش کرنے کی ضرورت ہے، چنانچہ مارچ و اپریل کے رسالوں میں انھوں نے بعض بین الاقوامی مسایل پر نہایت مفید و جامع مضامین لکھے ہیں اور ایسی صاف و شگفتہ زبان میں کہ پڑھنے والے کے دماغ پر کوئی بار نہیں ہوتا

ہرچند افراد قوم جو ادنیٰ درجہ کا ارزاں لٹریچر اور صرف نقش و رنگ دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں اس طرف جلد متوجہ نہ ہوں گے۔ لیکن عبد الوالی صاحب کو مطمئن رہنا چاہئے ایک وقت آئے گا جب ان کے مساعی کی قدر کی جائے گی۔ اور اگر یہ نہ ہو تو بھی ان کے اطمینان ضمیر کے لئے یہ کیا کم ہے کہ انھوں نے پبلک کے ذوق کو خراب کرنے میں کوئی حصّہ نہیں لیا

باب المراسلۃ والمناظرۃ

دعوائے مہدویت

(جناب سید محمد مہدی صاحب۔ الہ آباد)

میں شروع سے نگار کا مطالعہ کر رہا ہوں اور جو تدریجی انقلاب آپ کے خیالات میں ہوا ہو وہ پوری تفصیل کے ساتھ میرے سامنے ہے۔ پھر اس دوران میں کئی بار آپ کی تحریر نے وہ رنگ اختیار کیا کہ اس کے بعد سوائے اعلانِ مہدویت کے کسی اور منزل کی گنجایش نہ تھی لیکن افسوس ہے کہ میرا یہ خیال غلط نکلا اور آپ پھر ٹال گئے دو تین سال ہوئے جو ہنگامہ کفر و الحاد کا آپ کے خلاف ہوا تھا، اس کو دیکھتے ہوئے میں نے خیال کیا تھا کہ شاید نگار کی روش بدل جائے گی اور اس طرح میری وہ تمام توقعات ختم ہو جائیں گی جو آپ کی طرف سے میں نے قایم کی تھیں، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ نگار کا مشن بدستور وہی قائم ہے بلکہ سچ پوچھئے تو اس ہنگامہ کے بعد آپ نے جو مضامین لکھے ہیں وہ بہت زیادہ سخت ہیں اور مذہب پر نہایت کاری ضرب لگانے والے ہیں۔ اس لیے صورتیں تمام وہی موجود ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ پنجاب تو اتنے متعدد نبی اس وقت تک پیش کر چکے۔ اور ہمارا یو۔پی ایک مہدی آخر الزماں بھی نہ پیدا کر سکے۔ یہ بھی کر دیکھئے، شاید کوئی صورت فلاح و اصلاح کی پیدا ہو سکے

(نگار) آپ کے مشورہ کا شکریہ، لیکن میرے محترم دوست' شاید آپکو معلوم نہیں کہ جو آپ کا منتہائے نظر و خیال ہے، وہ میری پرواز کے لحاظ سے ننگ پر و بال ہے، آپ کے نزدیک مہدی ہو جانا گویا اتنی بڑی بات ہے کہ اس کے لئے کوئی خاص ہوئے و اہتمام درکار ہوتا ہے۔ اور اگر آپ کسی پر طعن کرنا چاہیں تو یہ نام لیکر اس خواہش کو پورا کر سکتے ہیں۔ کاش آپ سمجھ سکتے

کہ انسان مہدی و نبی سے بھی گزر کر خدا بننے کے لئے عالم وجود میں آیا ہے اور اگر آپ مجھے مشورہ دینے پر مجبور ہی تھے تو میرے دست گستاخ کو دامن الوہیت کی طرف بڑھنے کی دعوت دیتے، عرش و کرسی پر چھا جانے کا ایما فرماتے نہ کہ دعوائے مہدویت جو میرے حوصلہ و عزم کے لحاظ سے کہیں فروتر ہے

مجھے نہیں معلوم کہ آپ دجال و مہدی وغیرہ کے ظہور کے قایل ہیں یا نہیں، لیکن اگر آپ آل رسول ہونے کے لحاظ سے واقعی "امام مخفی" کی آمد کے منتظر ہیں تو کیا دیر ہے

بال بکشا دصفیر از شجر طوبےٰ زن

آئیے، اور اس دل خانہ خراب کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو جائیے۔ آپ کی توقعات تو کسی طرح پوری ہوں "امام منتظر" کے لئے آپ کی یہ اختر شماریاں تو کسی طرح ختم ہونے میں آئیں

میرے عزیز دوست، باور کیجئے کہ آپ حضرات، اخلاق کی جس منزل سے گزر رہے ہیں، وہ میرے نزدیک خدا اور مذہب دونوں کے لئے باعث توہین ہے ـــــ اگر خدا اتنی مدت کے بعد بھی انسان بنانے میں کامیاب نہیں اور اس کا بتایا ہوا مذہب ہزاروں سال کی عمر پانے کے بعد بھی ہنوز تکمیل انسانیت کی راہیں متعین نہیں کر سکا تو ایسے خدا او مذہب کو لے کر ہم کیا کریں ـــــ

کتنا اندھیر ہے کہ آپ اس روشن زمانہ میں بھی خدا اور نبی کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں اور خود اپنی جستجو کی طرف سے غافل ہیں

سر روحانیاں داری و لے خود را ندیدستی
بخواب خود درآتا قبلۂ روحانیاں بینی

دار المصنفین اور سیرۃ نبوی

(جناب عبد الحمید صاحب - حیدر آباد)

کسی گزشتہ پرچے میں آپ نے دار المصنفین سیرت نبوی پر تنقید کی تھی میں نے اس کتاب کو منگا کر دیکھا تو آپ کی باتوں کی حرف بحرف تصدیق کرنی پڑی - قرآن تو کہتا ہے قل انما انا بشر مثلکم اور درحقیقت رسول اکرم کی عظمت کا راز بھی خالص بشریت ہے اور اسی قرآنی تعلیم نے مسلمانوں کو صحیح راستے پر قائم رکھا کہ انھوں نے اپنے اتنے بڑے رسول کو عیسائیوں کی طرح خدا نہیں بنایا لیکن سیرت

ان کو خدا بنانا چاہتی ہے اس کی چوتھی جلد کے صفحہ ۸۰ میں ہے کہ رسول اللہ مافوق البشر ہیں قرآن کہتا ہے کہ قل لا اقول لکم انی ملک ۔ پھر جب مافوق البشر ہیں اور فرشتہ ہونے سے انکار ہے تو سوائے الوہیت کے اور کیا صورت ہوگی ۔ اس کے مؤلف کی قرآن دانی کا یہ حال ہے کہ اس میں صفحہ ۲۵ میں آیت ولا یشفعون الا لمن ارتضیٰ کو جو ملائکہ کے متعلق ہے انبیاء کے شان میں قرار دیا ہے صفحہ ۱۰۲ میں آیت وما انزلنا علی قومہ من بعدہ من جند من السماء کا عجیب ترجمہ لکھا ہے کہ ہم نے اس کے مرنے کے بعد اس پیغام کو دے کر اس کی قوم پر آسمان سے کوئی فوج نہیں اُتاری وہ سمجھتا ہے کہ فوجوں کا کام پیغام لے کر جانا ہے ۔ غرض اسی قسم کی قرآن سے ناواقفیت بلکہ عمیق جہالت اس کتاب میں نظر آتی ہے آپ حسب ذیل امور کا جواب ضرور لکھیں

(۱) دار المصنفین کا مالک کون ہے

(۲) اس میں کون کون لوگ کام کرتے ہیں اور ان کی علمی قابلیتیں کیا کیا ہیں،

(۳) اس کو کن کن ریاستوں سے کتنی کتنی امداد ملتی ہے اور آج تک پبلک سے کس قدر چندہ لیا

(۴) کیا آپ کے خیال میں یہ جماعت کتابوں کی تجارتی کمپنی سے کچھ زیادہ حیثیت رکھتی ہے

(۵) یہ جماعت قدیم الخیال مولویوں کی نمایندہ ہے پھر اس کو کیا ترجیح دیوبند یا دیگر مدارس کے علماء پر حاصل ہے جس کی وجہ سے یہ امداد کی مستحق ہے اور اس کے پاس وہ کیا چیز ہے جو مسلمانوں کے سامنے پیش کرنا ضروری ہے

(نگار) آپ نے جس نوع کے اسقام و اغلاط کا ذکر کیا ہے اُن کی سیرۃ نبوی میں کمی نہیں آپ یا کوئی کہاں تک ڈھونڈھے گا ۔ اور کب تک سر پیٹے گا ــــــ افسوس ہے کہ تاریخ اسلام میں یہی ایک چیز ایسی تھی جو دنیا کے سامنے پیش کرنے کی تھی ۔ لیکن مولویوں نے اس کو بھی اس قابل نہ رکھا کہ خود اپنے ہی لوگ دیکھ سکیں، چہ جائیکہ اغیار ! سچ تو یہ ہے کہ دار المصنفین کی سیرۃ نبوی سے بدرجہا بہتر بعض مستشرقین مغرب کی وہ تصانیف ہیں ۔ جن میں کم از کم دس جگہ تو عقل و انصاف سے کام لیا گیا ہے ، یہاں تو شروع ہی سے اس کا التزام رکھا گیا ہے کہ سوائے مسلمان کے کوئی اور اسے پڑھ نہ سکے ۔ اور اگر پڑھے تو محمدؐ کو دیوتا یا علم الاصنام کا کوئی کیرکٹر سمجھ کر خاموش ہو جائے ــــ پھر تماشہ یہ ہے کہ اس غلو کا نام محبت رسول رکھا جاتا ہے ، سچ کہا ہے کسی نے کہ خدا مجھے میرے دوستوں سے بچائے آپ نے جو اور سوالات کئے ہیں ۔ ان کا جواب آپ براہِ راست دار المصنفین ہی سے طلب فرمائیں تو بہتر ہے

باب الاستفسار

کوثر

(جناب لطف الہٰی صاحب۔ بنگلور)

قرآن میں لفظ کوثر سے کیا مراد ہے کیا واقعی وہ کوئی حوض یا چشمہ ہے جو جنت میں پایا جاتا ہے اور مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے

(نگار) لفظ کوثر کلام مجید میں صرف ایک جگہ آیا ہے :۔

انا اعطیناک الکوثر یہاں لفظ کوثر بروزن "فوعل" "کثر" سے مشتق ہے اور خیر کثیر کے معنی میں آیا ہے، یعنی ہم نے تجکو بہت سے برکات بخشے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ عام مفسرین نے اس حقیقی معنی کی طرف بالکل اعتنا نہیں کیا اور احادیث پر اعتماد کرکے کسی جگہ یہ ظاہر کیا گیا ہے۔ کہ کوثر ایک نہر ہے فردوس کی اور کہیں یہ کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ وہ پانی کا حوض ہے جو میرے لئے مخصوص ہے اور جو معراج کے وقت مجھکو دکھایا گیا

مکی سورتوں میں فردوس کی نہروں کا ذکر اجمال کے ساتھ اور مدنی سورتوں میں زیادہ تفصیل کے ساتھ پایا جاتا ہے :۔

مثل الجنتہ اللتی وعد المتقون۔ فیہا انہار من ماء غیر آسن وانہار من لبن لم یتغیر طعمہ وانہار من خمر لذۃ للشاربین وانہار من عسل مصفی

یعنی ان میں پانی، دودھ، شراب اور شہد کی نہروں کا ہونا ظاہر کیا گیا ہے —— عیسائی اور یہودی روایات میں بھی جنت کی نہروں کا ذکر پایا جاتا ہے اور سوائے اس کے کوئی فرق نہیں کہ وہاں دودھ اور شہد کے علاوہ تیل کی نہر کا بھی ذکر ہے اور مسلمانوں میں تیل کے بجائے پانی ہے

رسول اللہ کی حیات میں تو لفظ کوثر خیر کثیر ہی کے مفہوم میں لیا جاتا تھا لیکن آپ کے بعد وہ چشمۂ فردوس بن کر رہ گیا اور بقول طبری اس کا پانی برف سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ شیریں ہے ـــــ پھر یہ بدعت اسی جگہ ختم نہیں ہوگئی بلکہ اس میں شاعرانہ مبالغہ سے کام لے کر یہ بھی بتایا گیا کہ اس نہر کے ساحل سونے کے ہیں اور اس کی تہ میں موتی اور لعل بچھے ہوئے ہیں۔۔۔۔ ـــــ اسی کے ساتھ یہ جغرافی تحقیق بھی پیش کی گئی کہ جنت کی تمام نہریں اسی کوثر کے اندر آکر گرتی ہیں جس کا دوسرا نام "نہر محمد" بھی ہے

قرآن میں جابجا فردوس کی عشرتوں اور جہنم کے مصائب کا ذکر پایا جاتا ہے۔ اور یقیناً وہ سب بیان تشبیہی وتمثیلی ہے جس کو مادی صورت سے کوئی واسطہ نہیں، لیکن ہمارے مفسرین نے جنکے لئے موضوع احادیث کی کوئی کمی نہ تھی ان تمام باتوں کو دنیاوی لذت والم کا مفہوم سامنے رکھ کر پیش کیا اور اس طرح ایک بڑا دفتر "صنمیات" کا مرتب ہوگیا ـــــ انھوں نے ایسا کیوں کیا۔ اس کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں، یا تو وہ خود حقیقتاً ان تمام باتوں کو صحیح باور کرتے تھے یا یہ کہ صرف بربنائے مصلحت عوام کو ایسا سمجھاتے تھے تاکہ ان میں رغبت وشوق پیدا ہو مجھے اس کے ماننے میں تامل ہے کہ مقصود صرف ترغیب وتشویق تھی بلکہ وہ حقیقتاً جنت ودوزخ کو اسی مفہوم ومعنی میں لیتے تھے جو یہود ونصاریٰ یا قدیم ایرانی روایات میں پایا جاتا ہے اور چونکہ اسرائیلی حکایات بیان کرنے کی ممانعت نہ تھی اس لئے رفتہ رفتہ تمام وہ قصے کہانیاں جو اُس وقت رائج تھیں اور جن کو وہ لوگ اکثر سنتے رہتے تھے، اسلام میں شامل کر دی گئیں اور موضوع احادیث کے ذریعہ سے ان کی توثیق بھی ہوتی رہی تاکہ لوگوں کو چون وچرا کا موقعہ نہ ملے

قرآن مجید میں دوزخ وجنت کے حقیقی مفہوم کو بھی جابجا ظاہر کیا گیا ہے۔ یعنی نہایت صاف الفاظ میں ان کو غیر مادی ظاہر کرتے ہوئے ان کا مفہوم قوم کا زوال وعروج بتایا گیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ کلام مجید کو احادیث سے علیحدہ کرکے کبھی سامنے پیش نہیں کیا گیا۔ اور روایات موضوعہ سے ہٹ کر کبھی اس کا مطالعہ نہیں کیا گیا ورنہ یہ حقیقت واضح ہو سکتی

پھر تماشہ یہ ہے کہ یہ واہمہ پرستیاں کسی خاص زمانہ سے مخصوص نہ تھیں بلکہ تقریباً ہر دَور میں پائی جاتی تھیں اور رفتہ رفتہ برابر ان میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ خرافیات کا ایک انبار ہوگیا اور اسلام اس کے اندر ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا گیا

اس سے قبل نگار کے صفحات میں دوزخ وجنت کے حقیقی مفہوم پر کافی بحث کر چکا ہوں اس لئے اعادہ و تکرار کی ضرورت نہیں اسے ملاحظہ فرمائیے

لکھنؤ کی شاعری

اے زبانِ لکھنؤ، اے لکھنؤ کی شاعری
اے سراپا تیرا آورد، اے تکلف کی پری

اے تصنع پر فدا، اے صنعتوں کی تاجدار
باغِ آب و رنگ میں کاغذ کے پھولوں کی بہار

کچھ تجھے معلوم ہے تو نے لیا کیونکر جنم
کچھ تجھے معلوم ہے تجھ میں ہوا کیا بیش و کم

یعنی دلی جب جمالِ شعر کی دیوانہ تھی
شاعری سے سرزمینِ لکھنؤ بیگانہ تھی،

میں نہیں کہتا کہ اس جا کوئی آبادی نہ تھی
میں نہیں کہتا یہاں دریا نہ تھا، وادی نہ تھی

میں نہیں کہتا کہ اس جا صاحبِ دولت نہ تھے
میں نہیں کہتا کہ اس جا صاحبِ حشمت نہ تھے

میں نہیں کہتا کہ انساں اس جگہ ملتے نہ تھے
میں نہیں کہتا گل و غنچہ یہاں کھلتے نہ تھے

مالکِ سیف و قلم تھے صاحبِ ایجاد تھے،
دلبرانِ خوش ادا تھے عاشقِ ناشاد تھے

تھی یہی خاکی زمیں، اور تھا یہی چرخِ کبود
ہاں نہیں تھا، تو نہیں تھا شعر کا اس میں وجود

رمز دانانِ تخیل اس جگہ ملتے نہ تھے،
شعر کی تاثیر سے دل اس جگہ ہلتے نہ تھے

ناگہاں اتنے میں بدلا رنگ فیض آباد کا
لکھنؤ مسکن ہوا ہر صاحبِ ایجاد کا

اس طرف دلی کی قسمت میں ہوا اک انقلاب
یعنی وہ ہنگامۂ عشرت ہوا ماضی کا خواب

ٹھوکریں کھاتے ہوئے پھرنے لگے اہلِ ہنر
گھر سے نکلے، شہر چھوڑا، خاک اڑائی دربدر

بینوا کچھ آ گئے اس جانب گدائی کے لئے
اس کے جویا تھے دفعِ بینوائی کے لئے

میرزا سودا بھی تھے ان بیکسوں میں میر بھی
جرأت و انشا بھی تھے اور سوز بھی اور مصحفی

اپنے اپنے رنگ میں کی شعر خوانی اس طرح
طائرانِ خوش نوا گلشن میں چہکیں جس طرح

جب بیاں کرتے تھے وہ فرقت کے حالات اپنے لب
آتے تھے بیساختہ آنکھوں سے سب کے اشکِ خوں

جب وہ کہتے تھے کہ ہم نے یوں گذاری زندگی
بلبلی تھی فوراً شیشۂ بے قراری، زندگی

گوشہ گوشہ ہو رہا تھا مستِ صہبائے سخن
بچہ بچہ بن گیا تھا بادہ پیمائے سخن،،

میر کی تخئیل نے دنیا کو حیراں کر دیا، سوز نے اک جوشش دنیا میں نمایاں کر دیا
مصحفی نے سیکھنے والوں کو جو تعلیم دی شعر خوانانِ ادب نے شوق سے تسلیم کی
وہ ضمیر خوش بیاں، وہ آتشِ رنگیں نوا وہ اسیر نکتہ داں، وہ غافلِ معنی سرا
ایک پر کیا ایسے ایسے سیکڑوں دیوانے تھے شمع گو تھی ایک، لیکن ہر طرف پروانے تھے
ایک اس کامل نے دنیا بھر کو کامل کر دیا، حلقۂ درس و ادب میں سب کو شامل کر دیا
دینِ شعر و شاعری یکسر مکمل ہو گیا، لکھنؤ جو کچھ نہ تھا دلی سے افضل ہو گیا

دورِ نیرنگِ فلک نے اک نیا دکھلا دیا شاعروں میں یعنی اک ناسخ کو بھی پیدا کیا
کون ناسخ جس نے کر دی شاعری یکسر تباہ شعر کا دفتر کا دفتر کر دیا جس نے سیاہ
کون ناسخ جس کی ہے الفاظ پر نام و نمود کون ناسخ ہے تصنع جس کا سازِ ہست و بود
جس نے لفظوں سے بنایا اک گھروندا شعر کا جس نے پائے خامہ سے میدان روندا شعر کا
جس نے ایہام و تناسب کو بنایا راہ بر، جس نے تضییعِ ہنر کا نام رکھا تھا ہنر،
جس کو آتا ہی نہ تھا ہرگز تنافر کا خیال تھا نمایاں جس کے شعروں میں سراسر ابتذال
چغد کی آواز کو سمجھا جو آوازِ ہزار، جس کا مرغِ دل تھا دروازے کی بلی کا شکار
مایہ بگڑا شاعری کا اس کی سعیٔ تام سے نفرت آئی اہلِ دل کو شاعری کے نام سے
ہو گیا آخر اسی اک رنگ پر جب اجتماع آتش اور آتش کے شاگردوں نے بھی کی اتباع
انتہا یہ ہے کہ پیرو ہو گئے اس کے انیس جیسے وہ تھے ہو گئے ویسے ہی پھر ان کے جلیس
وہ انیسِ خوش بیاں جن کا جہاں میں نام ہے شاعری جنکی جہاں کے واسطے پیغام ہے
شاعری سے گو نہیں تھا ان کو کوئی واسطہ، کیونکہ داخل شعر میں ہرگز نہیں ہے مرثیہ
اس میں جو آہ و بکا ہے شعر میں داخل نہیں شعر ہے ظاہر میں لیکن شعر میں شامل نہیں
اور اگر ہم مان لیں اس کو کہ ہو وہ شاعری پھر بھی وہ رنگِ تغزل کی نہیں جلوہ گری
یہ مناظر صبح کے، یہ شام رنگیں کا بیاں اور یہ گھوڑے کی روانی صورتِ برقِ تپاں
تیزیٔ شمشیرِ براں، صورتِ جوشش دغا ہونے کو سب کچھ ہیں، لیکن ہیں تغزل سے جدا
وہ تعشق، وہ صبا، وہ رند، وہ خوشگو امیر سب کے سب تھے ایک ہی دامِ تعلق میں اسیر
شعر کہنے کو تو لاکھوں ہیں مگر کچھ بھی نہیں نالۂ بیکار لاکھوں ہیں اثر کچھ بھی نہیں

ایک کے ہاتھوں سے ہے دامانِ سنبل تار تار
ایک کمسن قاتلوں میں ہوگیا جاکر شکار

ایک نے تو جا جنوں میں جاکے دامانِ سحر
ایک تربت پر ہوا مجنوں کی جاکر نوحہ گر

ایک نے ڈھونڈی کمر لیکن کہیں پائی نہیں
ایک مفلس ہوگیا ہے گھر میں اک پائی نہیں

ایک کے ہاتھوں سے چھوٹا توسنِ عمرِ رواں
دوسرے نے نقدِ جاں دے کر کیا سودا گراں

ایک نے دشتِ جنوں میں خاک اڑائی عمر بھر
ایک نے سیلابِ گریہ سے بہایا اپنا گھر

قصہ کوتہ رنگِ دنیا بھر کا یکساں ہی رہا
شعر کا دفتر پریشاں تھا پریشاں ہی رہا

رفتہ رفتہ آگیا دنیا میں پھر دورِ صفیؔ
اُن کی شہرت مٹ گئی اور ان کی اب شہرت ہوئی

تھے معاصر انکے مرزا ثاقبؔ و آبر و بہار
ناضل و ثروتؔ، عزیزؔ نکتہ دانِ نامدار

باہمی کرتے تھے مل مل کر یہ احیاءِ سخن
محفلوں میں شعر کی دیتے رہے دادِ سخن

اول اول ان کا بھی لیکن قدیمی رنگ تھا
لکھنؤ کا بچہ بچہ جس کے اوپر دنگ تھا

نکتہ دانوں کے لئے وہ ایک سیدھی راہ تھی
جس میں کچھ کچھ آہ شامل اور کچھ کچھ واہ تھی

تھی وہی بھرمار دُور از عقل تشبیہات کی
تھی وہی گیسوئے جاناں میں سیاہی رات کی

تھا وہی بادام کی صورت میں آنکھوں کا ظہور
تھا وہی عارض کی رنگینی میں پنہاں نورِ طور

رفتہ رفتہ جب خرابی اس کی دکھلائی گئی،
متفق ہو کر یہ اک تجویز ٹھہرائی گئی،

چاہئے اب منعقد کرنا ہمیں اک انجمن،
جس میں سب آپس کے شامل ہوکے دیں دادِ سخن

اب قدیمی رنگ میں لازم ہے کچھ قطع و برید
اب پرانے غمزوں کے آخر ہیں کب تک شہید

رنگ ناسخؔ کا نہیں ہے آجکل کچھ دلنشیں
جو پرانے بت ہیں وہ قابل پرستش کے نہیں

جادۂ غالبؔ پہ رکھنا چاہیئے ہم کو قدم
اس سے ممکن ہے کہ پھر دنیا میں ہوں مشہور ہم

الغرض قائم ہوئی اس وقت بعدِ سعیِ تام
انجمن شعر و سخن کی جس کا تھا معیار نام

اک طرف ناطقؔ، صفیؔ، اور اک طرف محشرؔ عزیزؔ
اک طرف ابرؔ و بہارؔ و ثاقبؔ والا تمیز،

اسمیں ثروتؔ بھی تھے، عالم بھی تھے اور فاضل بھی تھے
ماسوا ان ہستیوں کے اور اہلِ دل بھی تھے

مل کے ان سب نے کیا تبدیل رنگِ شاعری
یعنی ٹھہری مرثیہ کے ساتھ جنگ شاعری

جب نہ ان سے ہو سکے مضمون غالبؔ سے بہم
آخرش سب نے اٹھایا مل کے نوحہ پر قلم

جانکنی کے سب کے سب ساماں بہم ہونے لگے
رفتہ رفتہ موت کے مضموں رقم ہونے لگے

ایک کی اینٹھی رگیں یعنی تشنج ہو گیا
ایک کا منہ بھر بھرایا اور تہیج ہو گیا

ایک کو یرقانِ اصفر کی شکایت ہوگئی		ایک روئے اسقدر شدت سے رقت ہوگئی
اُس نے گورستاں میں مُردوں سے کیا جاکر کلام		موت کی ہچکی سے آیا دوست کا اس کو پیام
الغرض اس وقت سے یہ رنگ جاری ہوگیا		خون بن بن کر رگ و پے میں یہ ساری ہوگیا
آجتک سب اہل دل ہیں اس بلا میں مبتلا		شاعری کا واہ کیا اچھا ملا ان کو صلا
وہ سراجِ نکتہ داں، اور وہ قدیرِ ذی ہنر		آرزو و منظر و آشفتہ، والا گہر،
سب اسیرِ رنگ و بوئے باغ پیشینہ ہوئے		سب قتیلِ خنجرِ معشوقِ دیرینہ ہوئے

آجتک ان کا وہی ہے تار و پود شاعری
شاعری کیوں کہئے اس کو بلکہ کہئے "ماعری"

ہوش (ملیح آبادی)

صرف پچپن روپیہ

یا

پانچ روپیہ ماہوار

میرے والد کا حال ہی میں انتقال ہوگیا ہے اور میں مجبور ہوں کہ کسب معاش کے لئے خود ہاتھ پاؤں ہلاؤں ——— میں نے الہ آباد کے زنانہ نارمل اسکول میں داخلہ کا انتظام کرلیا ہے جس کا سشن یکم جولائی سے شروع ہوتا ہے اور گیارہ مہینے میں ختم ہوجاتا ہے

میں اپنے بے شمار بھائیوں اور بہنوں سے اپیل کرتی ہوں کہ یا تو گیارہ ماہ کے لئے یک مشت ۵۵ کی امداد فرمادیں یا پانچ روپیہ ماہوار کا وظیفہ مرحمت فرمادیں

میں وعدہ کرتی ہوں کہ ملازمت کے بعد جس کا ملنا یقینی ہے۔ بہت جلد اس رقم کو واپس کردوں گی

الف ۔ جیم ۔ ذریعہ دفتر نگار ۔ لکھنؤ

کلامِ اختر

ہیں وہی صبر آزما بے سرد سامانیاں — مٹ نہ سکیں عمر بھر میری پریشانیاں
طائرِ مجروح ہوں، میرے لئے وقف ہیں — روح کی بیچینیاں، دل کی پرافشانیاں
نزع کی طاری ہے گو مستقل اک کیفیت — سانس نہیں ٹوٹتا، اُف رے گرانجانیاں
درد دوا ہوگیا عشق میں پایانِ کار — رازِ سکوں بن گئیں، غم کی فراوانیاں
میری نظر میں نہاں روح کی افسردگی — میری جبیں پہ عیاں قلب کی ویرانیاں
کاش کبھی پا سکیں رازِ مئے بیخودی — عقل کی بے راہیاں، ہوش کی نادانیاں
ڈوب چلی نبضِ دل، درد نہ کم ہو سکا — آج بھی اشکوں کی ہیں ویسی ہی طغیانیاں
دل ہے ترا آئینہ، دل سے نگاہوں کو ربط — تیری تمنا کا راز ہیں مری حیرانیاں
اختر ناکام ہے اور وہی ہمت شکن — درد کی جانکاہیاں، غم کی فراوانیاں

میری مشکل نہ ہوئی دہر میں آساں کوئی — نہ ملا آہ، مرے درد کا درماں کوئی
سوچتا ہوں کہ بایں غفلت و مجبوریٔ یاس — زندگی ہے مری یا خوابِ پریشاں کوئی
اور کس کام کے ہیں قلب و جگر کے ٹکڑے — زیبِ داماں ہو کوئی، زینتِ مژگاں کوئی
جان کیوں تن سے نکلتے ہوئے گھبراتی ہے — عیشِ سرمد تو نہیں، عمرِ گریزاں کوئی
لاکھ لبریز مئے رنگ ہو مینائے بہار! — دل میں بجھتا ہے شرارِ غمِ پنہاں کوئی
ٹوٹتے ہیں کہیں بے مے بھی حجاباتِ نظر — مل چکا شیخ! تجھے رتبۂ عرفاں کوئی
الاماں سوزِ محبت کہ یہ عالم کب تک! — جیسے ہو دل میں نہاں شعلۂ لرزاں کوئی
وقت پر آ نہ سکے، اور جب آئے نہ رکے — زندگانی پہ نہیں موت کا احساں کوئی

میں رہا صرفِ شبِ وادیٔ وحشت اختر
میرے عالم میں نہ تھی صبحِ گلستاں کوئی

اختر (حیدرآباد دکن)

اشک بیتاب

جب پسِ کہسار چھپ جاتا ہے مہر تیز گام اور سنہری بال بکھرائے ہوئے آتی ہے شام
چھیڑتی ہے جب الم کے گیت جوئے خوش خرام آہ! ان محروم آنکھوں سے ٹپک جاتے ہیں اشک

جب سرورِ خواب میں مدہوش ہوجاتا ہے دہر جب ردائے سیم کے دامن میں سو جاتا ہے دہر
جب سکوت و خامشی کی لَے میں کھو جاتا ہے دہر آہ! ان محروم آنکھوں سے ٹپک جاتے ہیں اشک

چاندنی میں گونجتے ہیں جب حدی خوانوں کے گیت رات کے یا آخری حصے میں دہقانوں کے گیت
بیخودی میں جبکہ سنتا ہوں یہ دیوانوں کے گیت آہ! ان محروم آنکھوں سے ٹپک جاتے ہیں اشک

جب فضائے آسماں پر گھر کے آتے ہیں سحاب بجلیوں کی کوندیں ہوتا ہے بہم اضطراب
یاد آتے ہو مجھے تم اور وہ عہدِ شباب آہ! ان محروم آنکھوں سے ٹپک جاتے ہیں اشک

آم کا وہ پیڑ جو ہے بر لبِ آبِ رواں بچپنے میں کھیلتے رہتے تھے پہروں تک جہاں
رات کو جب چاندنی میں جا نکلتا ہوں وہاں آہ! ان محروم آنکھوں سے ٹپک جاتے ہیں اشک

شیدا

صدائے دل

مآلِ عشق کی ناکامیوں میں محو ہوں گم ہوں کہ میں سازِ شکستِ آرزو کا اک ترنم ہوں
مجھے اب قید و بندِ زندگی سے واسطہ کیا ہو
ہوئی مدت کہ اپنی روح سے محوِ تکلم ہوں

حجابِ تیرگی کچھ اس طرح اٹھا مرے دل سے اُجالا دفعتاً پیدا ہو جیسے ماہِ کامل سے
حقیقت کی تجلی نے کیا ہے روح کو روشن مری ہستی نظر آتی ہے آگے حدِ باطل سے
فریبِ زندگی سے اب مجھے نسبت نہیں کوئی
نکل آیا ہوں آگے ہستیٔ فانی کی منزل سے

حقیقت کی طلب کرتی رہی بیحد حزیں مجھکو ملی تسکیں کہیں مجھکو، نہ چین آیا کہیں مجھکو
حیات و موت کی تھی کشمکش اور روح گریاں تھی حقیقت خود ہی آئی دیکھ کر اندوہگیں مجھکو
اب اپنی روح سے اکثر کیا کرتا ہوں یوں باتیں
کہ جیسے ہستیٔ فانی سے مطلب ہی نہیں مجھکو

نبی احمد (بریلوی)

مطالبات

نگاہِ محبت فزا چاہتا ہوں مسافر ہوں اک رہنما چاہتا ہوں
تجلی نظر آشنا چاہتا ہوں تجھے جلوہ گر دیکھنا چاہتا ہوں
ابھی خام ہے کچھ، مذاقِ تمنا کہ مہائے صبر آزما چاہتا ہوں
مجھے کوئی کافر مسلمان کر دے مجازِ حقیقت ادا چاہتا ہوں
دلا دے کوئی یاد، بھولا ہوں کسکو بتا دے کوئی، ہائے کیا چاہتا ہوں
خریدار ہے کون دنیا میں دل کا کہاں اور کیا بیچنا چاہتا ہوں
خطا بر ندامت خطا در خطا ہے خطا کر کے دادِ خطا چاہتا ہوں
کیا ہے محبت نے گستاخ کتنا کہ تجھ سے تجھے مانگنا چاہتا ہوں
ہوس چاہتی ہے تجلی عریاں مگر میں نگاہِ رسا چاہتا ہوں
جو قیدِ مجاز و حقیقت اٹھا دے وہ کیفیتِ دل کشا چاہتا ہوں
تمنائے دل اور محدود اِ کوکب
مقام و را ءالورا چاہتا ہوں

کوکب (شاہجہانپوری)

آیندہ جنوری ۱۹۳۵ء کے رسالۂ نگار کیلئے

مخصوص علمی و ادبی دعوت

مکرمی - تسلیم -

یہ حقیقت غالباً جناب سے مخفی نہ ہوگی کہ گزشتہ چند سال سے نگار کا جنوری نمبر کسی نہ کسی مخصوص موضوع کے وقف ہوتا ہے چنانچہ اسوقت تک مومن نمبر ظفر نمبر اور غالب نمبر شایع ہو کر ملک میں کافی مقبول ہو چکے ہیں جنوری ۱۹۳۵ء کے نگار کو میں لکھنؤ اور دلی کی شاعری کی تنقید کے لئے وقف کرنا چاہتا ہوں - اور متمنی ہوں کہ آپ بھی تھوڑا وقت نکالکر اس خدمت میں میری اعانت فرمائیے - اور اگر زحمت نہ ہو تو ابھی سے مطلع فرما دیجئے - کہ آپ کس موضوع پر اپنا مقالہ مرحمت فرمائیں گے - اسی کے ساتھ یہ بھی استدعا ہے کہ اپنے افکار عالیہ کے ہمراہ اپنا فوٹو (یا بلاک اگر ہو تو وہ) مرحمت فرمائیں تاکہ مقالہ کے ساتھ وہ بھی شایع کیا جائے - آپ کے ایماء کے بعد آپ کا اسم گرامی عام اطلاع کے لئے نگار میں شایع کر دیا جائے گا

ذیل میں مختلف مباحث کی فہرست آپ کو نظر آئے گی، لیکن اگر موضوع سے متعلق آپ کسی اور مسئلہ پر تحریر فرمانا چاہیں تو آپ کو اختیار کلی حاصل ہے، لیکن بہتر ہو اگر عنوان سے آپ آگاہ فرما دیں — یہ ضروری نہیں کہ مضمون طویل ہو، لیکن جتنا ہو بہترین لمحات فرصت کا نتیجۂ فکر ہونا چاہیئے

خاکسار

نیاز فتحپوری

عنوانات جن پر مقالے درکار ہیں

(۱) دہلی اور لکھنؤ اسکول کی شاعری پر مورخانہ نظر اور انکی خصوصیات
(۲) دونوں اسکولوں کے اکابر اور ان کا فرق مدارج
(۳) فن اور زبان کی حیثیت سے دونوں کا مرتبہ
(۴) لکھنؤ اسکول پر دہلی کا اثر
(۵) دہلی اسکول پر لکھنؤ کا اثر
(۶) دونوں اسکولوں کی غزلگوئی پر تفصیلی تبصرہ
(۷) لکھنؤ اسکول کے تین بہترین شاعروں کے ۲۰، ۲۰ شعر
(۸) دہلی اسکول کے تین بہترین شاعروں کے ۲۰، ۲۰ شعر
(۹) منظوم افسانے یا مثنوی لکھنؤ اسکول میں
(۱۰) منظوم افسانے یا مثنوی دہلی اسکول میں
(۱۱) دکن اور اردو شاعری (اسوقت تک تمام ادوار پر تبصرہ)
(۱۲) پنجاب اور اردو شاعری (اسوقت تک تمام ادوار پر تبصرہ)
(۱۳) تذکرہ نگاری کی حیثیت سے لکھنؤ اور دہلی کے خدمات
(۱۴) دونوں اسکولوں کے کارنامے، رباعیات، مرثیہ، قصیدہ، نعت میں
(۱۵) دولت مغلیہ کے انحطاط کا اثر دہلی کی شاعری پر
(۱۶) شان اودھ اور لکھنوی شاعری
(۱۷) دہلی اور لکھنوی شاعری میں اخلاقی و مذہبی عنصر
(۱۸) شاعری کے لحاظ سے لکھنؤ کا دور زرّیں
(۱۹) شاعری کے لحاظ سے دہلی کا دور زرّیں
(۲۰) لکھنؤ اسکول کا سب سے پہلا شاعر جسنے دہلی کا تتبع کیا
(۲۱) دہلی اسکول کا سب سے پہلا شاعر جس نے لکھنؤ کا تتبع کیا
(۲۲) لکھنؤ اور دہلی کے وہ شعراء جنھوں نے ملک و قوم کو کوئی خاص پیغام پہنچایا
(۲۳) کیا دہلی اسکول روبہ انحطاط ہے اور کیوں
(۲۴) کیا لکھنؤ اسکول روبہ انحطاط ہے؟ اور کیوں
(۲۵) رام پور کا تعلق دہلی اور لکھنؤ اسکولوں سے
(۲۶) حیدرآباد اور لکھنؤ و دہلی اسکول کا اس سے تعلق
(۲۷) کیا لکھنؤ اسکول نے کلکتہ میں بھی شاعری کو متاثر کیا؟
(۲۸) کیا لکھنؤ اسکول میں اصلاح کی ضرورت ہے؟ اگر ہے تو کیا
(۲۹) کیا دہلی اسکول میں اصلاح کی ضرورت ہے؟ اگر ہے تو کیا
(۳۰) مستقبل میں آپ کو اردو شاعری سے کیا توقعات ہیں؟
(۳۱) دونوں اسکولوں کے وہ شعراء جنھوں نے قدامت کو ترک کرکے کسی ابداع و اختراع سے کام لیا
(۳۲) لکھنؤ اور دہلی کے ریختی اور ہزل گو
(۳۳) لکھنؤ اور دہلی کی خواتین جنھوں نے شاعری میں نمایاں حصہ لیا
(۳۴) لکھنؤ اسکول کے مختلف ادوار اور ہر دور کے بہترین شاعر
(۳۵) دہلی اسکول کے مختلف ادوار اور ہر دور کے بہترین شاعر
(۳۶) آگرہ اور دہلی کا شاعرانہ تعلق

نوٹ:۔ لکھنؤ اور دہلی کی شاعری سے مراد وہ تمام شعراء ہیں۔ جو یہاں کی شاعری سے متاثر ہوکر اسی رنگ میں شعر کہتے ہیں اس کے لئے کسی خاص جگہ کا باشندہ ہونے کی شرط نہیں ہے